ماہنامہ
کراچی
دوشیزہ
APRIL
2012
موبائل نمبر

آغازِ سفر

تُو کہاں ہے مگر.....؟	غزالہ رشید	7
زادِ راہ	منورہ نوری خلیق	9
اپنی ڈائری سے باتیں.....	منزہ سہام	14
محفل	غزالہ رشید	15

باتیں ملاقاتیں

فہد مصطفیٰ، کچھ کہی، کچھ اَن کہی...	رداناصر	35
منی اسکرین	م۔ش۔خ	40

سلسلہ خاص

تم میرے ساتھ رہو	زمرنعیم	42
چاند میرا منتظر	اِرم زہرا	208

منی ناول

ہرا شک اِک ستارہ	نگہت اعظمی	136

مکمل ناول

چور دروازے	سلمیٰ یونس	64

ناولٹ

روشن ہوئے راستے	رضوانہ عزیز شیخ	110

رنگِ فسانہ

زندگی کہانی نہیں	شمیم فضلِ خالق	163
روشنی کے سامنے	محمد تقی	189
نمبر تین سو تیرہ	کاشی چوہان	158
رازِ حیات	زرافشاں فرحین	201
خواب اور گھروندے	مدیحہ عدنان	195
اک نام مرے دل میں	صبا نور	180

انتخابِ خاص

دھرتی کی باس	سائرہ ہاشمی	224

رنگِ کائنات

کچھ سچ، کچھ.....!	م ش خ	232

دوشیزہ میگزین

بنتِ حوا	مسرت گیلانی	236
دریچے	اسماء اعوان	239
یہ ہوئی نا بات	زین العابدین	243
نئے لہجے، نئی آوازیں	قارئین	246
کچن کارنر	شزاء گیلانی	248
نفسیاتی کالم	عمرانہ پروین	252
بیوٹی گائیڈ	شائستہ انور	256

بعض خبریں صرف ہوتی ہیں خیال
ہر خبر کو بھی خبر مت جانیے

روزنامہ
فلک ٹائمز
کراچی
Daily FalakTimes Karachi

- محترمہ فاطمہ ثریا بجیا کی سرپرستی میں ہر صبح آپ کے ہاتھوں میں۔
- آپ کا اپنا اخبار، جو آپ سوچیں گے، وہ ہم لکھیں گے۔
- جو آپ چاہیں گے وہ ہم شائع کریں گے۔
- آپ کی اپنی منزہ سہام کی زیرادارت۔

ایجنٹ حضرات اور نمائندگان فوری رابطہ کریں۔

0300-2313256 - 021-34934369 -021-34939823

تو کہاں ہے مگر.....؟؟

میرا ابھی تک تو یہ یقین قائم ہے کہ کتاب اور اچھا دوست کبھی بھی آپ کو تنہا نہیں ہونے دیتا۔ بڑے اخلاص سے' مصیبت میں' آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ایسے تھام لیتا ہے کہ آپ کی ذات میں خود بخود سکون کے لمحے در آتے ہیں اور تنہائی محفل بن جاتی ہے' لیکن گلوبل ولیج نے دوستی اور خلوص کے بھی شاید اب معنی بدل ڈالے ہیں' اسی لیے اچھے وقتوں کے ساتھی' رازدار کبھی کبھی ایسے ہی حیران کرتے ہیں کہ اکثر یہ خیال آنے لگا ہے۔ جب محفلوں میں' تقریبات میں' پرانے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے تو ہم اُسی طرح ہاتھ بھی ملاتے ہیں' گلے بھی ملتے ہیں' لیکن رخصت ہونے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ جس طرح بچپن میں تتلیوں کی تلاش میں' تتلی کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد ہاتھوں میں صرف رنگ رہ جاتے تھے' اُسی طرح' اب اکثر ہاتھوں میں پھیکے اور پھیلتے رنگ دوستوں سے اور اب ہم سے کبھی کبھی یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ.....

تم سے مل کر مجھے رونا تھا' بہت رونا تھا
شکوۂ وقتِ ملاقات نے رونے نہ دیا

غزالہ رشید

آغازِ سفر

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ اعمال ہیں، جو ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں مگر انسان سب سے کم ساتھ دینے والی چیزوں پر بھروسہ کرتا ہے اور قبر کے کنارے تک ان ہی چیزوں پر بھروسہ کرتے کرتے جا پہنچتا ہے اور.....

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

انسان عمر بھر اپنے سے وابستہ ہر شے پر بھروسہ کرتا اور انہیں اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ انہیں اپنی طاقت جانتا اور فخر کرتا ہے۔ اسے اپنے اعضاء اپنی قوت نظر آتے ہیں، اپنی اولاد اپنی شان، اپنی دولت اپنا سرمایہ اور اپنے اقرباء اپنی مضبوطی لگتے ہیں۔ وہ کنبوں پر، رشتوں، مناصب اور حیثیتوں پر بھروسہ کرتا ہے۔ ان ہی چیزوں کو متاعِ حیات سمجھتا ہے اور انہی کو حیات۔ چنانچہ پوری زندگی یہی گردان کرتا ہے کہ میں، میرا جسم، میرے ہاتھ پاؤں، میرا مال، میری اولاد، میرا کنبہ اور میری طاقت، میرا عہدہ میرا منصب، یہی سوچ اسے خوش رکھتی ہے کہ یہ سب کچھ اس کا ہے۔ ملکیت میں رہنے والی ان ہی چیزوں میں وہ دوسروں سے اپنا مقابلہ کرتا اور ان ہی میں سب سے آگے بڑھ جانے کی تگ و دو کرتا ہے۔ اس کے غم اور خوشی ان ہی چیزوں میں ہوتے ہیں۔ آگے بڑھ جانا اور پیچھے رہ جانا دیکھتا ہے۔ اسی کوشش میں زندگی گزارتا ہے۔

وقت گزرتا رہتا ہے۔ اسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاتھ پاؤں اور جسم مضبوط ہے۔ دولت ہے۔ اولاد ہے۔ اس کی پوری زندگی اپنی ذات، اپنی اولاد اور اپنی دولت اور منصب کے گرد گھومتی ہے۔

وہ نہیں سوچتا، زندگی کے اس سفر میں ہر لمحہ کشاں کشاں اسے آخری منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ لمحے گزرتے اور ماضی بنتے رہتے ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اب بھی وہ صرف خود کو ہی دیکھتا ہے۔ جسم تھکنے لگتا ہے۔ مضبوط اعضاء ڈھلک جاتے ہیں۔ ہاتھ کمزور اور پیرشل ہونے لگتے ہیں۔ وہ اسے صرف بڑھاپا قرار دیتا ہے۔ عمر کا تقاضا سمجھتا ہے اور اس کے مطابق اپنی دولت اور منصب کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرتا ہے۔ آنے والے وقت کے اندیشے اب بھی اسے مال کی حفاظت یا مال میں اضافے پر اکساتے ہیں۔

وقت کچھ اور گزر جاتا ہے۔ پھر چلنا پھرنا مشکل اور کام کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ وہی آنکھیں جو جوانی میں موتیوں کی طرح چمکتی تھیں، ان میں موتیا اتر آتا ہے۔ کان جو مدھم مدھم سی سرگوشیاں بھی سن لیتے تھے اب بلند آواز پر بھی دھرے نہیں جاتے۔ وہ خود کو ناتواں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس کے اشاروں میں جان نہیں اور آرڈر میں طاقت نہیں رہی، تب وہ مزید شدومد سے خساروں سے بچنا چاہتا ہے مزید مال سمیٹتا ہے۔

فرمایا گیا۔ ”تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا سمیٹنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ تم قبر کے کنارے تک پہنچ جاتے ہو۔“ (102:2)

بچپن غفلت میں۔

لڑکپن کھیل کود میں۔

جوانی دنیا سمیٹنے میں اور بڑھاپا آنے والے وقت کے خوف سے مال کی حفاظت کرنے میں گزر گیا۔

مال کو، منصب، حکومت اور تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لیے انسان وارث کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مال، یہ منصب، حکومت یا بادشاہت سب کچھ بیٹوں کو دے دوں گا تو یہ سب میرا رہے گا۔ موت کا ہاتھ اسے اس کے مال سے جدا کیے دے رہا ہے اور وہ اسے محفوظ کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے اور سب کچھ وراثت میں دے کر آخر ایک دن مر جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے تین دوست ہیں۔ ایک زندگی بھر اس کے ساتھ رہتا ہے موت کے وقت اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

دوسرا قبر تک اس کے ساتھ چلتا ہے، اس کے قبر میں جانے کے ساتھ ہی جدا ہو جاتا ہے۔

تیسرا دوست، وہ جو قبر میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ بتاؤ ان میں سے سب سے بہترین دوست کون ہے؟؟

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جو قبر میں بھی ساتھ جائے وہی دوست سب سے بہترین ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پہلا دوست مال ہے جو عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔

دوسرا دوست اولاد ہے جو قبر تک ساتھ جاتی اور پلٹ آتی ہے اور تیسرا دوست اعمال ہیں، جو قبر میں بھی ساتھ جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

• اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ اعمال ہیں، جو ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں مگر انسان سب سے کم ساتھ دینے والی چیزوں پر بھروسہ کرتا ہے اور قبر کے کنارے تک ان ہی چیزوں پر بھروسہ کرتے کرتے جا پہنچتا ہے۔ انسان بھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچتا کہ ان میں سے کچھ بھی اس کا نہیں۔ اس عارضی زندگی کی طرح یہ سب کچھ بھی عارضی ہے بلکہ اصل معنوں میں مشکل وقت آنے پر یہ سب چیزیں اسی کے خلاف گواہی دیں گی۔ وہی باپ جس سے بیٹا سب کچھ لیتا ہے اور وہی بیٹا جسے انسان عمر بھر اپنی طاقت سمجھتا ہے۔ سب مال متاع اسی کو دے کر مرتا ہے، وہ باپ اور بیٹا سب سے بڑے ہنگامہ (قیامت) کے وقت ایک دوسرے کو پہچانیں گے بھی نہیں۔ اسی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

”لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو اور ڈرو اس دن سے، جب کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور کوئی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا نہیں ہوگا۔ فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔“ (33:31)

انسان عمر بھر کہنہ کہنہ کرتا ہے، اسی کو اپنی طاقت گردانتا ہے، پوری زندگی فخر کرتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں تو لوگ فرزند، کنبہ، علاقہ اور ذات پات ہی کو غرور کا سبب سمجھتے تھے، تعارف بھی کراتے تھے تو ان ہی چیزوں کے ذکر سے اور لوگ ان سے مرعوب بھی ہوتے تھے تو ان ہی چیزوں کے ذکر سے، لیکن تفاخر کا سبب یہ چیزیں آج بھی ہیں۔ آج بھی اسی انداز میں اپنی پہچان بتائی جاتی ہے۔ میرے والد فلاں عہدے پر فائز ہیں، بھائی فلاں فلاں پر۔ ہم ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے اور اتنے ملازم ہیں۔

یہ تفاخر کا قدرے جدید انداز ہے۔ ان ہی سب کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔

”آخر کار جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز بلند ہوگی، اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھی بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔“ (37:80)

اسی مضمون کو قدرے دوسری طرح ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ ”قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی اور نہ تمہاری اولاد ہی بلکہ اس دن تمہارے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔“ (60:3)

سب سے زیادہ قوی طلب بات یہ ہے کہ انسان اپنے ہی جن اعضاء کو اپنی شان سمجھتا ہے، انہیں اپنا اور صرف اپنا کہتا ہے، وہ بھی اس کے نہیں ہوتے۔ وہ آنکھیں جو صرف اس کے چہرے پر اس کی ہیں، اس کے حسن میں اضافہ کرنے والی ہیں۔ اس کی مرضی سے چیزوں کو دیکھتی اور نظر انداز کرتی ہیں جن سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

ان ہی سے دھوکہ دیتا ہے، ان ہی سے گناہ کرتا ہے اور ان کی شرارتوں کو راز رکھتا ہے۔ ایک دن اسے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اس کی نہیں بلکہ راز داری کے سب کاموں کو عیاں لیے دے رہی ہیں۔ ان پر

نعت

چھا رہی ہے گھٹا مدینے کی
آ گئی مدت پلانے پینے کی

نہیں حسرت زیادہ جینے کی
زندگی چاہیے قرینے کی

زندگی اُس کی، موت اُس کی ہے
خاک ہو جائے جو مدینے کی

ہفتِ اقلیم سے ہے بیش بہا
خاک چنگی سی اک مدینے کی

ہفت قلزم کے موتیوں سے گراں
بوند اک ترے پسینے کی

ساقیا چھوڑ ساغر و مینا
اب پلا دل کے آبگینے کی

مئے افرنگ میں وہ بات کہاں
لا مرے واسطے مدینے کی

سلسلہ ختم ہے نبوت کا
مُہر ہے ہاشمی نگینے کی

مولانا شہید الاسلام المصری

اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

وہ مضبوط ہاتھ جو عمر بھر اس کی مرضی پر کام کرتے رہے اور وہ انہیں اپنا سمجھ کر ہر قسم کے کام کراتا رہا اور سمجھتا رہا کہ کوئی نہ جان پائے گا۔ وہی ہاتھ جنہیں وہ اپنی قوت سمجھتا اور استعمال کرتا رہا۔ ڈکیتیاں بھی ماریں، چوری بھی کیں، انسانی خون سے انہیں رنگتا اور چھپاتا رہا۔ جائز اور ناجائز ہر کام کی جانب بڑھاتا اور فیض اٹھاتا رہا جن مضبوط ہاتھوں سے محنت کم اور صلہ زیادہ وصول کرتا رہا جن کی طاقت سے طاقت ور بنا پھرتا رہا' وہی ہاتھ اسے مجرم ثابت کر دینے والے ہیں۔

وہی پاؤں جو اس کی منشا و مرضی پر سیکڑوں میل کے راستوں کو روندتے رہے، وہ انہیں لے کر کہاں کہاں گیا، کیوں کیوں گیا؟ وہ سمجھتا رہا' یہ سب کچھ پوشیدہ رہے گا' کوئی گنا ہوں کے ان راستوں کو جان نہ پائے گا کیونکہ وہ اپنے ہی قدموں سے تو گیا تھا۔ بھلا کون جان پائے گا؟ انہی قدموں سے چل کر اس نے کتنوں کو بے آبرو کیا۔

ان ہی قدموں سے چل کر کتنی سازشیں کیں، قوم و ملک کا کتنا نقصان کیا۔ اپنا سودا کیا اور دوسروں کو بھی بیچ دیا اور یقین کرتا رہا کہ یہ سب کچھ راز رہے گا۔ کوئی نہ جان پائے گا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ وہ عمر بھر مطمئن رہا کہ وقت گزر جائے گا اور ان قدموں سے لیے جانے والے کاموں سے کوئی واقف نہ ہوگا۔

یہی دھوکہ زبان دے گی۔ تمام عمر اسی زبان سے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا رہا، جھوٹے سچے زمین و آسمان کے قلابے ملا کر دوسروں کو خوش کرتا رہا۔ اپنے لفظوں کی داد وصول کی۔ باطل کو حق ثابت کرتا رہا۔ کبھی اپنے فائدے کے لیے اور کبھی دوسروں کے نقصان کے لیے۔ کتنے جھوٹ بولے۔ کتنی ہی جھوٹی گواہیاں دیں۔ اس زبان سے کتنی ہی مرتبہ دل آزاریاں کیں، حق کو باطل ثابت کیا اور باطل کو حق۔ کتنوں کو جھوٹ بول کر پھنسوا دیا اور سمجھتا رہا کہ یہ زبان میری ہے۔ اس کا راز کون کھول سکتا ہے خود میرے علاوہ؟ لیکن یہی عضو اور یہی زبان اس کا راز کھول دینے والی ہے۔ ایک ایک خطا کی گواہی دینے والی ہے۔ شاید دوسرے تو معاف بھی کر دیں لیکن اپنے ہی اعضاء جرم کا راز کھولنے والے بن جائیں گے۔ اپنے ہی جسم کی کھال جو ہر لحہ جسم کے ساتھ چپٹی رہتی ہے 'وہی سب سے بڑی گواہی دے گی۔

ارشاد ہوتا ہے۔ ''وہ (گناہ گار) اس دن کو بھول نہ جائیں جب ان کی اپنی ہی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ انہیں وہ بدلہ ضرور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔'' (24:25)

تو یہ ہے میری چیز، میرا مال، میری اولاد اور میری طاقت۔ میری حکومت، میرا راج اور میری ملکیت سب کا یہ انجام ہے۔

مالکِ حقیقی کے سامنے جا کر ہر شے اصل مالک کے حکم پر چلے گی۔ ہر شے گواہی دے گی کہ یہ بے رنگ و نام ہے اور انسان یہ سوچے گا کہ کیا یہ سب کچھ میرا تھا؟

ہر نیا حاکم پرانے کا وارث بنتا اور خود کو مالک سمجھتا رہا اور دوسرے وارث کو دے کر رخصت ہوتا رہا۔ ہر بیٹا اپنے باپ کا وارث بنتا رہا اور اسے اپنی ملکیت سمجھ کر عیش کرتا رہا مگر کوئی بھی نہ جان سکا کہ جسم و روح، جسم کا ہر عضو، سوچ فکر و دانش۔ دولت و ثروت، حکومت و سلطنت۔ ان سب کا اصل مالک کون ہے۔

ارشادِ ربانی ہے۔ ''ہم ہی زمین کے اور اس پر رہنے والوں کے وارث رہ جائیں گے اور وہ سب ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے۔'' (19:40)

☆☆☆

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافاتِ جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے "وہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

ایجنٹ / قارئین کی توجہ کیلئے

اگر آپ کو سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے حصول میں کوئی دشواری پیش آرہی ہو تو مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ فوری حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

محمد اقبال زمان (سرکولیشن منیجر) 0333-2269932

رابطہ برائے آفس : 34934369 - 34939823

اپنی ڈائری سے باتیں......

پیارے ابو......! اچھے ہیں؟

بہت مصروفیت ہوگئی ہے' پتا ہی نہیں چلتا کب صبح ہوئی اور کب رات؟ کچھ دن قبل دانیال نے اپنے دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ بہت ہلہ گلہ رہا۔ شیطان سے لڑکے اور بہت ہی پیاری لڑکیاں' سب ہنستے بولتے رہے' بہت اچھا لگا' ایک بات کا اور احساس ہوا کہ وقت کتنی جلدی گزر گیا' بچے بڑے ہوگئے۔ اب تو لگتا ہے کہ آنکھیں جھپکوں گی تو بہو سامنے ہوگی۔ دانیال کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو کہنے لگا۔

''اوہ......خدا کو مانیں' میں ابھی صرف انیس سال کا ہوں۔''

لیکن ابو......! مجھے تو لگتا ہے' جیسے وہ منا سا میری گود میں تھا اور یہ کل ہی کی بات تھی...... اور آج ماشاء اللہ وہ اپنے دوستوں میں بیٹھا تھا۔ مجھے ملوا رہا تھا سب سے۔ ''یہ میری امی ہیں۔''

کل میں کہتی تھی۔ ''یہ میرا بیٹا ہے۔''

وقت بہت جلدی سب کچھ بدل دیتا ہے۔ ابو......! بچے واقعی میں بڑے ہوگئے۔

آپ کی بیٹی

منزہ سہام

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

ساتھیو......! السلام علیکم!

آج پھر اس محفل میں آپ کے درمیان ہوں۔ فلک ٹائمز کے اجراء کی مبارک باد ہم سب وصول کر رہے ہیں۔ منزہ سہام اسی سلسلے میں آج کل مصروف ہیں اور ہمیں آپ سب کی محبتیں، اپنائیت کے ساتھ ساتھ تنقید تعریف بھی موصول ہوتی رہتی ہے۔ نئے لکھاری پُرجوش ہیں اور سینئر ساتھی کبھی مصروف تو کبھی ہمارے درمیان......ہم سب اسی طرح ہمیشہ ایک دوسرے کا مان رکھیں کہ یہ ہی تو زندگی ہے۔

ایک وضاحت کرتی چلوں کہ اکثر افسانوں کے سلسلے میں ''بازگشت'' کی شکایتیں موصول ہوتی ہیں اور ایڈیٹر کی کرسی کبھی کبھی تو یہ سوچ کر تیز تیز جھولنے لگتی ہے کہ انصاف کی زنجیر ہلانے کو دل چاہنے لگتا ہے کیونکہ......؟ پھر بھی کہنا یہ ہے کہ ساتھیو......! دنیا میں کچھ بھی نیا نہیں ہے، کبھی کبھی جب بے اختیار ہم کہتے ہیں کہ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی، تو یہ تو دلوں کی ہی باتیں ہیں۔ اب چلتے ہیں آپ کے ان ناموں کی طرف جو دوشیزہ کے لیے ہیں اور وہ ان کی شدت سے منتظر رہتی ہے۔

✉ شمع حفیظ کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! ایک بار پھر محفلِ دوشیزہ میں تاخیری آمد کے ساتھ قدم رکھ رہی ہوں۔ اس تاخیر کا سبب یقیناً آپ جانتی ہوں گی، وہی سیزنل الرجی کہ کی دم دا بھروسا یار دم آوے نہ آوے'' سو نومبر سے فروری تک کا عرصہ اسی آوے نہ آوے کے چکر میں گزر گیا اور میں تکلیف و راحت کے بیچ ہچکولے کھاتی رہی۔ اب بہتر ہوں، سو حاضرِ خدمت ہوں۔ اپنی اس دیر سے آمد کے ساتھ بہت سے پیغام ہیں جو جمع ہوگئے تھے سو فرداً فرداً دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ رخسانہ سہام صاحبہ! ویلکم بیک، آپ کا دوشیزہ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھنا، دل کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔ آپ کی آمد نے رسالے میں کئی خوشگوار تبدیلیاں کی ہیں۔ خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے۔ رنگین اشتہارات کا آغاز کیا ہے اور سب کے کان کھینچے ہیں۔ تب ہی رسالہ پانچ چھ تاریخ تک مارکیٹ میں دکھائی دے رہا ہے۔ اہلِ دوشیزہ کو آپ کا ساتھ مبارک ہو۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ منزہ جی! اللہ نے آپ کو صورت و سیرت سے خواب نوازا ہے لیکن اب اللہ کے گھر کی زیارت اور عمرے کی ادائیگی، آپ کی شخصیت میں پاکیزگی اور شادابی لا رہی ہے۔ اہلِ خانہ

کے ساتھ دربارِ حبیبؐ میں بھی یقیناً حاضر ہوئی ہوں گی۔ میری جانب سے مبارک باد، آپ کی ڈائری، میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ اب ایک افسانہ ہو جائے، بہت دن ہو گئے آپ کی تحریر کو پڑھے ہوئے۔ تو کب لا رہی ہیں اپنا شاہکار......؟ سنبل! تم نے خط میں مجھے آواز دی تھی۔ لبیک کہنے کو دل بہت چاہا مگر مہلت نہ ملی۔ اللہ تمہیں صبر دے اور والدہ کو جنت کا حقدار رکھے۔ دلشاد نسیم اور مسز غفار! آپ کے شوہر کی رحلت پر افسوس ہے۔ دل سے تعزیت کر رہی ہوں، اللہ آپ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ایڈیسن! تمہارے لیے بہت فکر مند ہوں۔ ہر دعا میں شامل رکھ رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ جس کا قلم بے حد خوب صورتی سے دوڑتا ہے، وہ ایک دن خود بھی دوڑے گا۔ بے فکر رہو، دعاؤں میں رہنے والے بہت جلد صحت یاب ہوتے ہیں۔ بند کھڑکیاں بے حد پسند آئیں۔ فریدہ مسرور! محفل میں آپ کی ایک دو بار آمد رونق لگا دیتی ہے۔ پلیز اب تحریری طور پر حاضری لگائیے، کب آ رہا ہے تازہ افسانہ؟ فرح اسلم قریشی! میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری محبت کا شکریہ۔ اس بار بہت دیر سے حاضری لگائی ہے تم نے بھی۔ صفیہ سلطانہ، رضوانہ کوثر، رضیہ مہدی، عقیلہ حق، غزالہ عزیز، نسیم نیازی اور شگفتہ شفیق کو سلام عرض ہے۔ شگفتہ ترقی کے سفر پر تیزی سے گامزن ہیں۔ انہیں ان کی کامیابیاں مبارک ہوں۔ نشاط کو بیٹی کی شادی مبارک اور محترم عظمت اتا کا کو "پرائیڈ آف پرفارمنس" مبارک ہو۔ اب مارچ کے شمارے پر کچھ تبصرہ بھی ہو جائے، شاعری کا پورشن حسب معمول نئے اور پرانے شعراء کے کلام سے مہک رہا ہے۔ سب ہی کی کاوشیں اچھی لگیں۔ غزلیں بھی بہترین ہیں۔ اللہ آپ سب کو مزید اچھا کہنے کی توفیق دے، آمین۔ افسانوں میں اس بار فرحت صدیقی نے اپنے دل کو تحریر کی صورت سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔ سچا افسانہ، اشکوں اور احساس کی نزاکت سے بھرپور ہے۔ میں آپ کے اور عنبر کے لیے خصوصی دعا کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کی اولاد کی خوشیاں اسے دکھائے اور خوش رکھے۔ نظارت نصر اور نزہت جبیں ضیا کے افسانے بھی اچھے تھے۔ صائمہ حیدر! اپنے اسلوب میں اچھا لگا۔ بلال فیاض! نئے لکھاری کہاں ہیں۔ "آئیڈیل" میں خوب چھپا کرتے تھے۔ دوشیزہ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا افسانہ بھی بہتر تھا۔ ڈھکوسلہ کے لیے، آپ سب کی رائے کا انتظار رہے گا۔ مکمل ناول، چور دروازے، سلمیٰ یونس کی تحریر اچھی لگی۔ تبصرہ مزید قسطیں پڑھ کر کروں گی۔ ناولٹ میں سکینہ فرخ کی حاضری اچھی لگی۔ ان کا ناولٹ ابھی پڑھ نہیں پائی۔ انشاء اللہ جلد پڑھوں گی۔ یقیناً اچھا ہوگا۔ قسط وار ناولز سب ادھورے پڑھے ہیں۔ طبیعت کی خرابی نے ایک بریک دے دیا ہے۔ سو دوبارہ سے رابطہ وہیں سے بحال کرنا پڑے گا جہاں سے چھوٹا تھا۔ ہم سفر کے فنکاروں سے ملاقات نے بھی خوب رنگ جمایا اور زین کو یہ ہوئی نا بات میں باتیں کرتے دیکھ کر اچھا لگا۔ خاصے نٹ کھٹ ہیں۔ چلیے، دوشیزہ کی رونق مزید بڑھ گئی اور اب کچھ باتیں آپ دونوں سے، جو دوشیزہ کی ہر ماہ دوشیزگی بڑھاتے ہیں۔

آپ کا اداریہ خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے تھا مگر لگتا ہے وہ دن پاکستان میں خواتین پر تیزاب پھینکنے کا دن تھا۔ تین سے چار واقعات اسی خاص دن پیش آئے۔ عورت کی مظلومی اور بے بسی پر سارا دن دل کڑھتا رہا مگر کیا کیا جائے۔ مرد حضرات کے اس معاشرے میں عورت کی چیخ کو سننے والے کم کم ہی ہیں۔ اللہ عورت کے حق میں وہی بہتری رکھے جو اسلام نے رکھی ہے۔ دوشیزہ جنوری کے شمارے میں ان سے ملیے خاصے کی چیز تھا۔ سو اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کاشی خوش رہو ہمیشہ۔ سب کی خدمت میں درجہ بہ درجہ سلام عرض ہے اور اس دعا کے ساتھ اللہ حافظ کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور دوسروں کی خوشی کا سامان کرتے رہیں کہ یہ معمولی نیکی اللہ کے لیے سب سے پسندیدہ ہے اور اللہ کی پسند کا خیال رکھنا، مومن کا وصف ہے۔

✍ شمع حفیظ! بہت دنوں بعد محفل میں آمد کا شکریہ لیکن تحریر ذرا جلدی جلدی بھیجو۔ ایسے غائب نہ ہو جایا کرو۔

✉ فریدہ مسرور، کراچی سے لکھتی ہیں۔ خدا تمہیں بہت خوشیاں دکھائے، آمین۔ رخسانہ صاحبہ، منزہ اور آفس کے تمام ساتھیوں کو السلام علیکم! ہر چند کہ آج کل وقت کم ہے اور مقابلہ سخت والی کیفیت طاری ہے مگر مارچ کے دوشیزہ نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دوشیزہ کی دیرینہ ساتھی اور میری پسندیدہ رائٹر دلشاد نسیم کے دکھ نے سخت افسردہ کر دیا ہے۔ میں تو فون پر ان سے تعزیت بھی نہ کر سکی کہ دکھ اس قدر بڑا ہے اور میرے اندر ہمت نہ تھی۔ دلشاد! اللہ سے صبر مانگو...... تب ہی تمہیں صبر آئے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں بہت ہمت اور حوصلہ عطا کرے اور مرحوم کی مغفرت کرے، آمین۔ محفل میں رضیہ مہدی کے خط میں شامل اس ایک مصرعے نے دل کو پکڑ لیا ہے، جب احمدِ مرسل نہ رہے، کون رہے گا...... بہت خوب رضیہ! اس مصرعے اور اس کے آگے کے تمہارے الفاظ نے دل پر مرہم کا سا کام کیا ہے، خوش رہو! محفل میں دیگر دوستوں کے خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ شمیم ناز صدیقی! وعلیکم السلام۔ تسنیم فضل خالق کی عرصے بعد آمد اچھی لگی۔ خالد ہما کی دوبارہ آمد پر بھی خوش آمدید کہ وہ واقعی بہت اچھی شاعری کرتے ہیں۔ رنگِ افسانہ میں فرحت صدیقی کا افسانہ بہت پُر اثر ہے۔ دل کو چھو لینے والا...... شمع حفیظ کا افسانہ بہتر تھا مگر میرے خیال میں ناول نگاری میں ان کا قلم زیادہ اچھا چلتا ہے۔ نظارت نصر کا افسانہ ایک بہت اہم پیغام کے ساتھ، بہت عمدہ افسانہ ہے۔ نزہت جبیں کا افسانہ خیال اور پلاٹ کی نسبت اچھا رہا مگر طرزِ تحریر کے حساب سے بہت گہرا رنگ نہ جما سکا۔ صائمہ حیدر کا افسانہ بہت بہتر تھا۔ نئے رائٹرز اگر مطالعے اور مشاہدے کی طرف زیادہ توجہ دیں اور مزید محنت کریں تو یقیناً یہ سب نئے نام دوشیزہ کے قلم قبیلے میں بہت اہمیت حاصل کر سکتے ہیں۔ بلال فیاض کا افسانہ بہت اچھا ہے۔ انہوں نے اپنی بات بہت عمدگی اور پُر اثر انداز میں کہہ دی ہے۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ گو کہ کہانی کے اعتبار سے

معروف صحافی محمد شاہد کی بھانجی حرا منان کی شادی اُسامہ سے بخیر و خوبی انجام پائی، ان یادگار لمحات پر ڈاکٹر شہلا عامر العباد خان اور ڈاکٹر نزہت ناز کو ادارہ دوشیزہ کی جانب سے مبارک باد......!

اس میں کوئی نیا پن نہیں تھا مگر سکینہ کے مضبوط اندازِ بیاں اور خوب صورت الفاظ نے قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ سلمیٰ یونس کا مکمل ناول مکمل ہو تو اس پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسط میں تو ابھی بہت سی باتوں کے الجھاؤ ہیں۔ نگہت اعظمی کا سلسلہ وار ناول اب شاید اختتام کی طرف گامزن ہے۔ سو تیزی سے موڑ لے رہا ہے۔ مارچ کی قسط میں یہ بات عجیب لگی کہ ایک طرف صبا فون پر اپنی ماں کو عارفہ کی موت کی اطلاع دے رہی ہے اور دوسری طرف عارفہ اپنے اسکول میں مصروف ہے۔ کہانی میں بھرپور طریقے سے موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہانی کے صفحات آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک تکنیکی غلطی ہے۔ کہانی پوری خوب صورتی سے چل رہی ہے یہ اور بات کہ اس غلطی نے انجام کو گھول کے رکھ دیا ہے۔ رسالے میں شاعری کے انتخاب کی میں نے پہلے بھی داد دی ہے اور اب بھی یہی کہوں گی کہ بہت خوب! خصوصاً محفل کی ابتداء میں زمرنعیم کی نظم اور درمیانی صفحات میں شاہدہ ناز قاضی کی نظم بہت عمدہ ہے۔ فرزانہ آغا کے ناول کی خوش خبری پڑھ کر لطف آگیا ہے۔ ناول یقیناً ان کے ناولٹس کی طرح شاندار ہوگا۔ اب اجازت؟ سب کو میرا بہت بہت سلام اور دعائیں۔"

فریدہ مسرور! تمہاری آمد آفس میں بھی ہوئی تو اچھی لگی اور محفل میں بھی۔ نگہت اعظمی کے ناول میں صفحات اِدھر اُدھر نہیں بلکہ عارفہ کی زندگی کی کہانی میں یہ ہی موڑ ہے جو کہانی کی بنیاد ہے اور نگہت اعظمی اسے بڑے اچھے انداز میں لے کر چل رہی ہیں۔ یہ کہانی کا سسپنس ہے جسے وہ آخری قسطوں تک کامیابی سے لے کر چلی ہیں۔ تم نے شاید شروع سے مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ سوال ذہن میں نہ آتے کہ کہانی میں عارفہ کا کردار ہی بنیاد ہے اور سسپنس بھی اسی کردار میں ہے۔

ایڈیسن اور یس مسیح، کراچی سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے بخیر و عافیت ہوں گی۔ میں بھی اب کافی بہتر ہوں، آپ سب دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ بڑا حوصلہ ملتا ہے، خدا خوش رکھے۔ فرزانہ آغا، شگفتہ شفیق، راجہ محمود، حارث بن عزیز اور سیما بنت عاصم آپ سب کی محبتوں کے لیے بھی خاص شکر گزار ہوں۔ دلشاد نسیم کے شوہر کی وفات پر دلی دکھ ہوا۔ بیماری کی حالت میں کسی کے مرنے کی خبر زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس مرتبہ محفل زیادہ دلچسپی سے پڑھی رضیہ مہدی، رضوانہ کوثر، فریدہ مسرور، شمیم ناز، علی رضا، تسنیم فاطمہ، عقیلہ حق، ارم زہرا، فرحت جمال اور شگفتہ شفیق کے ساتھ ساتھ پرل پبلی کیشنز کا، یہ بند کھڑکیاں پسند کرنے، قابلِ ذکر سمجھنے اور ایوارڈ دینے پر تہہ دل سے ممنون ہوں۔ تعریف یقیناً مہمیز کا کام دیتی ہے۔ عظمت اتا کا کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملے گا۔ بہت خوشی کی بات ہے، بے حد مبارکباد۔ محفل میں پتا چلا کہ شگفتہ شفیق کا دل پھر کچھ کہتا ہے، واہ بھئی پیشگی مبارک باد۔ اس مرتبہ سرورق خاصا خوشگوار سا ہے۔ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے بجا فرمایا مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں حق تلفی زیادہ ہے۔ عورت فاؤنڈیشن کی رپورٹ کے مطابق صرف 2011ء میں عورتوں کے اغواء کے 1846، زیادتی کے 734 اور قتل کے متعدد واقعات میں 322 خواتین جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ تیزاب پھینکے جانے کی وارداتیں الگ ہیں۔ اسی حوالے سے یاد آیا۔ پچھلے دنوں شرمین عبید چنائے کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بہت بڑی خوش خبری ہے سب کو بے حد مبارک باد۔ رنگِ فسانہ کے رنگ اس بار کچھ پھیکے پھیکے سے رہے۔ صائمہ حیدر نے بلاشبہ پُر تاثر افسانہ تحریر کیا ہے۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ خاصے کی چیز تھا۔ گو کہانی نئی نہیں تھی مگر اسلوب کہانی پر گرفت شاندار رہی۔ سلمیٰ یونس کا ناول بہت خوب صورت رہا۔ یقیناً اگلی قسط بھی اس طرح پُر تاثر ہوگی۔ ہمسفر پر، رداناصر کا تبصرہ بھی پسند آیا، یہ ہوئی نہ بات، نیا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ شاعری میں توقیر تقی،

انا للہ وانا الیہ راجعون

میری پیاری پھوپی عطر بانو بنت محمد خالق کا پچھلے ہفتے انتقال ہو گیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اُن کی مغفرت کے لیے دعا کیجئے۔

منجانب

اِرم زہرا

یادِ عظیم، شگفتہ شفیق، حسین عابد مسعود قمر (یہ کیا دونوں نے مل کے لکھی ہے یا ایک نام ہے؟ ہاہاہا) خوشبیر سنگھ شاد اور شاہین عباس پسند آئے میری غزل لگانے کا بھی شکریہ۔

ایڈیسن ادریس مسیح! تمہارا تفصیلی تبصرہ اس ماہ خاصے کی چیز رہا۔ تمہاری صحت کی دعا تو سب ہی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔ اس لیے امید ہے کہ تم جلد ہی ہم سے ملنے آؤ گے۔ فون اور Msg کرنے کی عادت ذرا کم ہے تو یہ نہ سمجھنا کہ دعا کی بھی عادت نہیں ہے۔

علی رضا عمرانی، سجاول سے لکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار آپ کو اور دوشیزہ اسٹاف کو ہمیشہ سرخرو اور کامیاب کرے، آمین۔ سب سے پہلے دلشاد نسیم کے شریک حیات، خالد صاحب کی وفات پر میں ان سے تعزیت کرتا ہوں۔ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ ایڈیسن ادریس مسیح کو دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ملنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ سلمیٰ یونس کا مکمل، ناول چور دروازے کی پہلی قسط ہمارے معاشرے کا وہ المیہ ہے، جس میں عورت ذات کو ہمیشہ کمزور اور محتاج دکھایا گیا ہے لیکن جب پانی سر سے گزرنے لگے تو ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا کچھ بھی نہیں رہتا اور جب بھی کوئی حق تلفی ہونے لگے تو پھر بغاوت جنم لیتی ہے اور پھر وہی بغاوت باغی کو انقلاب کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر سمجھو محبت کو، سکینہ فرخ کی تحریر دل کو چھو جانے والی تخلیق ہے، جس سے سبق ملتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنی حد میں رہنا چاہیے۔ کچھ بھی ہو جائے لیکن تکبر یا غرور نہیں کرنا چاہیے۔ چاہت اور نفرت کی حیرت انگیز داستان کا احساس لیے ہوئے سکینہ فرخ کی یہ تحریر نہایت ہی شاندار اور دلکش ہے۔ ریت کا گھر، فرحت صدیقی کی تحریر کی حقیقت جو ہر عورت کے ساتھ منسلک ہے، واقعی سب کچھ چلتا رہتا ہے لیکن رہ جاتی ہے عورت کی تنہائی اور اکیلا پن، جس کا درد صرف وہی جان سکتی ہے۔ نظارت نصر کی تحریر سارے مسلمانوں کو جھنجھوڑنے والی تحریر ہے، جو کہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کیا ہم آج کل کے مسلمان اپنے دین سے سچے ہیں یا نہیں؟ واقعی نظارت نصر کی تحریر اپنے پیچھے کئی سوالیہ نشان چھوڑ گئی ہے۔ نزہت جبیں ضیاء کی تخلیق، احساس کو چھونے والی زبردست تحریر ہے، جو کہ یہ ثابت کرتی ہے نزہت جبیں ضیاء میں اچھا لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لان کا تھری پیس سوٹ صائمہ حیدر کی تحریر اچھی تحریر ہے۔ محمد بلال فیاض کا افسانہ بے حد خوب صورت اور شاندار ہے کیونکہ ہر چیز واپس پلٹتی ضرور ہے۔

علی رضا عمرانی صاحب! اب تو آپ کو افسانہ لکھ ہی لینا چاہیے، کیا خیال ہے؟؟

نسیم نیازی لاہور سے لکھتی ہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے سوچتی رہتی ہوں کہ اب باقاعدہ دوشیزہ کی محفل میں شامل رہوں گی کہ اس محفل میں شامل ہونے کا بھی اپنا مزا ہے مگر جب سے دوشیزہ کا اعزازی پرچہ بند ہوا ہے تو دوشیزہ کا وقت پر ملنا بھی محال ہو چکا ہے۔ اب وہ عمر بھی نہیں رہی جنون کی کہ دوشیزہ کی آس میں ہر روز بک اسٹال پر چکر لگاتی رہوں، گو سات تاریخ کے بعد تیرہ چودہ تاریخوں میں دو سے تین چکر پھر بھی لگاتی ہوں پھر کہیں جا کر دوشیزہ

کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ جب پرچہ تاخیر سے ملتا ہے تو پڑھنے میں بھی ایک دو دن لگ ہی جاتے ہیں۔ دوشیزہ ہاتھ میں آتا ہے تو محفل میں یونہی بے نام حوالے سے بھی نگاہیں بھٹک بھٹک جاتی ہیں بہنوں کے خطوط پر پھر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی خط میں اپنا ذکرِ خیر دکھائی دے جاتا ہے تو میرا معصوم سا دل خوش ہو جاتا ہے۔ سو بہنوں بہت شکریہ مجھے یاد کرنے کا۔ اس بار محفل کے آغاز میں زمر نعیم کی نظم دعا پر آمین کہتے ہوئے خطوط کی طرف بڑھی رضیہ مہدی کی دعاؤں پر بھی بے اختیار آمین کہا کیونکہ اس سال کا آغاز آزمائشوں کے عجیب عجیب رنگ دکھاتا گزر رہا ہے۔ دل خوف کے عالم میں گرفتار ہے اور ہر پل اچھے کی دعا ہے، سو دوشیزہ بہنوں سے بہت اچھے کی دعا کی گزارش ہے۔ نشاط خان کو بھی عائشہ کی شادی کی بہت بہت مبارک۔ بینا عالیہ کو بھی عائشہ کی منگنی کی مبارک۔ دردانہ نوشین خان کو دانیال کی 23 مارچ کو ہونے والی شادی پر دلی مبارک۔ میری دعا ہے، اللہ سب بچے بچیوں کے نصیب اچھے کرے اور اللہ ماں باپ کے دل اولاد کی خوشیوں سے ٹھنڈے رکھے آمین۔ ایڈیسن میرے بھائی میری دلی دعا ہے اللہ تمہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ اتنی سی عمر میں ایسی بیماری! بس مجھے یقین ہے تم ہماری دعاؤں اور اپنی ہمت سے، بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے، انشاءاللہ۔ سنبل کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جہاں لفظ بہت کچھ کہنے کی چاہ میں گونگے ہو جاتے ہیں کہ ماں تو بیٹوں کے لیے محبتوں کا ایک جہان ہوتی ہے اور میکہ ہر لڑکی کا ماں کے دم سے آباد ہوتا ہے۔ ماں نہ رہے تو پھر زمین سے آسمان تک پوری کائنات خالی خالی سی لگنے لگتی ہے مگر یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ ہر بشر نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ دلی دعا ہے، اللہ تمہیں صبر دے اور امی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ دلشاد نسیم، شوہر عورت کا سائبان ہوتا ہے اور عورت بغیر چھت کے بے سائبان ہوتی ہے۔ دکھ کی اس گھڑی میں نہ لفظ ہیں میرے پاس، نہ تسلی نہ دلاسہ، خدا تمہیں سکون دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ فریدہ جی خط تو لکھ دیا تم نے کوئی افسانہ ناولٹ بھی لے کر آؤ، بہت دن ہو گئے تمہیں پڑھے ہوئے۔ عقیلہ جی خط لکھنے کے فن سے آگاہی تمہیں مبارک ہو۔ امید ہے صفیہ سلطانہ کے بعد تم بھی دوشیزہ میں منفرد خطوط کے حوالے سے آگے چل کر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دوگی، بشرطیکہ خطوط کی روانی اسی طرح قائم رہی تو۔ حصہ نظم میں زمر کی دونوں نظمیں شگفتہ شفیق کی غزل شاہدہ ناز قاضی کی نظم، ماہ طلعت زاہدی، افتخار عارف کی غزل نے رنگ جما دیا۔ شائستہ عزیز کو میابی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے پر مبارکاں، اللہ مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ زمر نعیم کا ناول دلچسپ مراحل میں داخل ہو گیا ہے تو ارم زہرا بھی تیزی سے کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ، اگر تجھو محبت کو ایک پرانی کہانی کو نئے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش سو سو رہی۔ وہی مرد کی اکڑ اور عورت کی قربانی۔ ریت کا گھر، فرحت نے اپنے گھر کی کہانی کو بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ اللہ عنبر کو سکون دے، آمین۔ شمع حفیظ کا ڈھکوسلہ میرے خیال میں اس بار بازی جیت گیا۔ زندگی کی ڈھکی چھپی تلخ حقیقت کو شمع نے بہت خوبی سے بیان کیا۔ نظارت نصر کی کہانی میں کچھ خاص نہ تھا بلکہ ایک واقعہ کو بیان کیا ہے کہانی کے روپ میں۔ نزہت جبیں ضیاء عموماً قربانی دینے والی ماؤں کا آخر میں انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں تو نیکیاں کرنے کی سوچ رکھنے والوں کو بھی خوفزدہ کر دیں گی۔ صائمہ حیدر کی تحریر، البتہ خوب صورتی کے ساتھ بڑھی اور انجام پذیر ہوئی۔ منزہ سہام کے لیے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ دعا ہے کہ اس پیاری بیٹی نے ماں کی عمرے کی دیرینہ خواہش کو پایہ تکمیل پہنچا کر جو نیکی کمائی ہے، اللہ اسے اس کا بے حد حساب اجر دے گا اور ضرور دے گا۔

✍ نسیم نیازی! تمہارا خط پڑھ کر، سب دوست تمہیں دعائیں دے رہے ہیں۔ خوش رہو اور خوشیاں بانٹو، آمین۔

☒ صبیحہ شاہ، کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! رسالوں کے سرورق پر دلہنیں دیکھ دیکھ کر طبیعت اس قدر اُوب گئی ہے کہ یقین کرو شادیوں میں دلہنیں دیکھنے کا دل نہیں چاہتا۔ مجھے رسالہ، آج 18 مارچ تک نہیں ملا ہے۔ اقبال صاحب، سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ رسالہ بھیجا جا چکا ہے۔ شاید یہ محکمۂ ڈاک کا کرم ہو۔ سو گزشتہ شمارے کے بارے میں ہی بات کر سکتی ہوں۔ منزہ اور رخسانہ آپا عمرے سے واپس آ چکی ہوں گی۔ ان کے لیے بہت سے سلام اور مبارکبادیں۔ زمر نعیم کے ناول میں، پیر صاحب کے حوالے سے دلچسپی اور تجسس بڑھ رہا ہے۔ نگہت اعظمی کا ناول، دو دیس بس جانے والوں کے رویوں کی تصویر، کبھی واقعی مجبوری، کبھی خود غرضی و بے حسی۔ ایک ناول لکھنے کے لیے، شاید کئی زندگیوں کا تجربہ درکار ہوتا ہے۔ ارم زہرا اٹھان اچھی ہے مگر ابھی محنت کی ضرورت ہے۔ عقیلہ حق کی بھوک اچھی لگی۔ ایڈیسن ادریس مسیح کی بند کھڑکیاں، بہت حساس اور بہت زیادہ برتے گئے موضوع پر خوب صورت اور بہت مہذب افسانہ، اچھا لگا۔ اللہ اس بچے کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تسنیم منیر علوی کا عام سا افسانہ آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے خاص بن گیا۔ فرح اسلم بڑی سی بات چپکے سے کہہ گئیں۔ انتخاب خاص واقعی خاص ہوتا ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے۔ نگہت غفار، سنبل! آپ سب کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ سنبل سے کئی مرتبہ بات کرنا چاہی مگر نا معلوم کیوں میری آواز ان تک پہنچ نہ پائی۔ دلشاد نسیم سے تو بات ہو گئی تھی۔ کاشی چوہان کو صاحب کتاب بننے پر مبارک باد۔ شائستہ عزیز کا ڈرامہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اٹھان اچھی ہے، آگے بھی یقیناً اچھا ہوگا۔ میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ کچھ لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ لگتا ہے زنگ لگ گیا ہے۔ بقول شخصے، کسی اچھی کمپنی کے ریگ مال کی ضرورت ہے۔ سب پڑھنے لکھنے والے خوش رہیں۔ سب کے لیے بہت سی دعائیں۔

✍ صبیحہ شاہ صاحبہ! آپ کا خط ملا صرف خط...... کیا یہ دوشیزہ کے پڑھنے والوں کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں، بہت دن ہو گئے اب کچھ لکھ بھیجیے۔

☒ شگفتہ شفیق، کراچی سے لکھتی ہیں۔ خوب صورت ٹائیٹل سے سجا، مارچ کا دوشیزہ اس بار خلافِ توقع 13 تاریخ کو مل گیا ہے، اسی لیے ہمارا خط بھی فٹافٹ حاضر ہے۔ غزالہ ڈیئر! تمہارا اداریہ بے حد اچھا، پیارا اور سچا ہے۔ زادِ راہ میں اس بار اسراف کا موضوع چنا گیا ہے۔ مختصر لیکن جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔ میٹھے پیارے عمرہ سفر کی تصاویر بہت اچھی لگیں۔ منزہ، اپنی ڈائری سے باتیں میں تو لمبی پلاننگ کر رہی ہیں۔ سات سمندر پار جانے کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خواہشات اور خواب سب پورے کر دے۔ اس بار دوشیزہ کی محفل کا ابتدائیہ، ہماری پیاری

ایجنٹ / قارئین کی توجہ کیلئے

اگر آپ کو ماہنامہ دوشیزہ اور ماہنامہ سچی کہانیاں کے حصول میں کوئی دشواری پیش آ رہی ہے تو مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کریں۔ انشاءاللہ مسئلہ فوری حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

محمد اقبال زمان (سرکولیشن منیجر) 0333-2269932

رابطہ برائے آفس: 34939823 - 34934369

سرورق

ماڈل : نینا بتول
میک اپ : روز بیوٹی پارلر
فون نمبرز : 021-34977970
عکاسی : موسیٰ رضا

زمر نعیم کی خوب صورت دعائیہ نظم سے ہوا ہے۔ نظم کے علاوہ زمر نعیم کا خط بھی بے حد اچھا لگا۔ رضوانہ کوثر اور رضیہ مہدی کے خوب صورت خطوط بھی، محفل کی شان بڑھا رہے تھے۔ فرحت صدیقی نے ارم زہرا کی تحریر کے لیے جو جملے لکھے ہیں واقعی زبردست اور اس لائق ہیں کہ انہیں بار بار پڑھا جائے۔ دلشاد نسیم کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کہ ان کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اللہ پاک خالد صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ ایڈیسن کو ایوارڈ کی دلی مبارک باد۔ ردا ناصر نے ہم سفر کے فنکاروں سے بڑی بھرپور ملاقات کرا ڈالی ہے اور جناب ہمارے چھوٹے پیارے سے زین العابدین نے اس بار بہت ہی اچھے جوابات دیے۔ بے حد مزہ آیا، یہ ہوئی نا بات پڑھ کے۔ زمر نعیم تم میرے ساتھ رہو، بہت ہی خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ نئے موڑ لیتا ہوا یہ ناول کامیابی سے اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ اگر سمجھو محبت کو وہی سمجھوتے کی چادر لپیٹے ہوئے حقیقی کہانی تھی جو کہ گھر گھر کی کہانی ہے جس کے لیے کشور ناہید نے لکھا ہے کہ ظاہری بیاہی ہوئی تو ہمارے بہت سے گھروں میں بستی ہیں۔ نگہت اعظمی کا ہر اشک اک ستارہ کی کہانی بہت ہی اعلیٰ ہے۔ ان کے بعض ڈائیلاگز ڈائریکٹ دل سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اکثر یوں لگتا ہے کہ کسی کسی وقت وہی سماں اور وہی موسم کہیں نزدیک سے ہو کے گزرا ہے۔ فرحت صدیقی کا غمگین حقیقی افسانہ، پڑھ کے آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ شمع حفیظ کا افسانہ بھی اچھا تھا لیکن موضوع پرانا لگا۔ کبھی کبھی خیالات یوں بھی مل جاتے ہیں۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ نظارت نصر نے مذہبی معلومات سے دُوری پر اچھا سبق آموز افسانہ لکھا ہے۔ نزہت جبیں کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ صائمہ حیدر کا لان کا تھری پیس سوٹ بھی اچھا لگا۔ محمد بلال فیاض کا افسانہ سب منظر خاموش اس بار بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ ارم زہرا کے ناول کی قسط اس بار بھی خوب لگی۔ عمرانہ پروین نے خوشی کی تلاش بہترین تحریر لکھی اور جناب آپ محبت چاہیے ہوگا، نظم صدف تبسم نے خوب ہی لکھی۔ بنتِ حوا میں مسرت گیلانی کا مضمون بھی پسند آیا اور کیا کیا ہو رہا ہے؟ مزے اور دن رات کام، محنت زیادہ سے زیادہ...... جب ہی تو دوشیزہ خوب سے خوب تر کی طرف رواں ہے۔

✤ شگفتہ شفیق! کبھی کبھی سوچتی ہوں، تم سے بات کر کے، تمہارا خط پڑھ کے...... والدین نام رکھتے ہوئے کیا سوچا کرتے ہیں، خاص طور پر تمہارا نام...... ہمیشہ مسکراؤ، آمین۔

✉ فرحت جمال کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! اس دعا کے ساتھ حاضر ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ سب سے پہلے منزہ صاحبہ اور رخسانہ آنٹی کو بہت بہت عمرے کی سعادت مبارک ہو۔ عالمی یوم خواتین، غزالہ صاحبہ کی خوب صورت تحریر سے ہوتے ہوئے زادِ راہ، جو ایک خوب صورت اور روشن سلسلہ ہے جو دلوں کو منور کر دیتا ہے۔ تصویری یادیں ایک سفر مقدس کی سے ہوتے ہوئے منزہ صاحبہ کی اپنی ڈائری سے باتیں لاجواب رہیں۔ جیسے ہی دوشیزہ کی محفل میں قدم رکھا تو زمر نعیم کی پیاری سی دعا پڑھنے کو ملی اور پھر سب ہی دوست لکھاریوں کے دکھ سکھ میں شریک ہو گئے۔ سب ہی کے خط، بہت پسند آئے۔ 2011ء کے ایوارڈ یافتگان کو بہت بہت مبارک باد، بھائی ایڈیسن ادریس کو بھی ایوارڈ کی نامزدگی پر مبارک باد قبول ہو۔ مجھے عقیلہ حق سے کہنا ہے عقیلہ جنتری نامہ میں کہیں یہ بھی ہے کہ تبصرہ نگاروں اور شعراء کو بھی ایوارڈ سے نوازا جائے۔ صرف پرانے شعراء ہی نہیں نئے شعراء اور تبصرہ نگاروں کو بھی! ایسا ہو جائے تو مجھ سے، اپنی فرحت جمال سے ایوارڈ دینے کا سلسلہ ہو جائے۔ پلیز پلیز عقیلہ حق جلدی سے پیشن گوئی کر دیں، شکریہ۔ محترم عظمت اتا کا کو اگست 2011ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے پرائیڈ آف پرفارمنس دیے جانے والے اعلان پر بہت خوشی

ہوئی۔ باتیں ملاقاتیں، زبردست رہی۔ یہ ہوئی نا بات دلچسپ سلسلہ لگا۔ زمر نعیم کا ناول تم میرے ساتھ رہو، خوبی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سلمیٰ یونس کا ناول چور دروازے، کا پہلا حصہ اچھا رہا۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ، اگر سمجھو محبت کو حساس موضوع پر اچھا لگا۔ نگہت اعظمی کا ناول ہر اشک اک ستارہ کافی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ فرحت صدیقی کا افسانہ ریت کا گھر، دل کو بہت زیادہ اداس کر گیا۔ شمع حفیظ کی ڈھکوسلہ اور نظارت نصر کی تحریریں پسند آئیں۔ نزہت جبیں کی تحریر، میر اکل واپس کر دو خوب صورت لگی۔ صائمہ حیدر نے لان کا تھری پیس سوٹ خوب تحریر کیا۔ بلال فیاض کی تحریر سب منظر خاموش، مکافاتِ عمل پر اچھی لگی۔ ارم زہرا کی تحریر چاند میرا منتظر دل میں جگہ بنا گیا، بہت خوب۔ جنم جوگ بہترین انتخاب رہا۔ احمد ندیم قاسمی ادب کا بڑا نام ہم اک موٹر خریدیں گے، زبردست تھی۔ بنتِ حوا، خوب صورت سلسلہ، مسرت گیلانی بہت سی دعائیں آپ کے لیے دریچے بہت پیار سے اسماء اعوان سجاتی ہیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سب کی شاعری زبردست رہی۔ ایک دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کا راستہ دکھائے، آمین۔

فرحت جمال! آپ کا تفصیلی تبصرہ، ہماری ہمت افزائی کرتا ہے۔ مشورے سنبھال لیے ہم نے، ایوارڈ محبتوں کا ہوتا ہے جو کبھی بھی پرانی نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان پر دھول جمتی ہے، سمجھو اگر تو......

فرحت صدیقی، فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ دوشیزہ مجھے 13 مارچ کو ملا۔ پھولوں اور زیورات سے سجی دوشیزہ، بہت معصوم اور پیاری لگی۔ اس کو دیکھ کر میرے اداس چہرے پر خود بخود ہی مسکراہٹ آ گئی مگر یہ خوشی اگلے ہی پل غم میں بدل گئی۔ جب دلشاد نسیم کے جیون ساتھی کا ساتھ ختم ہونے کی خبر ملی۔ یقین کیجیے دل دکھ سے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ دلشاد کو اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ دے، آمین ثم آمین۔ اس دکھ کا اندازہ مجھ سے زیادہ کون کر سکتا ہے؟ ہم سفر ڈرامہ تو کبھی کبھار ہی کوئی قسط دیکھ پائی ہوں مگر ڈرامہ کی کہانی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ فرحت اشتیاق کی تحریر واقعی بہت اچھی اور حقیقت کے قریب ہے۔ زمر نعیم کے ناول کی قسط حسب معمول اچھی رہی۔ اس مرتبہ، مجھے چور دروازے کی دوسری قسط کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔ زبردست بہت اچھی، سلمیٰ یونس کو مبارک باد۔ ان کا یہ جملہ "ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جو حقیقی رشتوں میں آزمائے گئے ہیں" اپنے اندر ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ حقیقت کی کہانی ہے ایک اور فقرہ "یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی گناہ کرنے کی سزا بھی نہیں پاتا ہے، کوئی ساری عمر نا کردہ گناہوں کی سزا بھگتا رہتا ہے۔" کمال ہے بھئی، بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ریت کا گھر کی اشاعت کا شکریہ، کوشش کروں گی ہر ماہ آپ کی محفل میں آسکوں۔ اگر سمجھو محبت کو، بہت خوب صورت ناولٹ تھا۔ عمیرہ کے کردار کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکی۔ میری طرف سے سب کو بہت بہت سلام۔

فرحت صدیقی صاحبہ! آپ کی آمد ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ آپ جم جم آئیں اور محفل میں بھی...... یہ تو خوش خبری ہوئی ناں۔ آپ کی بہادری پر رشک آتا ہے۔ اتنی اچھی، پیاری ای کبھی کبھی تو عنبر سے حسد ہونے لگتا ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے، آمین۔

سنبل کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! خدا کے فضل و کرم سے ہم سب یہاں پر خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت، خداوند سے نیک مطلوب ہے۔ سب سے پہلے میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی ان تمام احباب کا، جنہوں نے میرے دکھ کو محسوس کیا اور مجھ سے تعزیت کی۔ سب سے پہلے امبر سہیل، جس کے دل کی کوئی نہ کوئی راہ تو ضرور میرے دل سے ہو کر گزرتی ہے۔ میں بتاؤں نہ بتاؤں، اس کا فون آجاتا ہے کہ دیکھا تم پریشان تھیں

ناں! میرا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو۔ عقیلہ حق، صبیحہ شاہ، فرح اسلم قریشی، رضوانہ کوثر، کاشی، غزالہ، شائستہ اور ناصر بھائی نے مجھ سے فون پر تعزیت کی۔ منزہ کا تعزیتی لیٹر آیا اور اب رضیہ مہدی، فریدہ مسرور، شمیم ناز، علی رضا، ایڈیسن، ارم زہرا اور شگفتہ نے ڈائجسٹ کے ذریعے تعزیت کی۔ اگست سے میں دوشیزہ نہیں پڑھ سکی تھی سو بہت سے پیاروں کی بیماریوں اور رحلت کی خبریں پڑھیں دیر سے ہی سہی مگر مجھے سب کو بتانا ہے کہ ان کے دکھوں اور خوشی میں، میں ان کے ہمراہ تھی۔ منزہ سہام کو فلک ٹائمز کی مبارک باد قبول ہو۔ اسی دوران مختلف لوگوں کی بیماریوں کا پتا چلا جن میں ایڈیسن، فریدہ مسرور اور ان کی بہن سویرا فلک کے والدین، ناہید فاطمہ کے زین کا ایکسیڈنٹ، پرویز بلگرامی کے زین، تسنیم منیر کے شوہر کے لیے دعائے صحت۔ میری خدا سے دعا ہے کہ آپ سب لوگ اب تک صحت یاب ہو چکے ہوں اور جو نہ ہوئے ہوں، انہیں خدا صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ اب سب سے مشکل کام لواحقین سے تعزیت۔ کیا دنیا میں وہ الفاظ ہیں جو کسی جانے والے کے لیے بطور تعزیت استعمال کیے جا سکیں۔ کسی کے دکھ کا مداوا کر سکیں، کسی کے دل پر پھایا رکھ سکیں۔ بہر حال غزالہ جی مجھے فاروق بھائی کا ابھی پتا چلا اور میں بہت غریب ہوں تعزیتی الفاظ کے سلسلے میں۔ ہاں میں آپ کا دکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ صبر رضائے الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ دلشاد نسیم کے شوہر، کاکی کے والد، نگہت غفار کے شوہر، زبیر عباسی، ابرار الحق شمسی، فرحت صدیقی کے داماد۔ خدا آپ تمام لوگوں کے لواحقین کو جنت الفردوس میں بہتر مقام عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل، آمین۔ شگفتہ تمہیں بھی کامیابیاں مبارک ہوں اور نشاط خان کو بیٹی کی شادی کی مبارک باد۔ اس دوران کچھ تحاریر نے دل کو چھوا مثلاً اختر شہاب کا بڑی ای، سیما بنت عاصم ہے کوئی جواب، حنا دلپذیر کا انٹرویو اور شاعری، فرزانہ آغا، شمع حفیظ، فریدہ مسرور کی انڈیا یاترا، ابنِ کبیر، عمرانہ مقصود، ایڈیسن ادریس، فرح اسلم، مینا تاج۔ ہم سے ملیے واہ کیا بات ہے۔ کاشی چوہان، کیسا چ، زرم میوہ اچھے رہے۔ مسٹر اور مسز اتا کا اور دانش نواز کے انٹرویوز اچھے تھے اور اب تازہ شمارہ سب سے پہلے اداریہ۔ واقعی آپ نے درست کہا ہمیں اسلام نے ضابطہ حیات ہی نہیں ساڑھے چودہ سو سال پہلے ہماری عورت کو اتنے حقوق دے دیے ہیں جو کسی مذہب اور کسی قوم نے عورت کو نہیں دیے۔ زادِ راہ بہترین تھا۔ رخسانہ سہام مرزا کی آمد خوش آئند ہے۔ منزہ کو ماموں کی کامیابی مبارک۔ زین العابدین کا سلسلہ اچھا ہے۔ سلمیٰ یونس کے ناول کی ابتداء اور موضوعات اچھے ہیں۔ باقی رائے اختتام پر۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ ویمنز ڈے کے لحاظ سے بہترین تھا۔ شمع حفیظ کا افسانہ مرد کی نفسیات پر اچھا افسانہ تھا۔ اپنے فائدے کو سب منظور ہے۔ نظارت نصر نے بڑی اچھی بات اٹھائی۔ ہم نے بھی غسل کا طریقہ اپنی امی کی وفات کے بعد سیکھا ہے۔ میر اکل اچھا افسانہ تھا مگر انجام نے طبیعت مکدر کر دی۔ صائمہ حیدر کی اگر یہ پہلی تحریر ہے تو اندازِ تحریر لاجواب تھا۔ بلال فیاض نے بڑے اچھے اور آج کے عام موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور کیا خوب اٹھایا ہے۔ اب بات مکمل ناولز کی۔ نگہت جی تسی گریٹ ہو۔ وجہ آپ کا ناول ہے اس کی خاص بات ہے کہ یہ کہیں بھی، کبھی بھی رکا کھڑا محسوس نہیں ہوا اور اس کا ہر پیرا ایک سبق ہے۔ زندگی گزارنے کا لائحہ عمل زمر کا ناول بھی دلچسپی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ زہرا کا بھی ناول اچھا ہے مگر موضوع اور انداز خاصا بے باک ہے، آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ مسرت گیلانی جی چلیں، آپ کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ زلیخا حضرت یوسفؑ کی زوجہ بھی بنی تھی۔ منزہ، رخسانہ سہام، ناصر رضا کو سلام اور کاشی کو دعا۔

سنبل! اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے۔ اب ذرا تبدیلی کے ساتھ اچھے اچھے موضوعات لے کر آؤ ناں۔ ماحول

بہت افسردہ ہوگیا ہے۔

☒ زمرفیم لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے آپ اور ادارے کے تمام اراکین و اسٹنگین کی خیریت و عافیت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب ہی کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین ثم آمین۔ غزالہ جی! دل تو بہت چاہتا ہے کہ بھرپور تبصرے کے ساتھ دوشیزہ کی ہر تحریر کو سراہوں مگر افسوس کہ دوشیزہ کی دستیابی تاخیر سے ہونے کے سبب بروقت شمولیت سے رہ جاتی ہوں۔ اس بار بھی دوشیزہ بارہ تاریخ کو ملا۔ چند ایک تحریریں ہی رزقِ بصارت ہوسکی ہیں۔ سب سے پہلے سرورق کی دوشیزہ کی بات کروں گی۔ مسکراتے ہوئے نازکی کا احساس دے رہی ہے۔ اشتہارات پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے آپ کے اداریے عالمی یومِ خواتین میں آپ کے دیے پیغام سے میں تو پہلے بھی متاثر تھی۔ اللہ کرے صرف ایک دن مخصوص کرنے والے بھی اسلام کے مطمحِ نظر و فکر سے آگاہ ہو جائیں۔ زادِ راہ ہمیشہ سے پسندیدہ رہا ہے۔ منورہ نوری صاحبہ کا اندازِ بیان دل میں اتر جاتا ہے۔ تصویری یادیں ایک سفرِ مقدس کی۔ رخسانہ آنٹی اور زین العابدین کے علاوہ منزہ صاحبہ کو بھی یہ سفرِ مقدس بے حد مبارک ہو اور اللہ تعالیٰ ان کی تمام عبادات اپنی بارگاہ میں مقبول و منظور فرما کر انہیں جزائے خیر عطا کرے، آمین۔ اپنی ڈائری سے باتیں کر کے منزہ جی، ہماری اپنے والدین سے محبتوں کو بڑھانے میں بے حد کامیاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ منزہ جی، کی محبتوں کے شجر ہمیشہ سایہ دار رکھے، آمین۔ غزالہ جی! محفل کے آغاز میں مجھ ناچیز کی دعائیہ نظم لگانے کا بے حد شکریہ۔ اللہ آپ کو آپ کی محبتوں اور خلوص کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ محفل میں سب ہی کے خطوط، تبصرے، باتیں دلچسپ ہیں۔ ایڈیسن کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ سنبل کی والدہ کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور سنبل اور ان کے بہن بھائیوں کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔ دلشاد کا دکھ بھی ناقابلِ بیان ہے۔ شریکِ سفر کا بچھڑنا اور اس مقام پر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دلشاد نسیم دعائے مغفرت کے علاوہ ہم جانے والے کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ ایڈیسن کو رائٹرز ایوارڈ مبارک ہو۔ باتیں ملاقاتیں (سلسلہ) میں ڈرامے کی کہانی کے بجائے اگر اداکاروں کی آراء اور باتیں بتائی جاتیں تو زیادہ مزا آتا۔ نیا سلسلہ یہ ہوئی نا بات میں رخسانہ آنٹی کے برجستہ لطائف اور جوابات کی یاد دلا گیا۔ سلمیٰ یونس کے چور دروازے، کے لیے تبصرہ محفوظ ہے۔ مکمل ناول پڑھ کر دوں گی۔ ابتداء تو دلچسپ ہے یقیناً انجام بھی اچھا ہوگا۔ رنگِ فسانہ میں، فرحت صدیقی نے ریت کا گھر کے ذریعے اپنی بیٹی کے جس دکھ کا اظہار کیا ہے، وہ واقعی بہت بڑا دکھ ہے مگر سوائے صبر کے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ شمع حفیظ کا ڈھکوسلا، موجودہ دور کے المیوں میں سے ایک بڑا المیہ ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو آئینہ دکھانا اظہار لگا۔ خلفتہ کو آنے والی کتاب کی مبارک باد دینی ہے۔ شائستہ کو اچھا ڈرامہ لکھنے پر بے حد مبارک ہو۔ شائستہ کچھ دوشیزہ قارئین کے لیے بھی لکھ دو۔ نشاط خان کو بیٹی کی شادی بے حد مبارک ہو۔ منزہ، فریدہ، آنٹی رخسانہ اور اسٹاف ممبران کو سلام دعا عرض ہے۔

زمرفیم! سب تمہارے پیغامات وصول کر رہے ہیں۔ یہ محفل تو محبتوں دکھ سکھ شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کے رشتوں کو بھی تو بناتی ہے، سنوارتی ہے اور لکھاریوں کے قلم کو بھی سنوارتی ہے۔

☒ مسرت گیلانی، کراچی سے لکھتی ہیں۔ تاخیر سے محفل میں شرکت کی معذرت چاہتی ہوں مگر مستقل قاری ضرور ہوں۔ سب سے پہلے منزہ سہام، رخسانہ سہام، زین العابدین کو عمرے کی بہت بہت مبارک اور خدا تعالیٰ

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے..... خود کو منوایئے، اپنے قلم سے.....!

☒ اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

☒ اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

☒ سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کو یاد رہتے ہیں۔

☒ شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ دوشیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

ہوسکتا ہے اس سال دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں۔

(نوٹ: تحریر فوٹو اسٹیٹ ضرور کرالیں۔ ادارہ واپسی کا ذمہ دار نہیں!)

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

ایسی سعادت سب مسلمانوں کو بار بار نصیب کرے، آمین۔ دلشاد نسیم کے شوہر کے انتقال کی خبر تکلیف دہ تھی۔ اللہ تعالیٰ دلشاد نسیم کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔ تمام قارئین کا شکریہ، جو بنتِ حوا کا سلسلہ شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں مزید لکھ پاتی ہوں مگر میری درخواست ہے کہ میرے قاری مجھے اپنی آراء سے نوازیں اور میں جلد اس سلسلے میں کچھ تبدیلی کرنا چاہوں گی۔ آپ کی تجاویز کا انتظار رہے گا اور دوشیزہ کے پورے اسٹاف کی محنت کو سراہتے ہوئے بالخصوص منزہ صاحبہ، غزالہ رشید اور تمام اسٹاف کے لیے دعا گو ہوں اور آپ سب سے اپنے لیے دعاؤں کی طالب رہوں گی۔ افتخار عارف کی غزل اور حسین عابد مسعود قمر کی نظم لاجواب تھی۔

✿ مسرت گیلانی صاحبہ! دوشیزہ کے ساتھی آپ کے سلسلے کو بطورِ خاص پسند کرتے ہیں۔ انشاء اللہ ضرور تجاویز بھی دیں گے۔ آپ کی آمد اگر محفل میں ہوتی رہے تو اچھا لگے گا۔

✉ نگہت غفار کراچی سے لکھتی ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی رحمتیں اور عنایتیں آپ پر، آپ کی فیملی اور دوشیزہ پر سایہ فگن رہیں، آمین۔ پیاری غزالہ جی میں تہہ دل سے آپ کی ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے میرے اس عظیم سانحہ میں میرا ساتھ دیا اور غفار صاحب مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور کروائی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں ایک عرصے سے بیمار ہوں اس لیے لکھنے کا سلسلہ ہر رسالے میں منقطع ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ زندگی رہی اور صحت نے ساتھ دیا تو پھر آپ جیسے مخلص اور پیارے دوستوں میں لوٹ آؤں گی۔ میری طرف سے تمام اہلِ خانہ اور اسٹاف کو حسب مراتب سلام و دعائیں، خاص طور پر میرے ان ہمدرد اور پیارے دوستوں کو جنہوں نے میرے اور غفار صاحب کے لیے دعائیں کیں۔

✿ نگہت غفار صاحبہ! آپ نے اس مشکل وقت میں بھی ہمارے لیے وقت نکالا، اس کے لیے آپ کا بے حد شکریہ اور دکھ سکھ میں دوستوں کے لفظ مرہم بن جاتے ہیں، ہے ناں سچی بات۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ یاسر دلاور خان، کراچی سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! ایک عرصے سے دوشیزہ زیرِ مطالعہ ہے مگر کبھی خط و تبصرہ وغیرہ لکھنے کی کوشش نہیں کی، اس مرتبہ سوچا کہ ہم بھی محفل کی زینت بنیں، گاہے بگاہے میری شاعری دوشیزہ میں چھپتی رہتی ہے، جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ دوشیزہ کی سینئر لکھاری، دلشاد نسیم کے شوہر کا سن کر بہت افسوس ہوا، خدا ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل۔ رخسانہ سہام مرزا اور منزہ سہام کو عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر دلی مبارک باد اور ایڈیسن کو ایوارڈ ملنے پر مبارک۔ عظمت اتا کا کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملنے پر خراجِ تحسین۔ ٹائٹل پر ردا اصفہانی اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی اچھی لگیں۔ زادِ راہ ایمان افروز سلسلہ ہے جو یقیناً سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت کم الفاظ میں بہت بڑے مضمون کا احاطہ کر رہا تھا۔ رنگِ فسانہ میں یوں تو سارے ہی افسانے بہتر تھے مگر ریت کا گھر اور لان کا تھری پیس سوٹ زیادہ پسند آئے۔ اس ماہ کا ناولٹ دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا۔ مکمل ناول چور دروازے کی پہلی قسط شاندار رہی اور دوسری قسط کا انتظار ہے۔ انتخابِ خاص اور رنگِ کائنات کے سلسلے میں پیش کی جانے والی تحریر سینئر ادباء کے ذخیرہ ادب سے منتخب کی گئی تحریریں شاندار رہیں۔ کاشی کو کتاب کی مبارک باد اور شگفتہ شفیق کو ان کی دوسری کتاب کے لیے پیشگی مبارک باد، یہ میرا کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے لکھا جانے والا پہلا تبصرہ ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔

✿ یاسر دلاور خان! پہلا تبصرہ اور اتنا مکمل، اتنا جاندار اب تو امید ہے کہ آپ کی رائے کا ہر ماہ انتظار رہے ہمیں بھی اور بہت سے ان لوگوں کو بھی جو آپ کے اندازِ تحریر کے قدردان ہیں۔ یقیناً جلد ہی آپ کا افسانہ بھی دوشیزہ کے صفحات پر نظر آئے گا کیوں ٹھیک ہے ناں!!

✉ فرح اسلم قریشی کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! سرد موسم کی مستقل مزاجی دیکھ کر، موسموں پر لگنے والے بے وفائی کے الزامات کچھ مشکوک سے ہو گئے تھے کہ اس ماہ کے رسالے کا سرورق دیکھ کر احساس ہوا کہ موسم بہار شروع ہو چکا ہے تو شک کو پھر تازہ کر لیا۔ موسم لاکھ بے وفا سہی مگر ٹھہر جائے تو برا لگتا ہے۔ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے تحریر کردہ آپ کے اداریے پر سر دھننے کے بعد اپنے اپنے منصب، مقام اور اہمیت کے پیشِ نظر دل سے تجدید عہدِ ریاضت کو ضروری سمجھا کہ عورت کی مشقت بھی عبادت ہے، الحمدللہ۔ سب سے پہلے منزہ اینڈ فیملی کو عمرے کی سعادت مبارک ہو۔ ساتھ ہی نسیم نیازی کو بھی مبارک باد پہنچے۔ محفل میں پہلا خط رضیہ مہدی کا ہے جسے شامل دیکھ کر خوشی کا احساس ہوا کہ رضیہ اب کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ فرحت صدیقی کو سلام، فرحت صاحبہ سے کہنا ہے کہ عنبر کی کہانی عنبر کی زبانی پڑھ کر ایسا درد اپنے اندر اٹھتا ہوا محسوس کیا جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک ماں ہی بیٹی کے اندر جھانک کر دکھ کا اندازہ کر سکتی ہے، اس کا احساس آپ کی تحریر پڑھ کر ہوا۔ نہ جانے کہاں کہاں لفظ دھندلائے اور آنکھیں خشک کرنا پڑیں۔ پروردگار سے دعا ہے کہ عنبر کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے کہ وہ اتنے بڑے غم کو نہ بھی بھلا سکے تو کم از کم اس کی اذیت ختم ہو جائے، آمین۔ عنبر اور اس کے بچوں کے لیے پرخلوص دعائیں۔ شمع حفیظ ڈھکوسلہ لے کر آئیں اور حسب معمول متاثر کر گئیں۔ لمحے بھر کی بات میں نظارت نصر نے بہت اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے مگر اختتام اگر تھوڑا افسانوی طرز پر ہوتا تو ذرا دل کو تسلی ہو جاتی کہ افسانہ پڑھا ہے۔ میرا کل نزہت جبیں ضیاء کی تحریر بھی بہتر لگی۔ لان کا سوٹ میں صائمہ حیدر نے ابتداء اچھی کی تھی۔ تاہم مرکزی کردار زوبیہ کی شدید خواہش دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ آسمان سے گرے یا زمین اُگلے، زوبیہ کو لان کا سوٹ مل ہی جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ بہرحال اچھی تحریر تھی۔ سب منظر خاموش میں بلال فیاض نے بڑی سبک روی سے طوفان کا رخ موڑا۔ وقت گزاری کے اوچھے طریقے اختیار کرنے والی لڑکیوں کو آئینہ دکھاتی تحریر، موضوع کے اعتبار سے اچھی تھی۔ ناولٹ اگر سمجھو محبت، ایک کہنہ مشق رائٹر کے متاثر کن جملوں سے مزین ایک غیر متاثر کن تحریر تھی۔ کیونکہ یہ موضوع اب کسی کے لیے محض نیا دکھ ہی ہو سکتا ہے پڑھنے والوں کے لیے اس میں کچھ نیا نہیں تھا۔ البتہ اس مرتبہ سلمیٰ یونس کا ناول توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ ناول نے دلچسپ رخ اختیار کیا ہے جس نے اگلی قسط کے انتظار میں مبتلا کر دیا ہے۔ اپنی نظروں کا زاویہ بدلیں۔ کیا بات ہے ایڈیسن کی، لگتا ہے اب شاعری میں بھی جھنڈے گاڑنے کے

ارادے ہیں، زبردست بھئی۔ نئے لہجے میں شہباز احمد ساحر کی شاعری متاثر کن تھی۔ شگفتہ شفیق کو اگلی کتاب کی اشاعت پر پیشگی مبارک باد، خدا کرے کامیابی کا سفر ایسے ہی رواں دواں رہے، آمین۔ آخر میں دلشاد نسیم کے شریکِ حیات کی وفات پر دلی تعزیت اور مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا۔

✍ فرح اسلم قریشی! کیسی ہو، تحریر شائع ہونے پر شکریہ کا خط بھی آئے گا ناں؟ مجھے بھی اسی طرح انتظار رہتا ہے تمہارے خط کا اچھا لگتا ہے تم سب کا آنا اور ملنا......

☒ عقیلہ حق کراچی سے لکھتی ہیں۔ خوش رہیے، آباد رہیے۔ اس ماہ کا دوشیزہ مجھے کافی تاخیر سے ملا اور کچھ طبیعت کی سستی کی وجہ سے، میں نے پڑھا بھی دیر سے۔ لہٰذا اس دفعہ تبصرہ دیر سے ہی سہی لیکن حاضرِ خدمت ہے۔ منزہ صاحبہ کو ہم ٹی وی پر دیکھا، بہت اچھا لگا۔ ان کے لفظوں کا چناؤ اور لہجے کا اعتماد بہت اچھا لگا کہ پراعتماد خواتین مجھے ہمیشہ بے پناہ متاثر کرتی ہیں اور منزہ بھی بہت اچھی لگیں اور ان کا سوٹ بھی کیونکہ ایک رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ میں ایک خاتون بھی تو ہوں۔ اب آتے ہیں دوشیزہ کی طرف زادِ راہ ہمیشہ کی طرح زادِ راہ رہا۔ اداریہ عورتوں کے عالمی دن کے حوالے سے پڑھا۔ میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں اور میں تو سمجھتی ہوں کہ ہمارے دین میں تو ہر دن عورتوں کا دن ہے، صرف غور کرنے کی دیر ہے۔ سلمیٰ یونس کا مکمل ناول پڑھا، اچھا لگا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ہاں بھائی کاشی، یاد آیا تم تو مجھے 'اور تم' بھیج رہے تھے۔ خوب انتظار کروایا؟ سکینہ فرخ صاحبہ کا ناولٹ زبردست رہا۔ فرحت صدیقی صاحبہ کا ریت کا گھر پڑھا تو طبیعت بہت رنجیدہ ہوئی۔ انہوں نے زندگی کے ایک رخ کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا۔ شمع حفیظ کا ڈھکوسلہ پڑھا اور ایک مرد کی خود غرضی پر لکھا گیا افسانہ، اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے اچھا لگا۔ نظارت نصر نے بہت اچھا لکھا کہ ہمیں اپنے دین کی بنیادی باتیں آنی چاہئیں اور واقعی موت زندگی کا کیا بھروسہ۔ پتا نہیں آج تبصرہ بھیج رہی ہوں اور کل اس کو پڑھ بھی نہ سکوں۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ نزہت جبیں ضیاء صاحبہ نے زندگی کی حقیقت کو بہت خوب صورت انداز میں لکھا، ایسا ہوتا ہے ناکہ ہم ساری زندگی جن کے لیے برباد کر دیتے ہیں، ایک وقت آتا ہے، ان کے پاس ہمارے لیے ٹائم نہیں ہوتا۔ ہم ان کے کچھ نہیں ہوتے۔ صائمہ حیدر نے بہت خوب صورت لکھا اور میرا تو اس بات پر ایمان ہے کہ آپ کو وہی ملتا ہے جو اللہ نے آپ کے نصیب میں لکھا ہے، بس اپنے اعمال سے آپ اپنا منہ سیاہ اور سرخرو کر سکتے ہیں۔ بلال فیاض نے بھی اچھا لکھا۔ واقعی رشتوں میں ایمانداری بہت ضروری ہے۔ جب شمیم لاس ویگاس جاتے ہیں تو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تمہارے میاں امریکہ آتے جاتے رہتے ہیں اور وہ بھی لاس ویگاس جیسی جگہ، تم کو ڈر نہیں لگتا۔ تو میں اطمینان سے جواب دیتی ہوں کہ میں ان کے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں کرتی تو مجھے سو فیصد امید ہے وہ بھی میرے ساتھ کوئی بھی بے ایمانی نہیں کر سکتے لیکن یہ ضروری بھی نہیں بہت سی پاکباز اور اچھی عورتوں کو برے مرد بھی مل جاتے ہیں لیکن بعض اوقات اللہ کی آزمائش بھی تو آتی ہے ناں! مرزا حامد بیگ کی جنم جوگ بہت بہت خوب صورت تحریر رہی۔ رنگِ کائنات پڑھا اور واقعی بہت ہی اچھا لگا۔ بنتِ حوا میں مسرت صاحبہ بہت معلومات سے بھرپور لکھ رہی ہیں۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دریچے دن بدن بہتر ہو رہا ہے۔ نئے لہجے اور نئی آوازیں سب کی بہترین کوشش ہے۔ کچن کارنر میں سے ریشمی گوشت میں نے سوتی کپڑے پہن کر پکایا اور اونی کپڑے پہن کر کھایا۔ خیر یہ تو مذاق رہا، ریشمی گوشت واقعی بہت لذیذ پکا۔ کارنرز بہت اچھے سج رہے ہیں۔ کاشی صاحب کی شاعری دن بدن نکھرتی جا رہی ہے۔ میری دعائیں بہت خلوص کے ساتھ کاشی اور تمام نئے لکھنے والوں کے لیے ہیں۔ شاعری بھی زبردست رہی۔ خاص کر ایڈیسن صاحب کی۔ آج جب تبصرہ لکھنے بیٹھی تو سوچا ذرا مختصر لکھوں گی لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ارے سلسلہ وار ناولز کے بارے میں ایک بات کہنی ہے ذرا کان قریب لائیے اور غور سے سنیے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ سارے ناولز ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ بہت زبردست جا رہے ہیں۔ فرزانہ صاحبہ کے ناول کا انتظار ہے۔ آپ سب کو آپ کی بے پناہ محنتوں کے عوض، میری طرف سے بہت ساری شاباش۔ آنٹی رخسانہ صاحبہ کی خدمت میں سلام، منزہ صاحبہ اور آپ کے لیے بہت ساری نیک تمنائیں۔ ناصر بھائی اور کاشی کو بھی سلام کہیے گا۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔

✍ عقیلہ حق صاحبہ! اس بار خاصا نصیحت آمیز خط لکھ دیا۔ چلو اچھی بات ہے کہ کسی کے دل میں اتر جائے کوئی بات، کاشی چوہان کی مصروفیات تھوڑی بڑھ گئی ہیں ورنہ اخلاق تو ایسا ہے کہ کتاب خود پہنچا دیتے۔ ہو سکتا ہے کہ اب ایسا ہی ہو جواب پڑھ کر کاشی چوہان مسکرا رہے ہیں اور شرمائے بھی خوب ہیں۔

☒ اختر شہاب کراچی سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! گزشتہ دنوں آفس آنا ہوا لیکن چونکہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی اور میں بھی کچھ جلدی میں تھا، بہر حال ساتھیوں کی خبر گیری ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ خدا سب کو سلامت اور تندرست رکھے، آمین۔ سنبل کی والدہ اور دلشاد نسیم کے شوہر کی وفات کی خبر نے بہت ملول کیا۔ خدا اپنے جوارِ رحمت، میں مرحومین کو اعلیٰ درجات پر فائز کرے اور اہلِ خانہ کو صبر کی توفیق دے، آمین۔

✍ اختر شہاب صاحب! آپ کا نامہ ملا۔ آپ کے پیغامات، تعزیت ان ساتھیوں کو جو اس دکھ سے گزر رہے ہیں۔ ان اذیت بھرے لمحات میں ضرور سہارا دیں گی۔ اپنا بھی خیال رکھیے گا۔

☒ صفیہ سلطانہ، جیکب آباد سے لکھتی ہیں۔

ہم بھی غالب کی طرح کوچہ جاناں سے محسن
نہ نکلتے بھی تو کسی روز نکالے جاتے

بہر حال آپ نے فون کر کے میرا خون بڑھایا، شکریہ مگر سوچیں خون بڑھنے کے بعد اگر Wait بھی بڑھ جاتا۔ ''ویٹ'' تو خیر آپ کو کرنا ہی پڑا، ہمارے خط کے لیے۔ سو ہم نے تمام گھریلو اور دفتری امور پر 'پیپر ویٹ' رکھ کر اس بار خط لکھنے کا قصد کر لیا۔

کبھی قسمیں کبھی عہدِ وفا کا حوصلہ دے کر
ہمیں خط لکھنے کے بہانے بھیج دیتا ہے

تو جناب یہ بہانہ بھی کیا خوب بہانہ ہے خدا کرے کہ اسے گردشِ دوراں بہانہ لے جائے، آمین۔ سیر دست اتنا ہی! اور اجازت دو، وقت کم اور مقابلہ سخت۔ پرچہ ابھی مکمل نہیں پڑھ سکی ہوں جن پر تبصرہ کروں گی۔ ان کہانیوں پر مجھ سے بہتر اور دیدہ ور لوگ کریں گے ادھر تو یہ حال ہے

آسمان پر دیدہ
ہاتھ میں کشیدہ

بھلا بتاؤ، ایسے میں کیا بات بنے گی۔ دلشاد نسیم کے سانحے پر جو اُن کے ساتھ پیش آیا بے حد دکھ ہے۔ سنبل تمہارا سیل نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ ماں ایک چھتنار شجر..... جس کی چھاؤں سے تم محروم ہوگئی ہو۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ پرچہ بہت لیٹ ملا ہے۔ ہم تو مایوس ہو کر لیٹ ہی گئے تھے۔

✍ صفیہ آپ کا خط ملا، جمہوریت کے دور میں سب کو حق حاصل ہے لیکن خیال رہے کہ سقراط آج کے دور میں ہوتا تو ایک بار پھر سے خودکشی کرتا۔

✉ صوفیہ خان، کراچی سے لکھتی ہیں، ہمیشہ کی طرح دوشیزہ پوری آب و تاب کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھ کر اپنے خاتون ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ اپنی ڈائری سے باتیں پڑھ کر سہام صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور منزہ صاحبہ جیسی بیٹی کی اپنے والد سے والہانہ محبت اور لگاؤ.....! اللہ تعالیٰ اس جذبہ اور کاوش کو ہمیشہ قائم رکھے۔ منورہ نوری صاحبہ کا اسراف اور سخاوت پر مضمون سبق آموز اور موجودہ حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ڈرامہ سیریل ہم سفر کے فنکاروں سے ملاقات کافی دلچسپ رہی۔ یہ ہوئی نا بات میں، زین العابدین کے جوابات پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔ چور دروازے کی پہلی قسط فکر انگیز ہے۔ ناولٹ 'اگر سمجھو محبت کو' سبق آموز ہے۔ رنگ فسانہ کے تمام رنگ حسین ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مجھے فرحت صدیقی کا 'ریت کا گھر' بہت اچھا لگا۔ مرزا حامد بیگ کا 'جنم جوگ' بھی بہت اچھا ہے۔ قربانی دینے کی انتہا، صبر و سکون کی انتہا، کاش ہم میں بھی یہ جذبات پیدا ہو جائیں۔ نفسیاتی کالم، خوشی کی تلاش جو آج کے دور میں ناپید ہے۔ سبق حاصل کرنے کے لیے مثبت اندازِ فکر ہے۔ منزہ صاحبہ، رخسانہ صاحبہ اور ان کے بیٹے کو عمرے کی مبارک باد۔ منزہ سہام کو روزنامہ فلک ٹائمز نکالنے پر بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کا دامن اسی طرح خوشیوں سے بھرتا رہے، آمین۔

✍ رخسانہ سہام مرزا، منزہ سہام فلک ٹائمز کے اجراء کی مبارک باد ملنے پر آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ آپ کا تبصرہ، آپ کی اپنائیت، ہمارا مان بڑھا دیتی ہے۔ خدا آپ کو صحت و سکون عطا کرے، آمین۔

یہ تو تھے آپ کے خطوط، تبصرے، شکایتیں، محبتیں، بس چلتے چلتے آپ سب سے یہ کہنا ہے جو میں نے پڑھا، سمجھا اور جانا کہ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا۔ "اپنے عمل کو لوگوں کی موافق و ناموافق باتوں پر ترک نہیں کرنا چاہیے۔"

اجازت اس دُعا کے ساتھ کہ ہم بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ بن جائیں اور پھر زنجیر بن جائیں محبت کی..... فتح کی..... نصرت کی.....!!

آپ کی اپنی دوست، ساتھی
غزالہ رشید

روزنامہ فلک ٹائمز کے اجراء کے موقع پر دیے گئے ظہرانے کی تصویری جھلکیاں......!!

جاوید مہر شمسی، یوسف ایڈووکیٹ، الیاس شاکر، قدسیہ قادری، منزہ سہام، زرتاج علی، رخسانہ سہام، علی رضوی، ریاض منصوری، دوست محمد فیضی اور مختار عاقل کا گروپ فوٹو

شرکاء ظہرانے کے دوران

قدسیہ قادری اور منزہ سہام محوِ گفتگو

ظہرانے کے بعد شرکاء خوشگوار موڈ میں

فہد مصطفیٰ

کچھ کہی، کچھ اَن کہی.....!

ردا ناصر

صلاح الدین تونیو نے پی ٹی وی پر سندھی اور اردو ڈراموں میں بے مثال اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ گزری کل' ستر کی دہائی میں بھی اعلیٰ درجے کے اداکار تھے اور آج 2012ء میں بھی اپنی ڈرامہ سیریلز ''صبح کا ستارہ'' (جیو) اور ''کلیاں میرے آنگن کی'' (ایکسپریس) کے ذریعے سے یہ بات منوا چکے ہیں کہ ماضی ہو یا حال' اُن کے فن کا سفر بلندی کی جانب ہی جاری وساری رہا ہے۔

یہ ذکر ہے ماہ وسال کا جب پی ٹی وی کے معروف فنکار صلاح الدین تونیو نے اپنے بیٹے خالد تونیو کے بارے میں میرے بابا سے کہا تھا کہ یہ مستقبل میں اداکاری کے حوالے سے بہت نام کرے گا۔

اور پھر خالد نے واقعی کچھ سندھی اور اردو ڈراموں میں خاصی اچھی اداکاری کی' لیکن جو نام اور مقام صلاح الدین کے بیٹے' فہد تونیو عرف فہد مصطفیٰ نے شوبز کی دنیا میں بنایا۔ اس کے بارے میں تو شاید نہیں بلکہ یقیناً کبھی صلاح الدین تونیو نے سوچا بھی نہ ہوگا اور حیرت وکمال کی بات تو یہ ہے کہ فہد نے شوبز سے رشتہ جوڑنے کے لیے اپنے نامور اداکار والدِ گرامی کا کوئی سہارا اور سفارش بھی نہیں لی تھی۔ اس حوالے سے فہد کہتے ہیں۔

''میں نے والد صاحب سے کبھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی البتہ ڈراموں میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کچھ پروڈیوسرز سے کیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ ان دنوں کالج میں پڑھ رہا تھا کہ ایک دن اقبال انصاری صاحب کی کال آئی کہ آڈیشن کے لیے آ جاؤ۔ میں کسی کو بتائے بغیر ٹی وی اسٹیشن چلا گیا اور آڈیشن دے آیا اور کامیاب بھی ہوگیا۔ آڈیشن بھی اقبال انصاری صاحب جیسے thorough professional نے لیا۔ اگر کسی اور نے لیا ہوتا تو کہہ بھی سکتے تھے کہ مروّت میں کامیاب کیا ہوگا مگر اقبال انصاری صاحب تو اپنے اصولوں کے پابند ہیں' بس تو پھر کامیابی کے بعد میرا پہلا ڈرامہ ''راج ہنس'' تھا۔ اس میں میری پرفارمنس کو بہت پسند کیا گیا لیکن والد صاحب ناراض ہوئے تمہیں جلدی کیا تھی اس فیلڈ میں آنے کی؟ پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لیتے۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ یہ میرا شوق ہے' مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے اجازت نہیں دیں گے' میں اس لیے اپنے ٹیلنٹ سے آیا ہوں' بس آپ مجھے سال ڈیڑھ سال کا وقت دیں۔ اگر میں اس مدت میں کامیاب ہوگیا تو اس فیلڈ کو جاری رکھوں گا ورنہ آپ جیسے کہیں گے ویسے ہی کروں گا۔''

یوں کامیابی نے فہد کے ایسے قدم چومے کہ اب صلاح الدین' اپنے اس بیٹے کی صلاحیتوں پر فخر کرتے ہیں۔ فہد کے علاوہ ان کے دو بھائی خالد اور طارق تینوں بھی اس فیلڈ میں آئے' لیکن تھوڑے عرصے کے بعد خالد تو پروڈکشن سائیڈ پہ مصروف ہو گئے اور طارق پڑھائی کے لیے آسٹریلیا چلے گئے۔ ان کی ایک ہی بہن ہے جو شادی شدہ ہے اور ملک سے باہر ہے۔

فہد کا اداکاری کے حوالے سے دوسرا پروجیکٹ ''شیشے کا محل'' ایک کامیاب سوپ تھا' جس میں فہد کو اپنی اچھی کارکردگی کے باعث بہت شہرت ملی اور پھر اس کے بعد تو ایسے ڈراموں کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ ہے' جن میں فہد کی اداکاری اپنے کمال پر ہے۔ آشتی' طائرِ لاہوتی' وینا' تھوڑی دور ساتھ چلو' ناجیہ' ملکہ' یہ زندگی ہے' تم جو ملے' لاحاصل' وجودِ اریب' کروٹیں' اَن داتا' حالِ دل' مستانہ ماہی وغیرہ اس کی کچھ بہترین مثالیں ہیں۔

فہد مصطفیٰ نے 26 جون 1983ء کو کراچی میں جنم لیا' اس حساب سے اُن کا اسٹار cancer ہے اور اس اسٹار کے حامل افراد والی تمام خوبیاں اور خامیاں اُن کی ذات میں موجود ہیں۔ چار بہن بھائیوں (ایک بہن' تین بھائی) میں فہد کا نمبر تیسرا ہے۔ فہد dentist بننا چاہتے تھے' اور پھر جب داخلہ نہ ملا تو بی فارمیسی کا ارادہ کر لیا تھا' لیکن اداکاری والے کیریئر نے اس معاملے کو ادھورا ہی چھوڑ دیا

فہد مصطفیٰ کے والد صلاح الدین تونیو

کیونکہ وہ صرف اوروں کے ڈراموں میں ہی اداکاری نہیں کر رہے' اُن کا خود اپنا بھی پروڈکشن ہاؤس ہے' اس پروڈکشن ہاؤس میں ہی نہیں' گھر اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی فہد کی شریکِ حیات مکمل طور پر شریک ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ اب فہد کی نئی مصروفیات میں ''ہم ٹی وی'' کا ''مارننگ شو'' اور فلم کی پلاننگ بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس حوالے سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب میں وہ کہتے ہیں۔

''ہم ٹی وی'' کے لیے مارننگ شو میرے لیے ایک نہایت ہی اچھا فیصلہ اور تجربہ ثابت ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں' سلطانہ آپا کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس معاملے میں convince کیا۔ اس مارننگ شو کے ذریعے مجھے نا صرف زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی نامور علمی' سماجی اور ثقافتی شخصیات سے ملنے کا موقع مل رہا ہے' جو میرے علم اور مشاہدے میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے سے جُڑے لوگوں کے بے شمار ایسے مسائل اور معاملات

سامنے آئے ہیں جن سے میں لاعلم تھا۔ میں اپنے تئیں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اس مارننگ شو کے ذریعے معاشرے کی بہتری میں اپنا کردار خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو ادا کرسکوں اور بہتری کا باعث بنوں۔"

☆......"اور وہ فلم سے دلچسپی والا معاملہ؟"

•......"ہر اداکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ سلور اسکرین پر بھی کام کرے، لیکن میری خواہش پہلے یہ ہے کہ پاکستان میں سنیما کا revival ہو اور یہاں بھی اچھی فلمیں بنیں۔ شعیب منصور صاحب کی "خدا کے لیے" کے بعد اب "بول" کی فقیدالمثال کامیابی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ فلم کے حوالے سے پاکستان میں ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں ہے، اور یہ بات بھی بہت خوش آیند ہے کہ اب ہمارے معروف اور کامیاب ڈرامہ پروڈکشن ہاؤس، بھی فلم کی جانب آرہے ہیں۔ ایسے کسی بھی پراجیکٹ میں کام کرنا میری اولین ترجیح ہوگی۔"

☆......"اپنے ملک خصوصاً اپنے شہر کے موجودہ حالات آپ کے لیے پریشانی اور فکر کا باعث بنتے ہیں؟"

•......"کیوں نہیں بنیں گے۔ ہم فنکار بھی تو اسی معاشرے کا حصہ ہیں اور فنکار تو ویسے بھی بہت حساس ہوتا ہے۔ میں بھی ان حالات کے باعث بہت پریشان ہوتا ہوں، کبھی کبھی شدید ڈپریشن بھی ہوتا ہے، اور میرے ساتھ تو معاملہ یہ ہے کہ میں خود سے زیادہ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں کہ...... ان کا کیا ہوگا؟ اس سوال کے بعد درپیش پریشانی اور بے چینی میں قرار صرف یہ سوچ کر آتا ہے کہ میرا اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ ہمارے لیے ہماری اولادوں کے حق میں سب بہتر کرے گا۔"

☆......"اور کوئی خاص بات؟"

•......"آپ اسے خاص سمجھیں یا عام بات، بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی کا احترام کریں، خود بھی جئیں اور دوسروں کے لیے بھی زندگی کا باعث بنیں۔"☆

ہم ٹی وی کے مارننگ شو کی صبح، غزالہ جاوید کے ساتھ

اُن کا قاصد لے چلا ہے دل مرا
تازہ فرمائش، نئی سوغات ہے

قارئین، مصنفین کے لیے ایک نیا سلسلہ
جو نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں......

یادکے پچھلے پہر

آپ کی پسندیدہ قلم کار......!

فرزانہ آغا کی تحریر، سلسلے وار ناول کی صورت میں

بہت جلد......آپ کے پسندیدہ ماہنامہ دوشیزہ کے صفحات پر......!

ARY کے نئے ڈرامے

م۔ش۔خ

ARY ڈیجیٹل نے اس دفعہ میدان آخر مار ہی لیا اور اس کے خوب صورت ڈرامہ سیریل میری لاڈلی، ٹوپی ڈرامہ، دیسی کڑیاں، گڈ مارننگ پاکستان اور باخبر سویرا...... نے ناظرین کے دلوں پر حکمرانی کا راج قائم کر ہی لیا۔

آیئے، اب چلتے ہیں پروگراموں کی جانب کہ آپ سب ناظرین سے باتیں بھی ہو گئیں۔ اب جلد ہی خوب صورت سیریل ''لاڈلی'' میں مرکزی کردار ادا کرنے والی عارفہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ عارفہ، ساجد سے پسند کی شادی کر لیتی ہے، جس کی وجہ سے عارفہ کے والدین کو اس شادی پر اعتراض تھا اور اس شادی کی وجہ سے عارفہ کے والد ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر دنیا سے چلے جاتے ہیں مگر اولاد کو نصیحت کر جاتے ہیں کہ وہ عارفہ سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لیں۔ عارفہ اپنے والدین کو ناخوش کر کے خود بھی خوشیوں سے دور رہتی ہے۔ سیریل کو تحریر کیا ہے ماہا ملک نے جب کہ ہدایات ندیم صدیقی کی ہیں۔ سیریل کے فنکاروں میں ماریہ واسطی، بجل علی، عروہ، احسن خان، سمیع خان قابل ذکر ہیں۔ یہ خوب صورت سیریل، ہر ہفتے کی رات آٹھ بجے دکھائی جا رہی ہے۔

ARY Digital کی نئی سیریل ''ٹوپی ڈرامہ'' میں فیصل قریشی کا نیا انداز......!

ڈرامہ سیریل ''ٹوپی ڈرامہ'' کو تحریر کیا ہے عمران نذیر نے، جب کہ ہدایت محمد افتخار کی ہیں۔ سیریل کے مرکزی کردار، فیصل قریشی اور اعجاز اسلم کر رہے ہیں۔ دونوں اس سیریل میں فراڈیے کا کردار ادا کر رہے ہیں جو اپنی مثال آپ ہو گا۔ یہ ڈرامہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8:35 پر دکھائی جا رہی ہے۔

مقبول سیریل 'شادی مبارک' ہر اتوار کی رات 9 بجے دکھائی جا رہی ہے۔ مزاحیہ پروگرام 'کامیڈی کنگ' ہر جمعہ کی

ARY Digital کے پروگرام ''دیسی گویوں'' میں ایشیائی گولڈ میڈلسٹ نسیم حمید

رات 9 بجے دیکھا جا رہا ہے۔ خوب صورت سوپ ''میری بہن میری دیورانی'' جسے تحریر کیا ہے محمد آصف نے، جب کہ ہدایت کار عامر خٹک ہیں۔ سوپ دو دوستوں کے بچوں کی کہانی ہے، جو وٹے سٹے کی شادیاں کرتے ہیں۔ اس سوپ، میں مختلف فنکار، مختلف کردار ادا کر رہے ہیں جب کہ مرکزی کردار فلم اسٹار اور ہدایت کارہ سنگیتا، شہریار زیدی، نعمان مسعود، قوی خان، سیمی پاشا، بدر خلیل، بنیش چوہان، مدیحہ افتخار کر رہے ہیں۔ یہ خوب صورت سوپ، پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ 7:30 بجے دکھایا جائے گا۔

معروف پروگرام ''دیسی کڑیاں'' جس میں ماڈرن لڑکیاں گاؤں کے ماحول کے حوالے سے کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس پروگرام میں وقار ذکا، کی پرفارمنس اور ساؤتھ ایشیا میں، پاکستان کی نمائندگی کرنے والی گولڈ میڈلسٹ نسیم حمید نے خوب صورت کردار ادا کر کے، ناظرین ٹی وی کے دل جیت لیے ہیں۔ ناظرین کی بڑی تعداد وقار ذکا اور نسیم حمید کی پرفارمنس کو سراہتے ہیں۔ پروگرام دیسی کڑیاں'' پیر سے لے کر جمعرات تک رات 10:15 پر دکھلایا جا رہا ہے۔ یہ تمام سیریل اور خوب صورت سوپ ARY ڈیجیٹل سے آن ایئر ہوں گے۔

کیو ٹی وی سے لائیو پروگرام ''روشنی'' کو نادر شاہ کر رہے ہیں، جب کہ اس پروگرام کے میزبان، شاہد مسرور کو ناظرین کیو ٹی وی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ شاہد مسرور اس سے قبل کیو ٹی وی کے کئی پروگراموں کو بحیثیت میزبان، خوب صورتی سے کر چکے ہیں اور ARY ڈیجیٹل نیوز کے پروگرام ''باخبر سویرا'' کو اب مایا خان کر رہی ہیں۔ یہ پروگرام ARY NEWS صبح 9 بجے سے لے کر 11 بجے تک پیر سے جمعہ تک لائیو پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں سماجی مسائل پر تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے۔ ذوق چینل سے پروگرام ''ڈریم ڈیزرٹز'' روایتی اور جدید سویٹ ڈش ہر بدھ کو 4:30 بجے طاہرہ متین پیش کریں گی۔

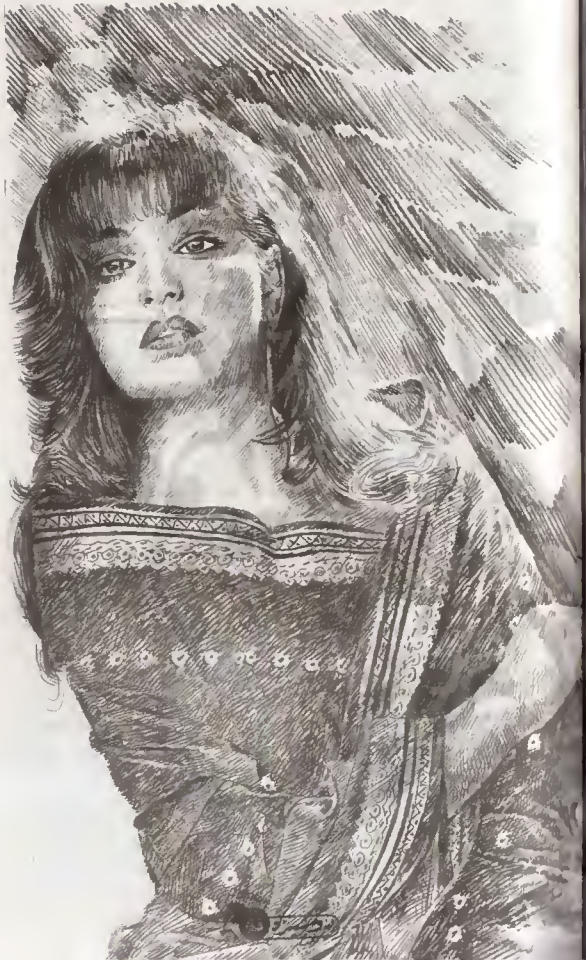

سلسلۂ خاص

زمر نعیم

تم میرے ساتھ رہو

سماجی مسائل اور معاشرتی رویوں سے کشید کیے گئے، سلسلہ وار ناول کی گیارہویں قسط

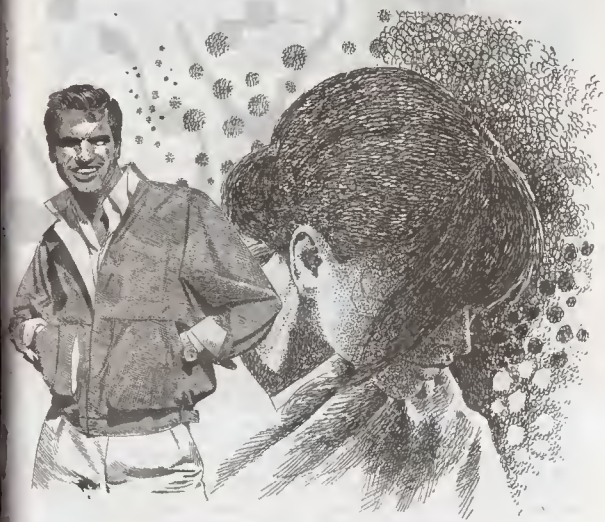

"انصاری ہاؤس" میں ظہیر اکبر زریں بیگم کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے دو بیٹے حماد اور عباد ہیں۔ عباد کی بیوی منزل ہے، جو گھر کے کام کاج میں گھن چکر بنی رہتی ہے۔ پھر بھی ساس سے باتیں سنتی ہے جب کہ حماد کے دو بچے ہیں اور بیوی شمسہ بھی گھر میں اپنی ساس کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ ظہیر اکبر کی دوسری بیوی ان حالات میں ان کی زندگی میں آئیں کہ وہ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان سے ان کا ایک بیٹا اسود علی ہے۔ سارا کاروبار، گھربار، جائیداد اسود علی کے نام ہے اور وہ زریں بیگم کے عتاب میں زندگی گزار کر ایک فیصلے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے جس کے نتیجے میں زریں بیگم کی بھتیجی نائیلہ اس کی بیوی بن چکی ہے۔ علیشہ نجف ایک مشہور فوٹوگرافر ہے۔ وہ اسود علی کی نگاہ میں آگئی اور اسود اس پر دل ہار بیٹھا۔ علیشہ نجف ایک مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی۔ اس کے ماں باپ بیرون ملک مقیم ہیں۔ اسے اپنے پروفیشن سے عشق ہے۔ وہ محبت، عشق جیسی خرافات پر یقین نہیں رکھتی۔ اسود علی روایتی عاشقوں کی طرح ہر جگہ اپنا دل لیے اس کے آگے گزار رہتا ہے۔ علیشہ اس کے اس سڑک چھاپ اسٹائل سے زچ ہے اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ زرغام بخاری، اسود اور علیشہ کا دوست ہے۔ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا سربراہ ہے۔ وہ اور اس کی بیوی نادیہ کو اولاد کی صورت خدا نے آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ زرغام اور نادیہ دونوں ہی بہت فکرمند ہیں۔ ان کے جڑواں بچے سمک اور فلک ہیں اور دونوں ہی انتہائی کمزور اور ایک حد تک ابنارمل ہیں۔ نادیہ ان کی زندگی کے تار جوڑنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ بچوں کی نگہداشت کے لیے سوزین نامی ایک فل ٹائم Maid موجود ہے۔ گھر کی ماسی نے سمک اور فلک کی پریشانی بھانپ کر پیر شاہ کے ڈیرے تک نادیہ کو پہنچا دیا ہے۔ اب نادیہ پیر شاہ صاحب کی مریدگی میں آچکی ہے۔ کہانی کا ایک کردار تابندہ بھی ہے۔ تابندہ غربت کی چکی میں پسنے والے ایک گھر کی کفیل ہے۔ زرغام بخاری کی پرسنل سیکریٹری کے فرائض انجام دینے والی تابندہ ایک بہن اور بھائی کی خواہشات اور ضروریات کے تحت اپنی زندگی کو ان کے لیے وقف کر چکی ہے۔ زرغام بخاری اور تابندہ کے درمیان ایک غمگسار والا رشتہ بھی موجود ہے۔ تابندہ اپنے باس کا بہت خیال رکھتی ہے جب کہ زرغام بھی تابندہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اسود علی اور علیشہ کا ٹکراؤ تو اکثر ہوتا رہتا ہے جو ہمیشہ علیشہ کے لیے ناخوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ دوسری طرف زرغام بخاری کے گھر میں نادیہ نے پیر شاہ کے تعویذوں اور تبرکات وغیرہ سے اپنے آپ کو کسی ان دیکھی زنجیر میں قید کر لیا ہے۔ ماسی اپنی مالکن کا پیسہ پیر شاہ کے ڈیرے پر دل کھول کر لٹوا رہی ہے۔ زرغام بخاری کا دل بیوی کی ان حرکتوں سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ اس نے آفس میں موجود سیکریٹری تابندہ کی توجہ پا کر اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ تابندہ کو بھی حالات کے پیش نظر ایسے ہی کسی سہارے کی تلاش تھی۔ انصاری ہاؤس میں نائلہ کی ہٹ دھرمیاں جاری ہیں۔ زریں بیگم ہر طرح سے اسود علی اور نائلہ کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے نائلہ کے کھونٹے کو مضبوط کرنے کی تگ و دو میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف تابندہ کا باپ اپنے بڑے بھائی سے ملنے لگا ہے۔ اس کی ماں، حمیدہ کو خدشات نے آگھیرا ہے۔ یہ ملاپ انہیں خطرے کی گھنٹی کا احساس دلا رہا ہے۔ زرغام بخاری کو نادیہ، اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر نفسیاتی ڈاکٹر فرقان حمیدی کے پاس لے جاتی ہے۔ زرغام کی بزنس پر بے توجہی اب آفس والے بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ علیشہ بھی زرغام کی اس کیفیت پر پریشان ہے۔ نادیہ کا شاہ پیر پر یقین پختہ ہو رہا ہے اور وہ اس کے گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ علیشہ کا اسود علی سے ہنوز ٹکراؤ جاری ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسود علی کے لیے قطعاً سنجیدہ نہیں ہو پا رہی۔ تابندہ نے گھر کی موجودہ صورت حال پر زبان کھولی تو باپ رشید علی کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے زبردستی تابندہ اور روا کا نکاح پڑھوانے کی دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔ زرغام بخاری اور نادیہ کے درمیان رشتوں کی خلیج حائل ہونے لگی ہے۔ سوزین، نادیہ کی بچوں پر عدم توجہی کی بابت پریشان ہے اور پھر وہ بچوں کی وجہ سے پریشان ہو کر ڈاکٹر شائلہ باقر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ علیشہ پریشان ہے کہ آخر اسود علی کی اس میں دلچسپی کیوں جنون کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ایک شادی شدہ آدمی سے اس طرح کی وابستگی اس کے لیے سوہانِ روح بن چکی ہے۔ زرغام شدید ذہنی اذیت سے دوچار ہے۔ نادیہ کسی صورت شاہ پیر کے چنگل سے نکلنے پر آمادہ نہیں۔ اُدھر حمیدہ اور رشید احمد میں ٹھن گئی ہے۔ حمیدہ بچیوں کے مستقبل کے لیے کسی سمجھوتے پر تیار نہیں۔ یہ صورت حال تابندہ کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ اس نے زرغام سے ملنے کا فیصلہ کیا اور...... تابندہ، زرغام سے اپنی پریشانی کہنے آئی تھی مگر اس کے اپنے مسائل نے اُسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔ نادیہ پوری شدت سے پیر شاہ کے چنگل میں پھنس چکی ہے۔ زریں بیگم کو اسود علی کے فارن ٹور کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اس بار وہ اپنا داؤ چلنے میں کامیاب ہو گئیں اور نائیلہ کو اس کے ساتھ بھیجنے پر راضی کر لیا۔ پیر شاہ نادیہ کی اینکسی میں مصروف تھے۔ نادیہ کی آنکھ کھل گئی اور ڈر کے مارے وہ بے ہوش ہو گئی۔ زرغام کے لیے یہ صورت حال بالکل اچانک تھی۔ علیشہ بھی مجبوراً فارن ٹور پر اسود کے گروپ میں شامل ہے۔ تابندہ کے تایا اپنے بیٹوں کا رشتہ لے کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ **اب آپ آگے پڑھیے:**

نادیہ جو پہلے سے بہتر نظر آرہی تھی۔ زرغام کے سوال پر پھر سے سہم سی گئی۔ زرغام کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اسے نرمی سے بولنے پر اکسانے لگا۔

"نادیہ تم اپنی پرابلم مجھ سے شیئر نہیں کرو گی تو پھر کس سے کرو گی۔ تمہیں کوئی پریشانی ہے تو کم از کم مجھے تو بتاؤ۔ کسی خواب سے پریشان ہو کر بچوں کو دیکھنے جا رہی تھیں یا پھر......" زرغام نرمی سے اپنے اندازے لگاتا اسے بولنے کا حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کی نرمی پر وہ بہت افسردگی سے ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی۔ جیسے اسے بولنے کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

"وہ خواب نہیں تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی تھی وہ آواز۔ کوئی بار بار دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں ادھر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ میں ڈر گئی تھی۔ زرغام میں سچ مچ ڈر گئی تھی۔ اچانک دروازے کے بعد کھڑکی بجنے لگی۔ کوئی ہے زرغام، ہمارے پیچھے کوئی ہے۔ پیر شاہ ٹھیک کہتے ہیں ہمارے گھر پر کئی بلاؤں کا سایہ ہے۔ وہ سایہ ہمیں تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ سب کچھ ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"What Rubbish؟ یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو تم؟ اسی لیے میں تمہیں منع کر رہا تھا کہ......" زرغام کے لہجے کی نرمی یکدم ہی برہمی میں بدل گئی۔ وہ جو اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا، اس کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ پیر...... فقیر...... سب ڈھونگی ہیں آج کل، اتنے سالوں سے تم نے یہاں کچھ محسوس نہیں کیا اور اب اچانک......" زرغام بولتا بولتا صوفے پر جا بیٹھا۔

"پیر شاہ کے بارے میں ایسے الفاظ مت کہو۔ وہ ناراض ہو گئے تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ تمہیں نہیں پتا زرغام، وہ ہمارے گھر کی سلامتی کے لیے چلّے کاٹ رہے ہیں اور......" نادیہ جو پہلے ہی وحشت زدہ تھی۔ زرغام کی باتوں پر لرز اٹھی۔

پیر شاہ کے خلاف کچھ سننا اسے گوارا نہیں رہا تھا۔ جو راحت، جو تسکین اسے پیر شاہ کی باتوں سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ راحت، وہ تسکین وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"نادیہ ہوش کے ناخن لو۔ تمہارا یہ اندھا اعتقاد، تمہیں کسی دن لے ڈوبے گا۔ میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ میرے گھر میں ایسا کوئی تماشا نہیں چلے گا۔ بند کرو یہ تعویذ دھاگے...... یہ چلّے وِلّے۔" زرغام کی برہمی مزید بڑھ گئی۔ عجیب سی جھنجلاہٹ یکدم اس کے رویے میں سرائیت ہوئی تھی۔ وہ اسی جھنجلاہٹ میں بولنے لگا۔ "اللہ سے مدد مانگو۔ اس سے دعا کرو۔ اپنی غرض کے لیے اپنے ہی جیسے انسان کے آگے گڑگڑانا، اس سے خوف رکھنا، ایمان کی کمزوری کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"اللہ نے ہی تو انسان کو انسان کا سہارا اور وسیلہ بنایا ہے نا۔ اللہ چاہتا ہے تو کوئی ہم جیسے اندھوں کی رہنمائی کرتا ہے ورنہ......" نادیہ کے اندر سے کوئی بول رہا تھا۔ یہ اس کا وہ اعتماد تھا جو اسے پیر شاہ کی ذات سے حاصل ہوا تھا۔

"نادی تم نہ جانے کس Logic کو Follow کر رہی ہو۔ تم سے بحث کرنا ہی فضول ہے۔" زرغام نے زچ ہو کر کہا اور پھر کمرے سے ہی نکل گیا۔

نادیہ اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ ذہن میں مسلسل یہ بات تھی کہ پیر شاہ کو کس طرح آگاہ کرے کہ اس وقت، اس پر کیا بیت رہی ہے۔

☆......☆

''کیا تم واقعی نائلہ کو اپنے ساتھ سنگاپور لے جا رہے ہو؟'' اسود کے ساتھ اس کے آفس جاتے عباد نے کافی دیر سے دبی حیرت کو ظاہر کیا۔ ڈائننگ روم میں زرین بیگم نے جب اسے نائلہ کا پاسپورٹ دیتے ہوئے سب ہی پر ظاہر کیا تھا کہ نائلہ اس بزنس ٹرپ میں اس کے ساتھ جا رہی ہے۔ اس وقت سے سب ہی حیران تھے۔ حیرت کی اصل وجہ اسود کی خاموشی تھی، جس نے بنا ردِعمل کے پاسپورٹ لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ سنبل، شمسہ حتیٰ کہ حماد بھی کتنی دیر تک اس کے ردِعمل کے انتظار میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ زرین بیگم کے خوف سے بولا کوئی نہیں تھا۔

''ظاہر ہے لے جانے پر مجبور ہوں۔ ورنہ آپ تو جانتے ہیں عباد بھائی مما کی نیچر۔ میرا جانا دشوار کر دیں گی۔''

اسود نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہم سب ہی جانتے ہیں، وہ تمہارا بزنس ٹرپ برباد کر دے گی۔ ویسے بھی کل تمہیں جانا ہے تم اتنی جلدی اس کا ویزہ کیسے لگواؤ گے۔'' عباد نے فکرمندی سے پوچھتے ہوئے اس کی جانب رخ موڑا۔

''آپ نے سنا تو تھا، مام کہہ رہی تھیں۔ پیسے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔'' انہیں معلوم ہے میرا Multiple viza ہے۔ میں اس بار آپ کو اپنے ساتھ اس ٹرپ پر لے جانا چاہ رہا تھا۔ آج آپ کو بتانے والا تھا مگر مام۔'' اسود نے گاڑی چلاتے چلاتے مجبوری سے بتایا۔ عباد حیرت سے اس کے آدھے رخ کو دیکھنے لگا۔ مختلف ملکوں میں گھومنا پھرنا تو وہ بھی چاہتا تھا مگر فیکٹری نے اسے وہاں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''Well next visit کے لیے آپ تیار رہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں انگلینڈ میں بھی بزنس Establish کر رہا ہوں۔ آپ وہاں میرے ساتھ جا کر مارکیٹ وغیرہ دیکھ لیں۔'' اسود نے اپنے ارادے بتا کر کر عباد کے شوق کو ہوا دی۔

وہ بھی اس لگی بندھی روٹین سے تنگ آیا ہوا تھا۔ خصوصاً زرین بیگم کے رویے سے جو کہ سنبل کے ساتھ بیگانہ اور غیریت بھرا تھا۔

''تم فیصلہ کر تو رہے ہو اسود مگر مما عمل کرنے نہیں دیں گی۔ دیکھ لو انہوں نے آخر تم سے اپنی بات منوا ہی لی۔ اب بھی وہ میرے بجائے حماد بھائی کو بھجوانے کی ضد کریں گی۔'' عباد کے خدشے زبان پر آ گئے۔

اسود نے گاڑی چلاتے چلاتے ایک نظر اپنے بھائی کو دیکھا پھر اسے تسلی دینے لگا۔ ''حماد بھائی کی آمرانہ طبیعت کو یہیں کے موسم راس آتے ہیں۔ وہ اگر ذرا سی نرمی سے کام لیتے تو آج بہت آگے ہوتے۔ نائلہ کے معاملے میں وہ اپنی ضد مجھ سے منوا سکتی ہیں مگر بزنس کو ضد پر قربان کرنے کی حماقت میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ آپ کو اس حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اسود نے سنجیدگی سے بات ختم کی اور گاڑی آفس کے پارکنگ ایریا میں داخل کر دی۔

عباد نے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ دونوں ہی بزنس کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے آفس بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔

☆......☆

تابندہ اپنی پریشان سوچوں کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ زرغام کی اچانک آمد نے اسے چونکاتے ہوئے حیران کر دیا۔ زرغام کا حلیہ، اس کی وحشت اور غصہ اس کی رفتار سے ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جس تیزی اور بیگانگی سے اس کے پاس سے گزر کر گیا تھا وہ ان کے درمیان پیدا ہوئے موجودہ تعلق کی نفی کر رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی بے حد حیرت سے گلاس وال کے اس پار اپنی سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے لیے وہ اپنا آپ داؤ پر لگانے کو تیار بیٹھی تھی۔ صرف اس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ ذہن کی الجھنوں میں ایک نئی الجھن پھر سے شامل ہو گئی تھی کہ کہیں یہ شخص اس کے ساتھ کوئی وقتی کھیل تو نہیں کھیل جائے گا۔ اسے بیچ منجدھار میں تو نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ انہی سوچوں کے ساتھ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ خود کس قدر پریشان ہے۔ انٹرکام کی بیل نے اسے چونکاتے ہوئے متوجہ کیا۔

''تابندہ میرے لیے ناشتے کا آرڈر دے کر اندر آؤ۔'' تابندہ فوراً مستعد ہو کر اپنا فرض نبھاتی، اس کے حکم پر اندر کو لپکی۔

زرغام بخاری کی پریشان حالی اس کے حلیے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ عام سے گھریلو لباس میں ملبوس تھا۔ (نیلی ٹی شرٹ اور کالے ٹراؤزر میں)۔

''سر! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔'' تابندہ کی بے ساختگی میں بھی جھجک سی تھی۔

''Yes I am all right۔ (جی میں ٹھیک ہوں) بیٹھو تم۔''

''زرغام بخاری نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے اسے مطمئن کیا۔

''آج کا شیڈول کیا ہے۔ اگر کوئی میٹنگ ہے تو پلیز کینسل کر دو۔'' تابندہ نے ایک بار پھر اسے حیران ہو کر دیکھا۔

اس کی جاب کے دوران یہ دوسرا موقع تھا جب زرغام بخاری اپنے کام اور کاروبار کے لیے اس طرح بغیر وجہ کے کوئی فیصلہ کر رہا تھا۔

''مگر سر آج تو......'' تابندہ نے کچھ کہنا چاہا تو زرغام نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

''جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ میں آج کسی سے بھی ملنے کے لیے Mentally Prepare نہیں ہوں۔''

تابندہ نے پہلے اسے دیکھا پھر سر جھکا کر تابعداری سے بولی۔ ''ٹھیک ہے سر۔ میں ابھی میٹنگز کینسل کر دیتی ہوں۔'' وہ جو سامنے بیٹھ چکی تھی پھر سے اٹھنے لگی تو زرغام نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکا۔

''ابھی بیٹھو تم مجھے تم سے ایک بات شیئر کرنی ہے۔''

تابندہ نے زرغام کی جرأت و جسارت پر اسے پہلے حیرت سے دیکھا پھر کچھ سنجیدگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے لگی۔ ''سر پلیز یہ آفس ہے لوگوں کی نظریں صرف مجھ پر اٹھتی ہیں اور مجھ ہی سے سوال کرتی ہیں۔''

زرغام کو بھی جیسے اپنی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ تو بے دھیانی میں تھا۔ نادیہ کی باتیں ذہن کو منتشر کیے ہوئے تھیں۔ وہ بس دل کا غبار نکالنا چاہتا تھا۔

"کن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم؟ اور پھر تم نے ایسا کیا کیا ہے جو لوگوں سے خوف زدہ ہو رہی ہو۔" زرغام کی الجھن اس کے چہرے اور لہجے میں سمٹ آئی تھی۔

"سر! بے نام تعلق اندیشے بھی پیدا کرتے ہیں اور خوف بھی۔"

تابندہ نے اپنے لفظوں میں اپنے دل کی وہ ان کہی بھی کہہ ڈالی جو زرغام نے فوراً ہی سمجھ لی۔ اس پل تابندہ کے چہرے پر پھیلے احساسات زرغام کے لیے سمجھنے مشکل نہیں تھے۔

"گھر میں پھر کوئی پرابلم ہے؟ کوئی پرپوزل آیا ہوا ہے کیا تمہارے لیے؟"

تابندہ کی پلکیں لرز اٹھیں۔ اس نے آنکھوں میں پھیلتی نمی کو اندر اتارتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ تابندہ کی خاموشی بھی اس کی زبان بن جاتی تھی۔

"سنو! تابندہ ہمارے درمیان تعلق بے نام رہے گا اور نہ ہی تمہیں اندیشوں سے خوف کھانے کی ضرورت ہے۔ میری کچھ الجھنیں ہیں۔ میں ان سے نکل آؤں تو پھر تمہارا بھی ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اتنا Trust تو ہے نا تمہیں مجھ پر۔"

زرغام کے لہجے میں بسا یقین اور اعتماد تابندہ کو شرمندہ سا کر گیا۔

"سر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ پر اعتماد نہ ہوتا تو میں آپ سے وابستہ رہنے کی چاہت کو دل میں ہی دبائے رکھتی۔" تابندہ کا بے ساختہ اظہار ناصرف اس کے جذبات عیاں کر گیا بلکہ زرغام بخاری کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو بھی پل بھر میں معدوم کر کے نرمی میں بدل گیا۔

ایک لمحے میں ہی اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔ زرغام نے اس بار ارادتاً اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی چاہت کا ناصرف مان دیا بلکہ اس کی چاہت کا مان بڑھایا بھی تھا۔

"تم ہمیشہ یہ اعتماد قائم رکھنا، تمہارا مان بھی نہیں ٹوٹے گا۔"

تابندہ کو یہی یقین و اعتماد تو اس کی جانب سے چاہیے تھا۔ آج زرغام نے کھل کر اسے اپنی محبت کا ایقان بخشا تھا۔ اسی لیے اس کا ہر اندیشہ، ہر خوف پل میں زائل ہو گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے دنیا کی نظروں سے گھبرانے والی تابندہ اب ہر خوف اور ہر نظر سے بے نیاز ہو کر اس کے سامنے بیٹھی، اسی کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔

☆.....☆

زرغام بخاری کے گھر سے نکلتے ہی نادیہ کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر پیر شاہ کے پاس جائے اور اپنے اندر بسے خوف کے ہر احساس کو اس کے سامنے عیاں کر دے۔ ماسی کو ساتھ لے کر، وہ ڈرائیور کے ساتھ آخر کار نکل کھڑی ہوئی تھی۔

پیر شاہ کے حجرے کے باہر حسبِ معمول، اس کے مریدوں کا تانتا بندھا تھا۔ اپنی باری تک کا انتظار کرنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں، سوہانِ روح بھی تھا۔ پیر شاہ نے اسے انتظار کرنے کا کہلا بھیجا تھا۔ تب ہی وہ بوجھل دل، بوجھل جسم اور احساسات کے ساتھ ناچار ایک طرف بیٹھی آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"زرغام اگر ایک بار یہاں آ جائے تو میری طرح اس کا یقین بھی پختہ ہو جائے کہ اللہ کے کمزور، مفلس، بے سہارا بندوں کو اسی کے بھیجے ہوئے خاص لوگ سہارا دیتے ہیں۔ وہی وسیلہ بنتے ہیں اور وہی دکھوں کا مداوا بھی

کرتے ہیں۔"

"بی بی صاب آ جاؤ۔ پیر شاہ جی بلاؤندے (بلاتے ہیں) نے۔" ماسی بختے کب اس کے پاس سے گئی اور کب واپس آئی، اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔

وہ کسی معمول کی طرح ماسی کے پیچھے چلتی ہوئی پیر شاہ کے حجرے میں پہنچی۔ وہی مخصوص ماحول، نیم روشن، مہکتا، سانسوں کو بوجھل کرتا ہوا اور تسکین دیتا ہوا..... نادیہ سامنے بیٹھتے ہی بے قرار سی ہو کر رونے لگی۔

"بے چینیوں کو بڑھایا نہیں کرتے بی بی، کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جان کے ساتھ لگے آزاروں سے جان چھڑاؤ گی تو وسوسوں اور اندیشوں کے چنگل سے بھی خود بخود نکل آؤ گی۔" پیر شاہ کی گمبھیر آواز کی سختی میں کسی چٹان کی سی پختگی تھی۔

"پیر شاہ جی، میں بہت کمزور ہوں۔ بے بس ہوں، رات جو عذاب مجھ پر گزرا، میں وہ کہہ نہیں سکتی۔ بس آپ.....!!"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب خبر ہے ہمیں۔" پیر شاہ نے تسبیح والا ہاتھ سیدھا کھڑا کرتے ہوئے اسی دوٹوک انداز میں بات کرتے ہوئے اسے ٹوکا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ "ہم نے تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا بی بی۔ عمل بے حد کٹھن ہے۔ ذرا سی غفلت سے معاملہ الٹ سکتا ہے۔ تمہیں اگر اپنا سکھ چین چاہیے تو اپنی نیندوں کی قربانی دینی پڑے گی۔ سورنجگوں کے بعد ہی نتائج حسبِ خواہش حاصل ہوں گے۔ سب کچھ

فرزانہ آغا ماہنامہ دوشیزہ کی وہ مصنفہ جس کے افسانوں کے عنوان بھی بولتے ہیں اور کردار بھی.....

رقصِ طاؤس کے بعد ایک اور افسانوی مجموعہ

کہانی پوچھو تم

منظرِ عام پر آ گیا ہے

کتاب ملنے کا پتہ

علی میاں پبلیکیشنز

20۔عزیز مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور

فون: 7247414

تمہاری مٹھی میں ہوگا۔ بلائیں بھی رخ موڑ لیں گی اور تمہارا شوہر بھی آزاد ہو جائے گا۔ ثابت قدمی بے حد ضروری ہے۔"

"شاہ جی! میری بے بسی تو آپ جانتے ہیں۔ اتنی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ کوئی حل ہے تو بتائیے۔ مسلسل رتجگے میرے اختیار میں نہیں ہیں۔" نادیہ نے روتے روتے سر اٹھا کر پیر شاہ کی طرف دیکھا۔

پیر شاہ کی توجہ اسی پر تھی۔ اسے دیکھتا پا کر فوراً سر جھکا کر بولے۔ "حیلے بہانے، حجت بازی انسان کی سرشت میں ہے اور عورت تو بنی ہی بہانوں کے لیے ہے۔" پیر شاہ ناراضگی سے بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔

نادیہ کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ پیر شاہ کی ناراضگی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

"پیر شاہ جی میں کوشش تو کرتی ہوں مگر......"

"کوشش؟ کوشش نہیں، عمل چاہیے عمل۔ خیر تمہارے مسئلے کا حل ہے ہمارے پاس۔" پیر شاہ برہمی سے بولتے ہوئے نرمی پر اتر آئے تو نادیہ کے دل کو بھی ذرا سا سکون ملا۔

"جہ......ی......جی شاہ جی۔ مجھے یقین ہے۔ آپ ہی میرا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔" نادیہ فوراً ہی تائیدی انداز میں بولی۔

"کام تو مشکل ہے بی بی مگر صرف تمہاری خاطر آدھا عمل میں اپنے کسی موکل کے ذمے لگا سکتا ہوں لیکن اس کا ہدیہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔" نادیہ نے جلدی سے ہامی بھری۔

رات کے اندیشے اور خوف نے اسے اس قدر ہراساں کیا تھا کہ وہ ہر بات ماننے کو تیار تھی۔

"ہدیہ تو ہم کام پورا کرنے کے بعد ہی لیں گے مگر یاد رکھنا جو موکل مانگے گا وہی دینا پڑے گا۔"

"جی......جی......میں ادا کروں گی۔ شاہ جی بس مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔"

"سب ٹھیک ہوگا۔ اللہ کے حکم سے۔ سکون سے جا کر سو جاؤ۔ ایک رات تم جاگو گی اور ایک رات ہمارا موکل۔ فکر کی بات دل سے نکال دو بی بی۔ ہم ہر وقت تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ تمہارے گھر پر ہماری دعاؤں کا حصار ہے۔ اب جاؤ اور آرام کرو۔"

پیر شاہ کی باتوں کی ڈھارس نے اس کی ہمت ہی نہیں بڑھائی تھی بلکہ اسے توانائی بھی بخش دی تھی۔ واپسی پر وہ جیسے بے حد ہلکی پھلکی سی تھی۔ تب ہی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہی اسے نیند آ گئی۔

☆......☆

"دیکھو یہ روٹی سالن پڑا ہے اگر تمہیں کھانا ہے تو کھا لو۔ ورنہ بھوکی مرو۔" حمیدہ نے کمرے میں بیٹھی ردا کے سامنے روٹی کی چنگیر رکھی، جس میں دو روٹیوں کے ساتھ دال کی کٹوری دھری ہوئی تھی۔

ردا صبح سے کمرے سے باہر ضرور نکل آئی تھی۔ نہ ناشتا کیا تھا اور نہ ہی گھر کے کسی کام کو احتجاجاً ہاتھ لگایا تھا۔ حمیدہ خود ہی بکتی جھکتی کام نمٹاتی، اپنے ساتھ، اپنے نصیبوں کو بھی کوسنے دے رہی تھی۔ ردا بے حس بنی خاموش بیٹھی رہی تھی۔

"اچھا ہے مر ہی جاؤں۔ ایسی ذلت سے تو موت اچھی ہے۔ جی کر بھی کیا کروں گی، جب سب ہی میرے دشمن بن گئے ہیں۔" ماں کو پلٹتا دیکھ کر ردا نے روتے روتے جیسے دہائی دی۔

"ہاں! اب ہم تمہیں دشمن ہی نظر آئیں گے۔ تمہیں کھلی چھٹی دے دیں تو تیرے سجن ہوں گے۔ ایسی توقع مجھ سے مت رکھنا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں اُن ماؤں جیسی نہیں ہوں جو بیٹیوں کی غلطیوں پر پردے ڈال کر بعد میں پچھتاتی ہیں۔" حمیدہ نے پلٹ کر اسے ڈپٹ کر رکھ دیا۔

"امی، خدا کے لیے آپ تو میری خوشی کا خیال کرو۔ آخر آپ ماں ہو میری۔ مجھے اتنی بڑی سزا مت دو۔" ردا چارپائی سے اٹھ کر ماں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ماں ہوں اسی لیے تمہاری بھلائی سوچ رہی ہوں۔"

"کیا بھلائی ہے میری۔ ساری زندگی تایا جی کے خلاف آپ ہمیں بھڑکاتی رہی ہیں اور اب ان ہی لوگوں کے ساتھ ساری زندگی نبھانے کا سبق پڑھا رہی ہیں۔" ردا نے حمیدہ کے اٹل انداز کو دیکھ کر اپنی بھڑاس نکالی۔

"تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے ردا۔ میرے سبق اگر تمہیں یاد ہوتے تو آج تم میرے سامنے کھڑی سوال جواب نہ کر رہی ہوتیں۔ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔" حمیدہ نے سامنے کھڑی ردا کو بری طرح لتاڑتے ہوئے ہاتھ سے دھکیلا۔

"ہو جاؤں گی دفع۔ دیکھ لینا آپ اور ابو...... میں......وہ کروں گی پھر ساری زندگی روتے رہنا آپ۔ مجھے کچھ کر جاؤں گی میں۔ خودکشی کر لوں گی اگر آپ لوگوں نے میرے ساتھ زبردستی کی تو۔"

ردا کی آواز اس قدر بلند تھی کہ حمیدہ کو اندیشہ ہونے لگا کہ ساتھ کے گھروں تک اس کی باتیں سنی جا رہی ہوں گی۔ وہ آگے بڑھی اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

"چپ کر جا بے غیرت! اچھا ہے تیری جیسی بیٹی کو تو، کچھ کھا کے مر ہی جانا چاہیے۔ جسے باپ کی عزت کا خیال ہے نہ ماں کی۔ خبردار اب جو تیری آواز نکلی۔ ورنہ میں خود ہی تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔"

ردا کو جیسے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ حمیدہ کو جیسے اس کی پروا ہی نہیں رہی تھی۔ اسے اسی طرح گم صم کھڑا چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆

"دیکھ رشید۔ بات تو تابندہ کی طے ہوئی تھی اور تُو تو جانتا ہے کہ یہ تو بہشتن اماں کی بھی خواہش تھی کہ ہم دونوں بھائیوں میں رشتے داری ہو۔ پر اب تو کہہ رہا ہے کہ......"

بشیر احمد کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھے دونوں بھائی اسی مسئلے پر الجھے ہوئے تھے۔ بشیر احمد کے لہجے سے واضح ناراضگی جھلک رہی تھی۔

"بھائی جی! میں منکر نہیں ہوں۔ پر آپ میری مجبوری وی تو سمجھیں۔ میری پنشن سے گھرداری نہیں چلتی تو دو دو بیٹیوں کی ڈولیاں ایک ساتھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ تابندہ بیٹا بن کر میرے ساتھ کھڑی ہوئی ہے تو مجھے بھی حوصلہ ملا ہے۔ آپ خود ہی سوچیں میرے لیے کتنی مشکل ہوگی۔" رشید احمد، بھائی کے سامنے گھگھیا کر بولا۔

وہ آج دل ہی دل میں حمیدہ کی بات کا قائل بھی ہو رہا تھا اس نے سوچا بھائی جی کو آزمانے کا یہی موقع تھا۔

"صاف بات کر تیری دھی نہیں مانتی ہوگی۔ سنا ہے بڑا نخرہ ہے۔ گڈیوں (گاڑیوں) میں آتی جاتی ہے۔ پر پرزے تو نکل ہی آتے ہیں آج کل کڑیوں کے۔"

”نہ......نہ بھائی جی۔“ بھائی جی کی بدگمانی اسے تڑپا گئی۔ تابندہ کی فرمانبرداری اور قربانیاں تو رشید احمد کو زیر بار رکھتی تھیں۔ ”میری بیٹی نے آج تک خود کو سنبھال کر دنیاداری نبھائی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پر بھروسہ ہے اور پھر رمیز کی پڑھائی پوری ہونے تک ہی تو آپ سے مہلت مانگ رہا ہوں۔ دو تین سال کی بات ہے۔“

”دو تین سال بڑا ٹیم (وقت) ہوتا ہے شیدے۔ تو پہلے چھوٹی کا کرے گا فیر وڈی (پھر بڑی) کا۔ لوک کیا کہیں گے۔“ بشیر احمد نے سگریٹ کا کش لے کر انگلیوں میں دبے سگریٹ کی راکھ کو چٹکی بجا کر جھاڑا۔

”لوگوں کی چھوڑیں بھائی جی اگر اپنی مرضی ہو تو پھر لوگوں کی پروا کون کرتا ہے۔ آخر کو دونوں ہی کی شادیاں کرنی ہیں اور سب ہی جانتے ہیں۔ تابندہ نے ہی ساری ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔ وہی بہن بھائی کے لیے قربانی دے رہی ہے تو پھر لوگوں کو کیا اعتراض۔ لوگ تو کسی کو ہنستا دیکھ سکتے ہیں اور نہ کھاتا۔“ رشید احمد نے اپنی طرف سے بات ختم کی۔

بشیر احمد نے سامنے بیٹھے بھائی کو سنجیدگی سے دیکھا۔ دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔

رشید احمد نے اٹھتے ہوئے آخر میں پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے بھائی جی۔ آپ سوچ لیں بھابی سے بھی مشورہ کرلیں۔ تابندہ کے لیے آپ کو کچھ سال انتظار کرنا پڑے گا۔“

رشید احمد کے کھڑے ہوتے ہی بشیر احمد بھی اٹھ گیا۔

”چل فیر ٹھیک ہے۔ تو کل آ...... فیر گل بات کرتے ہیں۔ میں اپنے منڈوں سے پچھ (پوچھ) لیتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں لچک اور آنکھوں میں نئی سوچ تھی۔

رشید احمد نے بڑے بھائی کو اُمید بھری نظروں سے دیکھا اور وہاں سے نکل آیا۔

☆......☆

یہ دوسرا موقع تھا جب وہ آفس کے اوقات میں زرغام کے ساتھ لنچ کے لیے کسی ریسٹورنٹ میں آئی تھی۔ محبوب کے ساتھ کا سرور تو بہر حال اس کے وجود میں سرائیت کرچکا تھا، اسی لیے وہ دنیا کے خوف سے آزاد اور ہلکی پھلکی سی دلکشی سے مسکراتی پہلے سے بے حد مختلف نظر آرہی تھی۔

زرغام کی نگاہیں بار بار اس کے چہرے پر ٹھہر جاتی تھیں۔ اس کی عام سی باتیں بھی اپنے اندر اس قدر کشش رکھتی تھیں کہ زرغام کو اپنی ساری الجھنیں جیسے بھول گئی تھیں۔

”I can`t Believe it. تابندہ تم اپنی لائف میں بہت کچھ پانے کی خواہش ہی نہیں رکھتی ہو؟ تم اپنی عام سی روٹین اور زندگی سے اس قدر کیسے مطمئن ہو؟“ زرغام بخاری نے خاصی بے یقینی سے پوچھا۔

تابندہ کی اس بات نے اسے کافی حیران کیا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہے۔ زرغام کی حیرت بجا تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے پاس تو مسائل وخواہشات کے انبار ہوتے ہیں۔ اس بات کا اسے مشاہدہ بھی تھا اور علم بھی......

”سر، کیا غیر مطمئن ہو کر زندگی کی آسائشات آسانی سے مل سکتی ہیں۔ نہیں ناں۔ تو پھر اپنی چادر سے باہر جانے کا سوچنا ہی بے کار ہے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارے پاس بڑا سا گھر ہو، گاڑی ہو، تم جس شے کی طرف ہاتھ بڑھاؤ، وہ تمہاری دسترس میں ہو؟“ زرغام نے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ نگار نذر

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ، نگار نذر کی تخلیقات میں ”گوگی“ کو بنیادی حیثیت حال ہے۔ اپنے اس کارٹونک کردار کی مدد سے، انہوں نے فکر کو مختلف معنی اور نظر کو سیکڑوں زاویے دیے۔ ”گوگی“ پہلی مرتبہ 1970ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹ‘ کراچی کے سالانہ میگزین کے ذریعے منظرِ عام پر آئی اور بعض ملکی روزناموں میں کامک اسٹرپ کی صورت میں شائع ہوئی۔ دنیا بھر میں اس کارٹون کردار نے اپنی شناخت قائم کی۔ نگار نذر کے مطابق، گوگی، اُن عورتوں کی ترجمان ہے، جو معاشرے کے لیے کارآمد بننا چاہتی ہیں۔ اجتماعی وانفرادی اعتبار سے ترقی کی خواہش مند ہیں۔ اپنے حقوق چاہتی ہیں اور ایک ایسی سوسائٹی کی خواہش رکھتی ہیں جہاں انصاف ہو اور شہریوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ گوگی کا کردار کامک اسٹرپس کی صورت میں ملکی اور غیر ملکی روزناموں کے علاوہ کئی میگزین کی زینت بنا اور پاکستان میں اسے ٹیلی ویژن پر بھی پیش کیا گیا۔ نگار نذر کے کارٹونک آرٹ کو بیرونِ ملک بے حد سراہا گیا اور اسے بہت اہمیت دی گئی۔

”دل......دل کی چاہت تو چاند کو چھونے کی بھی ہوتی ہے مگر چاند کو چھونا اتنا آسان ہوتا تو ہر کوئی اس کا دعوے دار بن جاتا، ویسے بھی سر، میں جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ وہاں لڑکیوں کی سوچیں ایک گھر سے ہی بندھی ہوتی ہیں۔ دو وقت کی روٹی اور محبت کے دو بول، بس اپنی وفا کا اتنا ہی صلہ چاہیے ہوتا ہے ہمیں۔“ تابندہ ایکدم ہی سنجیدگی سے بولنے لگی۔

دل کے حساس تاروں کے چھڑ جانے سے اس کی آنکھوں میں بھی حُزن سا پھیل گیا تھا۔

زرغام نے اس کی سنجیدگی کو محسوس کر کے اسے ٹوکا۔ ”میرے پوچھنے کا مقصد تمہیں سنجیدہ اور اداس کرنا نہیں تھا، اداسیاں تو پہلے ہی میرے اردگرد بہت ہیں تابی۔ میں تو یہاں تمہارے ساتھ خوشی کے چند لمحے گزارنے آیا ہوں۔“ زرغام نے موضوع بدلتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر جیسے اسے اپنے ساتھ ہونے کا احساس دلایا۔ تابندہ نے پلکیں جھپک کر اس کی جانب دیکھا۔ پھر چند لمحے ٹھہر کر پوچھا۔

”سر، آپ کی دسترس میں تو سب ہی کچھ ہے۔ پھر آپ کے اردگرد اداسیاں کیوں ہیں؟ کیا کمی ہے جو آپ کو بے کل رکھنے لگی ہے۔“

زرغام نے جیسے کسی خوب صورت احساس سے چونکتے ہوئے اس کی بات سنی۔ پھر گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولنے لگا۔ ”بظاہر کوئی کمی نظر نہیں آتی مگر کمی تو ہے تابندہ زندگی ادھوری سی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی...... اپنی زندگی کے ادھورے پن کو مکمل کرنے کے لیے مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟“

زرغام نے بہت واضح انداز میں اظہار کیا تھا۔ تابندہ کو یہی یقین تو چاہیے تھا۔ صاف اور واضح، تابندہ نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہر تاثر سے اسے ساتھ دینے کا اعتبار دیا اور پھر دھیمے لہجے میں اقرار بھی کیا۔

”سر! میں زندگی کے ہر لمحے، ہر موڑ، ہر مقام پر آپ کے ساتھ ہم سفر رہنے کے لیے دل سے راضی ہوں۔

بس آپ مجھے پیچھے مت چھوڑ دیجیے گا۔'' دونوں ہی اپنے عہد و پیاں پر شاد و مسرور سے وہاں سے اٹھے تھے۔

☆......☆

''علیشہ Really میں بے حد Upset ہوں، آج کل۔'' زرغام بخاری سامنے بیٹھی، علیشہ کو کسی بات کے لیے قائل کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

علیشہ کے چہرے پر ناراضگی و سنجیدگی واضح نظر آ رہی تھی۔ ''So, what ہم سب ہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسائل ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم زندگی کے معاملات ہی ٹھپ کر کے بیٹھ جائیں۔ کچھ Responsibilities آپ کی بھی ہیں۔ مسٹر زرغام۔'' علیشہ نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اسی تاثر سے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو علیشہ۔ میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں مگر کچھ باتیں اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ Well تمہیں آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔ تم اس Visit سے واپس آؤ گی تو یہاں سب کچھ تمہیں اپنی مرضی کے مطابق ملے گا۔''

''I hope so۔'' علیشہ نے گود میں رکھے اپنے بیگ کی زپ کھولتے ہوئے دھیمے مگر ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ پھر بیگ سے اپنا سیل فون نکالتی واپسی کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''میں واپس آؤں تو مجھے اپنے اسٹاف میں دو تین لوگ Help کے لیے چاہئیں اور ہاں Next week کینیڈا سے ہمارے کلچر پر ریسرچ کے لیے ایک ڈیلی گیشن بھی آ رہا ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میں Stay نہیں کرنا چاہ رہے۔ کسی گھر یا گیسٹ ہاؤس کا انتظام ہو سکتا ہے تو پلیز آپ Manage کروا دیں۔ Don`t worry اعتماد اور بھروسے کے لوگ ہیں۔ میں کافی دفعہ مل چکی ہوں ان لوگوں سے۔'' علیشہ نے کھڑے کھڑے اطلاع دیتے ہوئے یقین بھی دلانا چاہا۔

زرغام نے نیم رضامندی سے کہا۔ ''او کے میں دیکھتا ہوں، تم بھی بے فکر ہو کر جاؤ۔''

علیشہ سر ہلاتی، وہاں سے نکل کر اپنے کیبن کی طرف آئی تو خالد عظیم کے ساتھ اُسود علی کو بیٹھا دیکھ کر اس کا موڈ بدل گیا۔ دونوں کافی پیتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر دونوں ہی چونک اٹھے۔ علیشہ نے اُسود کو نظر انداز کرتے ہوئے خالد عظیم کو مخاطب کیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تم باس کے ساتھ Meeting میں تھیں۔ اس لیے ہم یہاں Wait کر رہے تھے۔''

''Kind your Information مسٹر خالد عظیم، یہ میرا آفس ہے، کوئی Waiting Room نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے کمرے میں غیر متعلقہ لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' علیشہ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُسود علی کو سلگایا۔

اپنی توہین محسوس کرتا اُسود علی یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں ایسا کوئی Rule Follow کیا جاتا ہے۔ مہمانوں سے ایسا سلوک۔ یقیناً مس علیشہ کا اپنا بنایا ہوا کوئی Rule ہوگا۔'' اُسود نے خفگی کا اظہار کیا اور وہاں سے نکل گیا۔

علیشہ کو اس کے جانے کے بعد اپنے رویے کا احساس ہوا۔ وہ کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی۔

خالد نے اسے خاصی ناراضگی سے مخاطب کیا۔ ''کبھی کبھی تمہیں ہو کیا جاتا ہے؟ اگلے بندے کو بے عزت کرنے میں صرف ایک سیکنڈ لگاتی ہو اگر وہ Direct باس کے روم میں آ جاتا تب بھی تمہیں اعتراض ہوتا۔''

''تمہیں معلوم تو ہے اس شخص کو دیکھ کر میں خود پر کنٹرول نہیں رکھ پاتی۔ پھر تم اسے یہاں لے کر کیوں بیٹھے تھے۔'' علیشہ نے بڑی آسانی سے اپنے رویے کا جواز دے کر اس کے ساتھ خود کو بھی مطمئن کیا۔

''اب مجھے کھڑے کیا گھور رہے ہو، جاؤ۔''

''تمہیں اپنے رویے پر ذرا بھی شرمندگی نہیں ہے۔'' خالد نے اس کے چہرے پر نظر جمائے جمائے پوچھا۔

''میں نے ایسا کچھ غلط نہیں کیا۔ تم سب ہی میری نیچر جانتے ہو۔ میں دل میں کچھ نہیں رکھتی۔ بہر حال تم اب نکلو شام تک ایئر پورٹ پہنچ جانا۔ میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔'' علیشہ نے خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے اسے ٹالا۔ بہر حال اپنے روڈ رویے کا احساس اسے خود سوا بھی تھا۔

خالد خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆

''ردا، آخر تم ای کو تنگ کیوں کر رہی ہو؟ تم کیا سمجھتی ہو، تمہاری بھوک ہڑتال دیکھ کر ابو اپنا فیصلہ بدل کر تمہاری مان لیں گے؟'' تابندہ کے بلانے پر بھی جب ردا رات کے کھانے کے وقت ان کے ساتھ نہ آ کر بیٹھی تو تابندہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

اس کے ناصحانہ انداز پر ردا نے برہم نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو نہ مانیں میری بات اور جب میرے بھوکے رہنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''میں تمہیں سمجھانے آئی ہوں کہ تمہاری یہ ضد تمہارا ہی نقصان کر رہی ہے، تم جس رستے پر جانا چاہتی ہو، وہ صحیح رستہ نہیں ہے ردا۔'' تابندہ نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جسے اس نے بری طرح جھٹک کر جواب دیا۔

''میں غلط راستے پر جا رہی ہوں، ابو اور تم لوگ مجھے صحیح جگہ بھیج رہے ہو؟''

''ابو نے کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے ردا۔ تایا جی کے بیٹے کم از کم اس لفنگے، لوفر کبوتر باز سے تو بہتر ہی ہوں گے۔ اتنا تو اب مجھے بھی یقین ہے۔'' تابندہ نے سمجھانا چاہا۔

''اچھا! اب تایا جی کے بیٹے اچھے ہو گئے؟ تمہارا مسئلہ نہیں ہے نا یہ اس لیے تم ان کی حمایت کر رہی ہو۔'' ردا بدتمیزی سے بولتی 'آپ' سے 'تم' پر اتر آئی۔

تابندہ نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''ردا، یہ تم بول رہی ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایک آوارہ نکمے انسان کے لیے تم نے ہماری محبت اور عزت سب ہی کچھ بھلا دیا ہے۔ ای ٹھیک کہہ رہی ہیں تم حد سے گزر چکی ہو۔''

''ہاں گزر چکی ہوں میں حد سے۔ جا کر بتا دو ای ابو کو اگر انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں یا تو چھت سے کود کر جان دے دوں گی یا پھر......'' ردا نے چیختے ہوئے دھمکایا۔

''یا...... پھر......؟ یا پھر کیا کرو گی...... بولو......'' تابندہ بھی غصے میں اس کے پاس سے اٹھ کر اس کے سامنے

کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔ ردا کا رویہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ "جواب دو۔ اب خاموش کیوں ہو؟"

"تابندہ آپی مجھے مجبور مت کرو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ مجھے اپنی مرضی سے جینا ہے اگر جینا ہے تو؟ ورنہ مرضی کی موت، میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ بے فکر رہو میں بھاگوں گی نہیں۔ یہیں مروں گی تم سب کی نظروں کے سامنے۔"

ردا کی جذباتیت تابندہ کو حیران و ہراساں کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا، وہ کچھ کر گزرنے والی ہے۔ اس کی آواز صحن تک جا رہی تھی۔ حمیدہ بھی لحہ بھر کو تو لرز گئی۔ یہ تو شکر تھا کہ رمیز اور رشید احمد گھر میں نہیں تھے۔ وہ اندر آئی اور آتے ہی اس کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیا۔

"کیا کہہ رہی ہے بدبخت۔ میری تربیت اتنی گندی، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ تو میری اولاد ہے۔ صحیح کرتے تھے پہلے لوگ۔ بیٹی کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ کاش...... کاش میں نے بھی پیدا ہوتے ہی تیرا گلا گھونٹ دیا ہوتا۔" حمیدہ اسے مارتے مارتے تھک گئی۔

تابندہ کے آنسو بھی بہہ نکلے۔ نہ جانے کیا ہوا تھا، لگتا تھا۔ ردا پر کوئی جنون طاری ہے۔ "خدا کے لیے امی آپ ہی کچھ خیال کریں۔ آئیں، آرام سے بیٹھیں۔ رہنے دیں اسے بھوکا، چار وقت کی بھوک ہی ہوش ٹھکانے لے آئے گی۔ آئیں چلیں۔" تابندہ ماں کو گھیر کر باہر لے آئی۔

ردا، ماں کی مار کے جواب میں خود کو ہی اذیت دیتے ہوئے چارپائی سے سر پٹخنے لگی تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی گھٹنوں میں سر دے کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

☆......☆

"پھوپو، سچی مجھے تو یہ کوئی خواب ہی لگ رہا ہے۔ میں سنگاپور جا رہی ہوں؟ وہ بھی اسود علی کے ساتھ؟" نائلہ صبح سے اڑی اڑی پھر رہی تھی۔

وہ زریں بیگم کے کہنے پر ٹی وی لاؤنج میں دونوں جٹھانیوں کے ساتھ آ کر بیٹھی تھی۔ شمسہ اور نائلہ کی آج بھی شام کی چائے پر کسی بات پر بحث ہوئی تھی۔ اس لیے شمسہ تو اسے دیکھتے ہی وہاں سے چلی گئی جب کہ سنبل مجبوراً اس کی بچکانہ و احمقانہ سی باتیں سننے کو بیٹھی تھی کہ صبح سے ابھی تو اسے بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔

"میری چندا، تم نہیں جاؤ گی تو اور کون جائے گا۔ تمہارا ہی تو حق ہے۔" زریں بیگم نے ہمیشہ کی طرح اسے چڑھایا اور سنبل کو جلانے کی کوشش کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے پھوپو مگر آپ پھر بھی اسے کہہ دینا، مجھے وہاں لے جا کر ہوٹل کے کمرے میں نہ بند کر دے۔ مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھے اور...... اور مجھے وہاں کے مشہور شاپنگ مال سے شاپنگ بھی کروائے۔ آپ نے اسے کہہ کر بھیجنا ہے، اچھا۔" نائلہ نے بچوں کی طرح ٹھنک کر فرمائش کی۔

سنبل اسے کوفت سے دیکھ کر رہ گئی۔

"ہاں ہاں بے فکر رہو، میں اسے پوری پٹی پڑھا کر بھیجوں گی مگر تم بھی ذرا خیال رکھنا، فضول چیزیں مت خرید کر لے آنا۔" زریں بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"فضول چیزیں تو کبھی میں نے خریدی نہیں ہیں۔ ویسے بھی مجھے پتا ہے، اسود کو فضول چیزوں سے چڑ ہے۔"

"شکر ہے نائلہ، تمہیں یہ تو پتا ہے کہ اسود کو فضول چیزوں سے چڑ ہے۔" سنبل نے مداخلت کرتے ہوئے اپنی شامتِ اعمال کو دعوت دی۔

زریں بیگم نے پہلے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا پھر ناگواری سے بولیں۔

"تم سے کس نے بولنے کو کہا ہے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو اور سنو اسود کی پسند کی ڈش کھانے میں ضرور بنا لینا۔ پھر تو کتنے دن تک گھر کا کھانا ہی نصیب نہیں ہو گا بچوں کو۔" زریں بیگم کی ہدایت پر سنبل اپنی سبکی کے باوجود اٹھی اور کچن میں آ گئی۔

اس کی آخری پناہ گاہ یہی تھی۔

☆......☆

ایئرپورٹ کے لیے نکلنے سے پہلے وہ آخری بار گھر کی کھڑکیاں دروازے چیک کر رہی تھی کہ ہر دروازہ اور کھڑکی بند ہے یا نہیں۔ اپنا سامان وہ پہلے ہی اپنی گاڑی میں رکھ چکی تھی۔ اپنی گاڑی کو وہیں ایئرپورٹ پارکنگ میں کھڑی کرنے کا ارادہ تھا۔ اس بار کہیں جاتے ہوئے نہ جانے وہ کیوں پرجوش نہیں تھی۔ اسے جانا تھا بس جیسے یہ اس کی مجبوری تھی اور یہی اس کا کام۔

کچن لاک کرتے ہوئے اس نے کال بیل کی آواز سنی۔ اس وقت کسی کی آمد کی توقع تو نہیں تھی۔ فاطمہ کو وہ پہلے ہی منع کر چکی تھی اور خالد عظیم کو بھی...... پھر بھی اسے لگا تھا کہ دروازے پر خالد عظیم ہی ہو گا۔ وہ اپنا بیگ لے کر دروازہ کھولنے نیچے آئی تو دروازہ کھولتے ہی وہ حیرت سے کھڑی رہ گئی۔

علیشہ دروازہ کھولنے کے بعد حیرت سے کھڑی رہ گئی۔ سامنے اسود علی کو دیکھ کر اس کی حیرت چیخ بن کر اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔ "ک...... م...... یہا...... ں...... اس وقت؟" علیشہ کے صرف تاثرات نہیں بگڑے تھے بلکہ اس کا لہجہ بھی برہم ہو گیا تھا۔

"ہا......ں جانتا ہوں تم اس وقت ایئرپورٹ کے لیے نکلنے والی ہو۔ دیکھو میں تمہارا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔" اسود نے اس کے مزید بولنے سے پہلے ہی بڑی سنجیدگی سے تمہید باندھی۔

"زیادہ ٹائم؟ میں تمہیں ایک سیکنڈ بھی دینے کو تیار نہیں ہوں۔"

علیشہ نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور مڑ کر جانے لگی لیکن اسی لمحے کال بیل پھر سے بج اٹھی۔ اس بار علیشہ کے چہرے پر واضح جھنجھلاہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ گھر کے کھڑکی دروازوں پر طائرانہ سی نظر ڈال کر پھر سے دروازے کی طرف بڑھی اور اس بار دروازہ کھول کر خود بھی باہر نکل آئی۔ اسود وہیں کھڑا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی گھر کو مقفل کرنے لگی۔

"علیشہ I Know تم مجھ سے ناراض ہو، پلیز صرف ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو۔"

"مسٹر اسود علی۔ میں آخر کس طرح سمجھاؤں تمہیں۔ تمہیں اپنی عزت پیاری ہے یا نہیں۔" علیشہ نے ایک ایک لفظ جیسے چبا کر اپنی بے رخی اور غصے کا اظہار کیا۔

"پیاری ہے۔ بہت پیاری ہے۔ تب ہی تو تم سے ایکسکیوز کرنے آیا ہوں۔" علیشہ گھر مقفل کر کے پلٹی اس کی آنکھوں میں پھر سے حیرت سمٹ آئی تھی۔ اسود علی کی شرافت اسے مشکوک لگ رہی تھی۔

"تم بھی سفر پر جا رہی ہو اور میں بھی کل سفر میں ہوں گا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے معافی مانگ لوں۔

کیا پتا کب کیا ہو جائے۔ میں پلٹ کر آسکوں یا؟ دیکھو نا زندگی میں کبھی کبھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے پلیز میری کسی بات یا حرکت نے تمہیں Hurtt کیا ہو تو I am realy sorry اپلیز۔"

علیشہ کو اسود کی معذرت اور باتیں حیران کر رہی تھیں مگر اس وقت وہ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اپنی حیرت چھپاتی قدرے مروت سے بولی۔

"It`s all Right۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔" علیشہ نے بات کرتے کرتے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔

گاڑی کا لاک کھولتے کھولتے اس نے اسود کو سرسری نظر سے دیکھا۔ وہ بڑی شرافت سے چہرے پر سنجیدگی سجائے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے متوجہ ہونے پر کچھ بے یقینی سے پوچھنے لگا۔

"تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے؟"

"ہاں فی الحال تو..... اگر تم اپنی حرکتوں سے باز رہے تو۔ مجھے خوامخواہ دشمنیاں پالنے کا شوق نہیں اسود علی۔ نہ ہی میری نیچر ہے کسی کو زچ کرنے کی۔ hope اتم آئندہ اپنے رویے سے ہی اپنی بات ثابت کرو گے۔" علیشہ نے اسے بہت باور کرایا۔

اسود سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ اس سے کہنے تو بہت کچھ آیا تھا مگر اس کا غصہ، اس کا رویہ دیکھ کر بات بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا اور علیشہ وہاں سے جا چکی تھی۔ اسود کے چہرے پر کسی نئی سوچ کا عکس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی میں اپنی چاہت کا حصول ممکن بنانے اور علیشہ کا دل جیتنے کے لیے آخر اسے کیا کرنا چاہیے۔ اپنی سوچوں کے درمیان نہ جانے وہ کب تک گھرا رہتا۔ قریب ہی کسی نے تیز ہارن دیا تو وہ چونک کر سنبھل گیا۔ اب اسے جو بھی کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ علیشہ کی محبت سے پہلے اس کی دوستی حاصل کرنا زیادہ ضروری تھا۔ یہی بات وہ واپس آتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اسی لیے بے حد مطمئن انداز میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتا گاڑی چلا رہا تھا۔

☆.....☆

کمرے میں دونوں بہنیں اکیلی تھیں۔ کچھ بھی تھا نابندہ کے لیے اپنے گھر کے کسی فرد کو تکلیف میں دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ اس نے بہت کچھ سہا تھا۔ بہت قربانیاں دی تھیں۔ صرف اپنے گھر والوں کے سکھ اور سکون کی خاطر۔ ردا کی خواہشات کا تو اس نے ہمیشہ خیال رکھا تھا۔ اب اس کی ضد، ہٹ دھرمی اور بھوک ہڑتال نے اسے حیران ہی نہیں کیا تھا بلکہ بے حد تکلیف بھی پہنچائی تھی۔

"ردا، تمہیں کیا لگتا ہے تمہارے اس طرح کرنے سے حالات بدل جائیں گے یا ابو کا فیصلہ۔" نابندہ نے کمرے میں آنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہ کر ردا کو دیکھتے ہوئے بہت کچھ سوچ کر آخر اسے مخاطب کیا۔

ردا نے چوکنے ہوئے سر اٹھا کر حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا، پھر بولی۔

"یہ..... تم پوچھ رہی ہو آپی؟ جب کبھی تم ابو کے فیصلے کی زد میں آؤ گی تو کیا آسانی سے چپ چاپ سر جھکا کر تایا جی کے کسی نکلے، آوارہ بیٹے کے ساتھ چل پڑو گی؟" ردا کے لہجے میں بڑی تپش تھی۔

"تم بار بار مجھے کیوں درمیان میں لے آتی ہو؟ اس وقت بات تمہاری ہو رہی ہے۔" نابندہ نے زچ ہو کر احتجاج کیا۔

"دیکھا، خود کو وہاں سوچ کر ہی تمہارا ردِعمل ایسا ہے جب کہ مجھے تو باقاعدہ وہاں بھجوانے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ پھر بھی میرا احتجاج برا لگ رہا ہے۔" ردا کا رویہ نہیں بدلا تھا۔

"تمہارا احتجاج اگر جائز ہوتا تو میں تمہارا ساتھ ضرور دیتی ردا۔ تمہارا یہ بے وقوفانہ رویہ بعد میں تمہیں بھی پچھتاوے دے جائے گا۔ پلیز ابھی بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ نہ اپنی قدر کنواؤ اور نہ ہی امی ابو کو شرمندہ ہونے دو۔" نابندہ اٹھ کر اس کے قریب آبیٹھی اور رسانیت سے سمجھانے لگی۔

"میرے بارے میں کوئی نہیں سوچ رہا اور میں سب کے لیے سوچوں؟ یہ اچھا انصاف ہے۔" ردا نے تلخی سے کہتے ہوئے اپنے کاندھے پر دھرا تا نابندہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نابندہ نے ملال بھری نظروں سے دیکھا۔

"ردا..... م اتنی بدل گئی ہو؟ کہ..... کسی غیر کے لیے؟ کہ کیا؟ وہ تمہاری زندگی میں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے آگے تمہیں امی ابو کوئی بھی نظر نہیں آرہا؟"

"ہاں رکھتا ہے وہ میری زندگی میں اتنی اہمیت۔ تم اچھی طرح سن لو آپی۔ میں نوید کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" ردا کے لہجے میں، رویے میں، جوانی کا جوش اور محبت کا ابال اٹھ رہا تھا۔ اسے اس وقت اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نابندہ کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"اچھا!! کیا اس نے کہا ہے کہ وہ تم سے شادی کر لے گا؟ تمہیں عزت سے لے کر جائے گا؟" نابندہ غصے سے پوچھنے لگی۔

"محبت کرتا ہے وہ مجھ سے کیوں نہیں کرے گا وہ مجھ سے شادی۔" ردا جوش کے باوجود اپنے دعوے کو پورے یقین سے نہ کہہ پائی۔

"ٹھ..... ٹھیک ہے۔ پھر اس سے کہو، اپنے گھر والوں کو بھیجے۔ عزت سے تمہارا ہاتھ مانگے۔ میں ابو کو منا لوں گی۔ بلکہ اس سے کہو پہلے مجھ سے ملے۔ میں بھی دیکھوں، وہ تمہاری محبت کے دعوے میں کہاں تک سچا ہے۔" نابندہ سرد لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے پر اس کے ارادوں کا عزم جھلک رہا تھا۔

ردا یکدم خوش ہو کر بے یقینی سے پوچھنے لگی۔ "واقعی! آپی تم ابو کو منا لو گی؟ کیا وہ مان جائیں گے۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے کہ میں ابو کو کیسے مناتی ہوں مگر تمہیں بھی میری ایک بات ماننی ہو گی۔ جب تک اس لڑکے سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں بن جاتا۔ تم اس سے کہیں باہر جا کر نہیں ملو گی۔"

"مم..... مگر آپی.....؟" ردا نے کچھ کہنا چاہا، نابندہ اس کی بات بنا کہے سمجھ رہی تھی۔

"اسی میں ہم سب کی عزت ہے اور تمہاری بھی۔ اب اٹھو اور جا کر کھانا کھاؤ۔ پھر مجھے اس کا نمبر دے دینا۔ میں اس سے کل ہی ملوں گی۔"

ردا کے چہرے پر انجانی سی خوشی نمودار ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی بڑھ سی گئی تھی۔ نابندہ پر سوچ نظروں سے اسے کمرے سے باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔ یہ مسئلہ اسے کسی طرح تو حل کرنا تھا۔

☆.....☆

"حماد! بھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ کچھ کر لو پلیز۔ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آنے والے کل کو رونے سے بہتر ہے کہ آج ہی ہم رونے کی وجہ مٹا دیں۔" شمسہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تو اس کا رویہ بے حد خراب تھا۔

زریں بیگم کا التفات ور جحان صرف نائلہ پر تھا۔ یہ بات شمسہ سے کبھی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی کہ زریں بیگم، نائلہ کے لیے ناصرف اسے نظر انداز کریں بلکہ اس کے ساتھ سنبل کی طرح کا برتاؤ بھی کر جائیں۔ آج کھانے کے وقت انہوں نے شمسہ کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا وہ جس ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتی تھی، زریں بیگم پہلے ہی اٹھا کر نائلہ کو کھانے کی کے لیے پیشکش کر دیتی تھیں اور یہ بات شمسہ کو کافی اذیت دے چکی تھی۔

''کیا کرلوں؟ کیا کر سکتا ہوں میں۔ ہاتھ پیر باندھ کر لولا لنگڑا بنا دیا ہے ہمارے باپ نے ہمیں۔ ساری محنت ہماری اور نام اس کا چلتا ہے۔ سارے عیش اس کے حصے میں ہیں۔ سیر سپاٹے کرتا۔ موج اڑاتا پھرتا ہے خبیث انسان۔'' حماد خود بھرا ہوا تھا، بس چھیڑنے کی دیر تھی۔

اسود علی کی ذات اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی۔ ''کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ صرف مما قصوروار ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ میں تمہیں پھر کہہ رہی ہوں۔ میں یہاں اس طرح ذلیل ہو کر نہیں رہ سکتی۔ یا تو اپنا حق مانگو یا پھر ہمارے لیے کوئی بندوبست کرو۔ میرا اب مما کے ساتھ گزارہ نہیں ہے۔'' شمسہ نے اپنی بھڑاس نکالی۔

''کہاں بندوبست کروں؟ میرے پاس باپ دادا کے چھوڑے ہوئے محل دیکھ لیے ہیں تم نے؟''

حماد کی بدمزاجی، اس کی تلخی آج کل بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وجہ وہ اختیارات تھے جو اس کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ اسود نے فیکٹری پر اپنی نگرانی رکھ کر اسے من مانی سے روک جو لیا تھا۔

''تمہارے باپ دادا نے تمہارے لیے محل نہیں چھوڑے مگر میرے باپ نے ضرور میرے سر چھپانے کا آسرا میرے لیے وقف کیا ہے اگر یہاں یہی حالات رہے تو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ میں پھر وہاں جا بیٹھوں گی۔'' شمسہ نے حماد کو ناصرف اکسایا بلکہ دھمکایا بھی۔

حماد لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا۔ ''او بے وقوف عورت۔ یہ بات کسی سے غلطی سے بھی نہ کہہ دینا۔ وہ تو چاہتا بھی یہی ہے کہ ہم تنگ آ کر خود ہی اس کی جان خلاصی کر دیں۔'' حماد کا جوش اس کے لہجے اور چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''وہ کچھ نہیں چاہتا حماد، اس کی نیت پر شک مت کرو۔ جو کچھ بھی چاہتی ہیں، مما چاہتی ہیں۔ اپنا آپ محفوظ رکھنے کی ساری پلاننگ انہوں نے کر رکھی ہے۔ دیکھ لینا خوار ہوں گے تو صرف ہم لوگ ہی......'' شمسہ کی بدگمانی عروج پر تھی۔

حماد کو جھنجلاہٹ ہوئی۔ ''اپنے وہم میرے دماغ میں ٹھونسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مما جو بھی کر رہی ہیں، ہمارے لیے ہی کر رہی ہیں۔ تم اپنی بدگمانیاں چھوڑو اور مجھے سونے دو۔ صبح مجھے جلدی فیکٹری کے لیے نکلنا ہے۔'' حماد نے بیزاری سے کہتے ہوئے دوبارہ لیٹ کر لائٹ آف کرنے کا اشارہ کیا۔

شمسہ نے خفگی سے دیکھتے ہوئے اٹھ کر لائٹ آف کی۔ حماد کا ایسا رویہ، اسے اکثر زچ کر دیتا تھا مگر حماد سے الجھنے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔

☆......☆

نادیہ، پیر شاہ کے آنے کی خبر سنتے ہی ان سے ملنے انیکسی میں چلی آئی۔ پیر شاہ، اپنے مخصوص سفید چوغے میں ملبوس گدی پر نشست جمائے موٹے دانوں والی تسبیح ہاتھ میں لیے وِرد میں مشغول تھے۔ نادیہ کو دیکھے بغیر دوسرے ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نادیہ کچھ دیر سر جھکائے عجیب سی سوچوں میں گھری

رہی۔ یہاں کی فضا بے حد بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے حالات مزید الجھتے ہوئے لگ رہے تھے۔ اپنے ساتھ ہوئے واقعے کے بعد سے وہ بے اختیار سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ ایسا پہلے کیوں نہیں ہوا تھا اگر کوئی اس کے اور اس کے گھر کے پیچھے تھا تو وہ پہلے محسوس کیوں نہیں کر سکی تھی۔ اب اچانک ظاہر ہونے والی علامتیں اور شہادتیں اسے خسارے کا احساس تو دلا رہی تھیں مگر الجھا بھی رہی تھیں۔ وہ اپنی الجھنوں میں تھی کہ پیر شاہ نے اسے چونکا دیا۔

''وسوسے الجھنیں بڑھا دیتے ہیں بی بی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا، ہر عمل کے لیے یقین کی پختگی اور اعتماد کی مضبوطی ضروری ہے۔'' نادیہ نے چونک کر کچھ خوفزدہ ہوتے ہوئے سامنے دیکھا۔

پیر شاہ کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس کی سوچیں پڑھ رہے تھے۔ گویا وہ کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھی اور وہ ان ہی پر شک کر رہی تھی۔ بنا کہے، بتائے، سنے بغیر جو شخص اس کی سوچیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ اس کے گھر پر منڈلاتی بلاؤں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ نادیہ کا یقین ڈولتے ڈولتے سنبھل سا گیا۔

''نہ......نہیں پیر شاہ صاحب! مجھے یقین ہے کہ آپ جو میرے لیے کر رہے ہیں، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ خدارا آپ میرا یقین ٹوٹنے مت دیجیے گا۔'' نادیہ بے اختیار ہو کر گڑگڑائی۔

''بی بی اپنا یقین تمہیں خود بچانا ہے۔ ہم تو تمہارے لیے آسانیاں ہی پیدا کر رہے ہیں تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔'' پیر شاہ نے اس بار آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نادیہ نظریں جھکا کر فوراً تائیداً بولی۔ ''جہ......ی......جی جی پیر صاحب۔ میں جانتی ہوں۔''

''بس پھر خود کو الجھنوں میں مت الجھاؤ۔ جیسا میں کہتا جاتا ہوں، کرتی جاؤ۔ تھوڑے نقصان سے گھبراؤ مت۔ اتنا تو برداشت کرنا پڑے گا تمہیں۔ اپنا فائدہ سوچو۔ زندگی بھر کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے نجات مل جائے گی۔'' نادیہ کو پیر شاہ کی باتیں متاثر کر رہی تھیں۔

''جہ......ی......جی آپ جیسا کہیں گے، میں کروں گی۔''

''چلہ پورے ہونے تک روز ایک بکرا ہدیہ دینا پڑے گا، ہمارے موکلوں کو اس کے خون سے حصار کھینچ کر ہی وہ عمل کریں گے۔''

''مم......مگر ہر روز...... میں کیسے؟ مم......مطلب ہے کہ......'' نادیہ، پیر شاہ کے مطالبے پر دل ہی دل میں پریشان ہوئی۔

روز کے پچیس تیس ہزار علاوہ ان کے کھانے پینے اور آنے جانے کے اخراجات کے لیے نکالنا بلکہ زرعام سے مانگنا کافی مشکل عمل تھا۔

''ہاں......ہاں میں جانتا ہوں تمہارے لیے یہ مہیا کرنا مشکل ہوگا۔ تم بے فکر رہو۔ تمہاری مدد کے لیے ماسی بھی ہے اور فیقا بھی......وہ تمہاری مدد کر دیں گے۔ تم بس انہیں پیسے مہیا کر دینا، باقی سامان وہ ہمیں خود ہی پہنچا دیں گے۔'' پیر شاہ کا انداز ایسا تھا، جیسے انہوں نے معمولی شے طلب کی ہو۔

نادیہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا بس وہ خاموش رہی۔ ''تم اب جاؤ اور آج رات بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ کل کی رات تمہیں جاگنا ہے۔'' نادیہ سر ہلا کر وہاں سے آ گئی۔

☆......☆

زرغام بخاری، اپنے پرانے معمول کے مطابق نادیہ کے ساتھ رات کے کھانے پر ڈائننگ روم میں موجود تھا۔اس کا رویہ بھی نارمل تھا اور بات چیت بھی وہ اپنے مخصوص انداز سے کر رہا تھا۔ نادیہ کو اپنی بات کہنے کا یہی موقع غنیمت لگ رہا تھا۔ کھانے کے درمیان ہی اس نے زرغام کو مخاطب کیا۔

''زرغام، مجھے اس ماہ Extra Amount چاہیے۔'' بات کرتے ہوئے نادیہ نے نظریں چرائیں۔

''ہوں کتنا Amount چاہیے۔'' زرغام نے نوالہ نگلنے کے بعد سرسری انداز میں پوچھا۔ نادیہ پر نظریں یکدم ٹھہر گئیں۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''وہ دراصل بچوں کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہونے ہیں تو......''

''ٹھیک ہے بھئی۔ میں چیک لکھ دوں گا یا پھر ایسا کرنا کہ بل مجھے دے دینا۔ میں خود ہی Pay کر دوں گا۔'' زرغام نے اپنی توجہ دوبارہ کھانے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

نادیہ فوراً گڑبڑا کر بولی۔ ''نہ......نہیں فیس تو پہلے ہی Pay کرنا ہوگی نا اور تمہارے پاس ٹائم ہی کب ہوگا کہ ہمارے ساتھ چلو۔''

''او کے! صبح میں چیک دے جاؤں گا۔'' زرغام نے کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ زرغام مجھے چند ہزار نہیں کچھ زیادہ پیسے چاہئیں۔'' نادیہ اس کے اٹھتے ہی بولی۔

''کتنے زیادہ؟ کیا تمہارے Account میں کچھ نہیں ہے؟'' زرغام کی حیرت بجا تھی۔

نادیہ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ہر ماہ لگی بندھی رقم وہ جمع کرواتا تھا۔

''میرے پاس ہوتے تو کیا میں تم سے مانگتی؟ اور اب کیا تم مجھ سے حساب کتاب کرو گے۔'' نادیہ یکدم بگڑ کر خود بھی کھڑی ہوگئی۔

زرغام مزید حیران ہوا۔ ''میں تم سے کب حساب کتاب کر رہا ہوں۔ میں نے تم سے صرف پوچھا ہے۔''

''تم......تمہارا انداز صرف پوچھنے والا نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے ضرورت ہے اسی لیے میں نے تم سے مانگے ہیں۔ مجھے پچاس ساٹھ ہزار نہیں ڈھائی تین لاکھ چاہئیں فی الحال۔'' نادیہ اس کی نرمی پر مزید تنک کر بولی۔

زرغام کے سوال جواب سے بچنے کے لیے، اس نے یہ رویہ اپنایا تھا۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے تمہاری ضرورت میں تمہیں پھر سمجھا رہا ہوں نادیہ، میری دولت اور اپنا وقت ان فضول قسم کے چکروں میں پڑ کر ضائع مت کرو۔ بعد میں بہت مشکل ہوگی۔'' زرغام نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

نادیہ نے خاصی ناراضگی سے کہا۔ ''میں کسی فضول چکر میں نہیں پڑی اور نہ ہی ہمارا وقت اور پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔ اپنے گھر اور اولاد پر تو انسان سب کچھ قربان کر دیتا ہے، زرغام۔ تم چند لاکھ کے لیے، مجھے باتیں سنا رہے ہو۔'' نادیہ خفگی سے بولتی بولتی آبدیدہ ہوگئی۔

زرغام نے اس کی طرف دیکھا اور پھر زچ ہو کر بولا۔ ''بات چند لاکھ کی نہیں ہے۔ بات تو خود کو تو ہمات سے بچانے کی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی، تم ان خرافات میں کیوں پڑ گئی ہو۔ تم تو کہتی تھیں۔''

''بس زرغام پلیز، مزید کچھ مت کہو۔ تمہاری ان ہی باتوں سے ہم سب پھر کسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں پیسے نہیں دینے تو مت دو۔ میں اپنے کچھ زیور بیچ دوں گی۔'' نادیہ کے انداز و لہجے میں کچھ خوف بھی تھا جو

زرغام کو برہم کر رہا تھا۔

''خبردار! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ صبح تمہیں پیسے مل جائیں گے مگر یہ Last Time ہوگا۔'' زرغام برہمی سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

نادیہ کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ زرغام اسے پیسے دے دے گا اس کی فکر و پریشانی دور ہوگئی تھی۔

☆......☆

اُسود علی نے گاڑی سے اتر کر اپنا سامان ٹرالی میں رکھا اور ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ نائلہ اپنے ...وس تیز میک اپ اور گہرے جامنی، جدید طرز کے سوٹ میں اس کے ہمراہ تیز تیز قدم اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسود کے چہرے پر پھیلی بیزاری اور کوفت نائلہ کے ساتھ کی وجہ سے تھی۔ صبح صبح نائلہ کا یہ حلیہ اور انداز اسے ناگوار و ناخوشگوار لگ رہا تھا۔ جبکہ نائلہ کے چہرے پر خوشی کی نئی چمک اور مسکراہٹ جیسے چپک سی گئی تھی۔ وہ یقیناً اُسود علی کے ہمراہ جانے پر خوش بھی تھی اور اترا بھی رہی تھی۔

ڈیپارچر کے وقت سنگاپور کے بجائے دبئی جانے والے جہاز میں بیٹھنے کے بعد نائلہ جیسے کسی خواب سے جاگی۔ جہاز رن وے پر تھا۔ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ نائلہ حفاظتی پٹی باندھنے کے بجائے اُسود سے الجھ رہی تھی۔

''تو......تم مجھے دبئی چھوڑنے جا رہے ہو؟ سنگاپور نہیں لے جا رہے؟''

ہاں میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا، اسی لیے تمہیں تمہارے بھائیوں کے پاس چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم اپنی شاپنگ کا شوق وہاں زیادہ اچھی طرح پورا کر سکتی ہو۔'' اُسود کا لہجہ و انداز سنجیدہ و سپاٹ تھا۔

وہ تلملا اٹھی۔ ''تم...... مجھے دھوکے سے لائے ہو؟ تمہیں معلوم ہے نا پھوپو کو پتا چلے گا تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گی۔''

''جانتا ہوں تمہیں بھی اور تمہاری پھوپو کو بھی۔ تم دونوں کے لیے صرف اپنی ذات اور اپنا مفاد مقدم ہے۔ ...الی دنیا جائے جہنم میں۔'' اُسود کے دھیمے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

ایئر ہوسٹس نے آ کر نائلہ کو حفاظتی بیلٹ باندھنے کی ہدایت دی۔ وہ تلملاتی ہوئی بیلٹ باندھنے لگی۔

ایئر ہوسٹس کے جاتے ہی اسی تلملاہٹ سے بولی۔ ''تم نے یہ اچھا نہیں کیا اُسود علی۔''

''تمیز سے بیٹھو، شکر کرو تمہیں چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں اکیلے بھی روانہ کر سکتا تھا۔'' اُسود نے سنجیدگی سے بات کی۔

''شکر تو اب تم منانا اگر پھوپو کے ہاتھوں سے بچ گئے تو......'' نائلہ نے اسے ایک بار پھر دھمکایا۔

''نائلہ بیگم، تمہاری پھوپو سے ڈرنے کا زمانہ چلا گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اب خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ ورنہ مجھے ...ٹ بدلنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔'' اُسود نے اس کی بلند ہوتی آواز پر احتجاجاً خفگی دکھائی۔

نائلہ کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ اس وقت جہاز میں ایک ہنگامہ کر دے مگر اُسود کے سنجیدہ و برہم تیوروں نے ...ے خوفزدہ بھی کر دیا تھا۔ وہ اس کے کسی سنگین ردعمل سے خوفزدہ رہتی تھی۔ اسی لیے رخ موڑ کر مجبوراً میگزین ...دیکھنے لگی۔ اندر ہی اندر کئی منصوبے، کئی حربے کلبلا رہے تھے۔ جنہیں دبئی پہنچنے کے بعد ہی وہ عملی جامہ ...نا تھی۔ اُسود نے اس کی خاموشی کو غنیمت جان کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆

(جاری ہے)

مکمل ناول

سلمیٰ یونس

چور دروازے

جب گھر سے چلا تھا تو باوجود اس کے، میں مومنہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں، یہ فیصلہ کر کے گیا تھا کہ تمہارے لیے، اپنی زندگی اور ہو سکا تو اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کروں گا مگر یہ تب ممکن تھا جب تم اس گھر میں بیوی بن کر آتیں مگر....

حالات کی ستم ظریفی کے شکار معاشرے کی ایک تصویر، مکمل ناول کی صورت

شرافت علی نے اس بارے میں سوچا تھا اور یہی رسک لینے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سال وہ سب سے بڑے کانٹریکٹ کے لیے کوشش کریں گے اور یہ ذمہ داری اریشہ کو دی گئی تھی۔

اریشہ نے دن رات محنت کی تھی مگر جب وہ پریزنٹیشن کے لیے آئی تو لفٹ میں اس کا سامنا زینل ملک سے ہوگیا۔ اریشہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے شناسائی جاگی مگر پھر وہی سکوت جبکہ اریشہ کو اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے زینل ملک کو دیکھتے ہی نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

اریشہ کو یہ بات پتا چل گئی تھی کہ یہ کانٹریکٹ ہر سال زینل ملک کی کمپنی کو ہی ملتا تھا۔ اس وجہ سے وہ تھوڑی مایوس دکھائی دے رہی تھی اور جب واقعی یہ کانٹریکٹ بھی زینل ملک کی کمپنی کو گیا تو اس کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

زینل ملک کو سبھی مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔ چند لمحے وہ وہاں رک کر آگے بڑھنے لگی تبھی پیچھے سے کسی نے اسے پکارا۔ اریشہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں زینل ملک موجود تھا۔ وہ اسی دن کی طرح بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اریشہ رک گئی تو وہ اس کے قریب چلا آیا۔

''آپ مجھے مبارک باد نہیں دیں گی؟'' وہ نرمی سے بولا۔

''نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے گویا ہوئی۔

''صرف اس لیے کہ میں نے آپ کو جاب نہیں دی۔'' اس نے اپنے تئیں قیاس کیا۔

''اس لیے کہ مجھے آپ کی اس کامیابی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی اور خوش نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر آج آپ یہاں نہ ہوتے تو یہ کانٹریکٹ ہماری کمپنی کو ملتا۔''

زینل ملک کو اس کی بچکانہ سی سوچ پر ہنسی آ گئی مگر اس نے جلدی سے اپنی مسکراہٹ سنجیدگی کے پردے میں چھپالی اور وہ گویا ہوا۔ ''یہ میری وجہ سے ہمیں نہیں ملا' اس میں میری کمپنی کے لوگوں کی محنت شامل ہے۔ دُعائیں شامل ہیں۔''

''ویسے آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ محنت اور دُعاؤں کا مطلب سمجھتے ہیں۔'' وہ اب تک شاکی تھی۔

''مطلب؟'' زینل کو واقعی اُس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''اونچی کرسی پر بیٹھا ایک بااختیار شخص جو ایک انسان کی پرابلم نہیں سمجھ سکتا' وہ بھلا محنت کی حقیقت اور دُعاؤں کے پس پردہ پوشیدہ خلوص کو کیسے سمجھ سکتا ہے اور اگر سمجھ بھی جائے تو اس کی قدر نہیں کرسکتا۔'' وہ اس سے سخت بدگمان تھی۔

''آپ کا تعلق بھی تو ایک اونچے گھرانے سے ہے' اسی حساب سے یہ فردِ جرم آپ پر بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ ان چیزوں کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''میں اختیارات کی بات کر رہی ہوں۔ کچھ لوگوں کے پاس دوسروں کی زندگی کے فیصلوں تک کا اختیار ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کے پاس اپنی مرضی سے سانس لینے کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔'' کوئی اَن دیکھا دکھ اس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگا تھا' اس لیے وہ مزید وہاں نہیں رکی۔ زینل کو اس کی باتیں اور اچانک آنکھوں میں آ جانے والی نمی سمجھ نہیں آئی تھی۔ بہرحال وہ شانے اچکا کر واپس اپنے کمرے کی جانب پلٹ گیا۔

☆.....☆

اریشہ جس ٹیکسی میں بیٹھی تھی' اس ٹیکسی والے سے سڑک پار کرتے ایک بندے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا

تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگنا چاہتا تھا مگر اریشہ نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے اس لڑکے کو ہاسپٹل نہ پہنچایا تو وہ پولیس کو بتا دے گی کہ یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ ڈرائیور ڈر گیا اور اس لڑکے کو ہاسپٹل پہنچا دیا۔

وہ کاریڈور میں ٹہل رہی تھی تبھی ڈاکٹر نے آ کر اس لڑکے کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔ وہ فوراً اندر پہنچی تھی۔ وہ ہوش میں تھا البتہ سر پر چوٹ تھی۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اس کی بروقت مدد کرنے والی ایک لڑکی تھی، اس لیے وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"میری دوبارہ زندگی خدا کے بعد آپ کا ہی تحفہ ہے نا۔" وہ مسکرایا۔

"اب آپ کیسے ہیں؟" وہ جواباً ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ٹھیک ہوں، تھینکس ٹو یو۔" وہ ممنونیت سے بولا۔

"میرا نام اریشہ ہے۔" وہ موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔

"مجھے حامد کہتے ہیں۔" اس نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔" اریشہ سادہ انداز میں بولی۔

"سیم ہیئر....." حامد نے بھی اسی انداز میں کہا' تب اریشہ کی مسکراہٹ بڑھ گئی۔

☆.....☆

جب تک مومنہ چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کے ساتھ کام کرتی رہی' یہ بات صیغۂ راز میں رہی مگر اب جب سے اس نے بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیز کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا تو اب یہ بات چھپ نہ سکی تھی۔ آج تو وہ قیامت کا دن آ ہی گیا جس کی خبر مومنہ کو بھی تھی مگر باقی سب کو اس کا اندازہ بھی نہ تھا۔

مولوی صاحب سرِ شام گھر لوٹے تو پاکیزہ اور خدیجہ بیگم رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ حامد کمرے میں بیٹھا تھا جبکہ مومنہ یونہی صحن میں ٹہل رہی تھی' تبھی انہوں نے آتے ہی چلانے والے انداز میں خدیجہ بیگم کو پکارا۔ وہ گھبرا کر باہر آئیں تو مولوی شمس الدین نے میگزین اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ دیکھو' تمہاری بیٹی مومنہ زمانے بھر میں کیا کرتی پھر رہی ہے۔ باپ دادا کا نام یوں روشن کر رہی ہے۔" وہ شدید غصے میں تھے۔

پاکیزہ کچن اور حامد کمرے سے باہر آ گئے۔ خدیجہ بیگم نے رسالہ کھول کر دیکھا تو صدمے سے دل ہی پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اپنی بیٹی کو ادھ ننگی تصاویر میں دیکھ کر انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا' سبھی گھبرا گئے۔

پاکیزہ اور حامد نے بڑھ کر خدیجہ بیگم کو تھام لیا۔ مومنہ جونہی آگے بڑھی' مولوی شمس الدین نے اسے روک دیا۔

"اتنی گھٹیا حرکت کرنے کے بعد بھی رشتوں پر اپنا حق جتا رہی ہو؟" وہ حقارت سے بولے۔

"آپ نے ساری زندگی ہمیں جینے کے حق سے محروم رکھا' اب کیا رشتوں سے بھی محروم کر دیں گے؟" وہ بے خوف ہو کر بولی۔

"میرا دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں زندگی سے ہی محروم کر دوں مگر میں تمہیں مار کر گناہ نہیں کمانا چاہتا۔"

"ایک بار جان لے لینا اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کے احساسات' خواہشات اور عزتِ نفس کا قتل کرتے چلے جائیں۔ سنا ہے کہ عبادت انسان میں عاجزی پیدا کرتی ہے۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرتی ہے مگر آپ کو اپنی عبادت پر غرور ہے' وہ بھی اس قدر کہ جس نے آپ کو منافق بنا دیا۔ آپ نے تو کبھی ہمیں انسان ہی نہیں سمجھا۔"

وہ جیسے سب کچھ اگل دینا چاہتی تھی۔

''بکواس بند کرو......'' وہ دہاڑے مگر وہ اب بھی بول رہی تھی۔

''بیٹی کو رحمت کہنے والے آپ جیسے لوگ اپنی بیٹیوں کو بھیڑ بکری سمجھتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی مثال مدیحہ آپا ہیں۔ آپ بڑی گناہ و ثواب کی باتیں کرتے ہیں نا تو بتایئے کہ کسی پر جھوٹا بدکرداری کا الزام لگانا کیا گناہ نہیں ہے؟ دوسروں کو نیچا دکھانے کی خاطر اپنی اولاد کی ہر خواہش کو قدموں تلے روند دینا، کیا بڑے ثواب کا کام ہے؟ آپ ساری عمر حسد کی آگ میں جلے اور ہمیں بھی جلاتے رہے ہیں۔'' آج وہ جیسے سارا زہر اگل رہی تھی۔

حامد ٹیکسی لے آیا تھا اور فوری طور سے خدیجہ بیگم کو ہاسپٹل لے گیا۔

''تمہاری کسی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ اگر آئندہ ماڈلنگ کی تو جان سے مارنے سے پہلے گناہ اور ثواب کے بارے میں بھی نہیں سوچوں گا کیونکہ مجھے اپنی عزت سب سے زیادہ پیاری ہے۔'' ان کا انداز دھمکانے والا تھا۔ اس مرتبہ مومنہ خاموش رہی تو وہ بھی نکل کر چلے گئے۔

''مومنہ! تم سامان کیوں پیک کر رہی ہو؟'' پاکیزہ نے اسے یوں تمام چیزیں بیگ میں ڈالتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

''میں گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو! ایسی باتوں پر کوئی اپنا گھر چھوڑ کر جاتا ہے۔'' پاکیزہ نے جلدی سے کہا۔

''یہ گھر نہیں' قید خانہ ہے اور یہاں رہ کر میں عمر قید نہیں کاٹ سکتی۔'' وہ سخت بے زار تھی۔

''اتنی رات کو کہاں جاؤ گی؟'' پاکیزہ پریشان ہوگئی۔

''کہیں بھی مگر اب میں یہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔'' وہ چیزیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

''مومنہ! پہلے تم نے جو کیا' وہ کم ہے جو اب اس طرح گھر چھوڑ کر ابا کو لوگوں کی نظروں میں گرانا چاہتی ہو۔ کیا والدین اسی دن کے لیے اولاد کو محبت سے پروان چڑھاتے ہیں کہ ایک دن وہ انہیں ذلت کی کھائی میں دھکیل کر آگے بڑھ جائے۔ اُن کے دامن میں اندھیرے ڈال کر روشنیوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہو۔ کیا تمہاری خواہشات اور عزتِ نفس کی قیمت والدین کی رسوائی ہے۔'' وہ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔

''ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے' ببول بو کر گلاب کی آرزو کرنا حماقت ہے۔ آج اگر میں نے چور دروازوں کا انتخاب کیا تو اس کی وجہ ہمارے والد محترم ہی ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ میں انسان بن کر جینا چاہتی ہوں' کٹھ پتلی بن کر نہیں، اس لیے میں جا رہی ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''تم پچھتاؤ گی مومنہ......!'' پاکیزہ نے اسے احساس دلایا۔

''میری ساری عمر کے لیے یہ پچھتاوا کافی ہے کہ میں اس گھر میں پیدا ہوئی اور اس سے بڑا اور کوئی پچھتاوا نہیں ہو سکتا۔'' مومنہ نے اتنا کہا اور موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''پاکیزہ' ابھی ابھی امی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے' کیا اُن کی خاطر بھی نہیں رکو گی؟'' وہ پھر سے منت کرنے لگی۔

''میں جہاں بھی رہوں گی' امی کے لیے دُعا کروں گی۔''

پاکیزہ خاموش ہوگئی۔

پھر جانے اس نے کس کو فون کیا اور تھوڑی دیر بعد چمکتی گاڑی میں ایک لڑکا آیا اور وہ چلی گئی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ پاکیزہ روتی رہ گئی۔ سارے محلے والوں نے یہ تماشا دیکھا تھا۔

☆......☆

یہ رات بڑی بھاری تھی۔ خدیجہ بیگم ہاسپٹل میں تھیں' مومنہ اُن کے سر پر خاک ڈال کر جا چکی تھی۔ پاکیزہ کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ ہر ہر آہٹ پر چونک رہی تھی۔ دروازہ تسلسل سے بج رہا تھا۔ پاکیزہ خوفزدہ نظروں سے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی' یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے دروازہ کھولا تو پھر کوئی نئی آفت اندر چلی آئے گی۔

بڑی مشکل سے اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے طیبہ بیگم' ارسل' ندا بیگم اور محمود سبھی موجود تھے۔ پاکیزہ بے اختیار طیبہ بیگم سے لپٹ کر رو دی۔

''دادی' مومنہ چلی گئی۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''کہاں چلی گئی؟'' ارسل نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''پتا نہیں' پر وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔'' اس انکشاف پر ارسل سمیت سبھی حیران تھے۔

انہیں تو حامد نے فون کر کے صرف اتنا بتایا تھا کہ خدیجہ بیگم کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ اور مولوی شمس الدین ہاسپٹل میں ہیں جبکہ مومنہ اور پاکیزہ گھر پر اکیلی ہیں۔ اس وقت دادی یا کسی اور عورت کا ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے مگر یہاں آ کر پتا چلا کہ اصل قیامت تو اب آئی ہے۔

''ندا' تم اور ارسل یہیں رہو' میں اور محمود ذرا ہاسپٹل جائیں گے۔'' طیبہ بیگم بولیں۔

''دادی' میں بھی چلوں؟'' ارسل جلدی سے بولا۔

''نہیں......تم ان لوگوں کے ساتھ رہو۔ کوئی پرابلم بھی ہو سکتی ہے۔'' محمود صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے پاپا! بٹ پلیز' وہاں پہنچتے ہی مجھے وہاں کے حالات سے آگاہ کیجیے گا۔ مجھے بہت فکر ہو رہی ہے۔'' ارسل نے کہا۔

''ہاں ضرور۔'' محمود صاحب اتنا کہہ کر دروازے کی سمت بڑھے۔ طیبہ بیگم نے اُن کی تقلید کی۔ پاکیزہ اب بھی ندا بیگم کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

''ماما! پلیز' اسے خاموش کرائیں' رو رو کر یہ اپنی طبیعت خراب کر لے گی اور میرا خیال ہے کہ اس نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔'' اس نے قیاس کیا' تب پاکیزہ نے ندا بیگم کی گود سے سر اٹھایا اور ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''نہیں ارسل بھائی' مجھے کچھ نہیں کھانا' بس پلیز' آپ مومنہ کو ڈھونڈ لائیں۔ اگر ابا کو پتا چل گیا تو انہیں بہت دکھ ہوگا اور امی یہ دکھ برداشت نہیں کر سکیں گی۔'' اس کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے' تب وہ نرمی سے بولا۔

''فکر مت کرو پری' میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تم خود کو سنبھالو۔ تمہیں اس طرح سے' اس حال میں دیکھتا رہوں گا تو مجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔'' وہ محبت اور دکھ سے گویا ہوا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے رخساروں پہ بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا' یہ بتاؤ کہ تم اس کی سہیلیوں کو جانتی ہو اور جب وہ یہاں سے گئی تو اکیلی گئی یا کسی کے ساتھ؟ مطلب' اس کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی تھی؟''

''نہیں' وہ اکیلی ہی گئی تھی۔'' پاکیزہ نظریں

جزا کر بولی۔ وہ ہرگز یہ بتا کر کہ مومنہ ایک لڑکے کے ساتھ گئی ہے' اسے ارسل کی نظروں سے نہیں گرانا چاہتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ اگر ارسل کو یہ بات پتا چلی تو وہ کہیں مومنہ سے خفا نہ ہو جائے۔ اس کے خیال میں ارسل' مومنہ کے واپس لوٹنے کی وجہ بن سکتا تھا۔ وہ ان سب کے لیے ایک امید تھا اور امید کے اس دِیے کو وہ اپنے ہاتھوں سے نہیں بجھا سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے' اس کی سہیلیوں کے نمبرز یا ایڈریس جو بھی ہیں' لاؤ' میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

☆.....☆

اریشہ آفس پہنچی تو شرافت علی نے اسے بلا بھیجا۔ وہ بتاتا خیر کے اُن کے آفس میں چلی آئی۔

''سر' آپ نے بلایا تھا؟''

''بیٹھیے۔'' وہ نرمی سے بولے۔ اریشہ بیٹھ گئی۔ اب وہ شرافت علی کے بولنے کی منتظر تھی۔

''زنیل ملک اپنا نیا گھر بنوا رہے ہیں اور انہیں ہماری کمپنی سے انٹیریئر ڈیزائنر چاہیے۔'' ان کی اطلاع نے اریشہ کو چونکا دیا۔

''مگر اُن کی کمپنی میں تو خود بہت اچھے انٹیریئر ڈیزائنر موجود ہیں اور اگر وہ چاہیں تو باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں پھر یہاں سے ڈیزائنر منگوانے کا ریزن کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سوال تو میں نے بھی اُن سے کیا تھا' بٹ' انہوں نے کہا کہ اس کا جواب وہ آپ کو دیں گے۔'' شرافت علی نے وضاحت پیش کی۔

''جب میں اس کمپنی کی میں ہوں تو میں زنیل ملک کے لیے کام کیوں کروں گی؟'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''آپ انفرادی طور پر کام نہیں کریں گی بلکہ آپ کا ہر کام کمپنی کے کاموں میں ہی کاؤنٹ ہوگا۔'' اُن کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

''او کے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''مس اریشہ' آپ یوں کیجیے گا کہ آج تین بجے زنیل ملک سے اُن کے آفس میں مل لیجیے گا۔'' انہوں نے تاکید کی۔

''او کے سر۔'' وہ اتنا کہہ کر اپنی سیٹ پر آ گئی۔

ماہین اور عمیرہ بھی وہیں موجود تھیں۔ تینوں اس وقت ایک ہی پروجیکٹ پر کام کر رہی تھیں' اسی کو ڈسکس کرنے کے لیے اریشہ کی منتظر بیٹھی تھیں۔ اُس کا موڈ خراب دیکھ کر ماہین بولی۔

''کیا ہوا؟ یہ چہرے پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے اریشہ کو دیکھا۔

اریشہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عمیرہ بول پڑی۔ ''اس کا پرابلم تو زنیل ملک ہی ہو سکتا ہے۔ خاصا ڈینگ بندہ ہے۔ پتا نہیں اس نے اس سے کیا دشمنی ڈال رکھی ہے؟'' عمیرہ پریشان تھی۔

''ڈینگ ہونا کیا اتنی بڑی خوبی ہے جو انسان کی تمام خامیوں کو کور کر سکتی ہے؟'' اریشہ نے پلٹ کر سوال کیا۔

''یار' تم بہت بدگمان لڑکی ہو۔'' ماہین نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''زنیل ملک کے متعلق میں جو بھی کہتی ہوں' یقین سے کہتی ہوں۔ اس کا اندازہ تم لوگوں کو جلد ہو جائے گا۔ آج اس کے مزید خوبصورت اور قیمتی خیالات کا اظہار سننے جا رہی ہوں۔'' وہ چبا چبا کر بولی۔

اس کے انداز پر عمیرہ کو ہنسی آ گئی۔ اریشہ ان دونوں کو گھور کر رہ گئی۔

☆.....☆

خدیجہ بیگم ٹھیک تھیں مگر ڈاکٹر نے انہیں دو دن

بعد ڈسچارج کرنے کا کہا تھا۔ طیبہ بیگم اور محمود کو دیکھ کر خدیجہ تو خوش ہو گئیں مگر مولوی شمس الدین کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آج بھی ان لوگوں کے لیے نفرت تھی۔ وہ مسجد کے کام سے گھر لوٹے تو وہاں ارسل اور ندا بیگم کو دیکھ کر اُن کے چہرے کے خدوخال میں ناگواریت سمٹ آئی۔

آدھے ہاسپٹل میں رشتہ جتانے پہنچ گئے اور باقی میرے گھر پر قبضہ کرنے کے ارادے سے یہاں جمے بیٹھے ہیں۔'' وہ بولے تو لہجے میں شک تھا۔

''ہم یہاں آئے نہیں' بلائے گئے ہیں۔ ہمیں حامد نے فون کیا تھا۔'' ارسل سے رہا نہ گیا تو بول پڑا۔

''اسے بھی پوچھ لوں گا' فی الحال تم میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اس گھر میں میری معصوم اور شریف بیٹیاں رہتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہاری وجہ سے بدنام ہو جائیں۔'' لہجے میں حقارت تھی۔

''اب اس گھر میں آپ کی صرف ایک بیٹی موجود ہے۔ مومنہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' مولوی شمس الدین بھڑک اٹھے۔

''حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ چاہیں تو پاکیزہ سے تصدیق کر سکتے ہیں۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔

اب مولوی شمس الدین کی سوالیہ نظریں پاکیزہ پر ٹھہر گئیں اور اس کی رنگت زرد ہو گئی۔ اس کی خاموشی اور فق چہرہ مولوی شمس الدین کے لیے تصدیق تھا۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو لڑکھڑا سے گئے۔ ارسل سنبھالنے کو آگے بڑھا مگر اس سے قبل انہوں نے قریب پڑی کرسی تھام لی اور ارسل کو ایسی

زمرنعیم کا خوبصورت ناول
تیری چشم نم کی چاہ میں
قیمت -/500 روپے
نسیم نیازی کے ناول
دُکھ دریا کے بیچ
قیمت -/300 روپے
آؤ دل برباد کریں
قیمت -/300 روپے
خوبصورت سرورق بہترین طباعت
کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں
القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958

نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ’مجھے تمہاری مدد کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔‘ ارسل خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور ندا بیگم سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’ماما! چلیے‘ اب ہماری یہاں ضرورت نہیں ہے۔‘‘ ارسل کو غصہ آ رہا تھا۔ ندا بیگم نے بھی بیٹے کی تقلید کی‘ تب وہ مزید بولے۔

’’اور آئندہ یہاں آنے کی ضرورت کسی کو نہیں‘ یوں بھی مجھے اپنے گھر میں اجنبیوں کا داخلہ پسند نہیں ہے۔‘‘ وہ حقارت سے بولے۔

ارسل تیزی سے نکل گیا۔

پاکیزہ‘ ندا بیگم کو روکنا چاہتی تھی مگر مولوی شمس الدین کی تیز گھورتی نظروں میں تنبیہہ تھی، جس نے پاکیزہ کی زبان ساکت کر دی۔

☆......☆

’’ویلکم مس اریشہ!‘‘ زینل ملک نے اسے اپنے آفس میں پا کر خوش دلی سے کہا۔

وہ اس کے آفس میں موجود تھی جبکہ زینل ملک ابھی باہر سے کوئی میٹنگ اٹینڈ کر کے آیا تھا۔ اریشہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زینل نے اپنی سیٹ سنبھالی اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اریشہ کی نگاہیں لمحہ بھر کے لیے وال کلاک پر ٹھہریں، جو اس وقت ساڑھے تین بجا رہی تھی۔

’’تو سر آپ نے مجھے ٹھیک تین بجے کیوں بلایا؟‘‘ اس کا انداز بڑا جتانے والا تھا۔

’’آئی ایم سوری‘ میں کچھ لیٹ ہو گیا۔‘‘ زینل ملک کچھ شرمندہ سا تھا۔

’’میں نے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔‘‘ وہ لاپروائی سے بولی۔ چہرے پر حد درجہ معصومیت تھی۔

’’میں عمر میں آپ سے دس سال بڑا ہوں اور تجربے میں کہیں زیادہ، اس لیے بہت سی باتیں بنا کہے سمجھ جاتا ہوں۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولا۔

’’تو بنا بتائے، آپ لوگوں کی پرابلمز بھی سمجھ جاتے ہیں؟‘‘ وہ سابقہ انداز میں بولی۔

’’میں جانتا ہوں‘ میں نے اس دن آپ سے زیادتی کی تھی‘ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں‘ اس کے لیے، میں آپ سے معذرت بھی کر چکا ہوں مگر آپ نے شاید معاف کرنا نہیں سیکھا۔‘‘ زینل ملک نے ضبط سے جواب دیا تھا۔

’’زندگی میں بہت کچھ ایسا کر رہی ہوں جو کبھی سیکھا نہ تھا اور مجھ جیسی لڑکیاں جو اَپر کلاس سے تعلق رکھتی ہیں‘ کبھی وہ سب سیکھنے کا سوچتی بھی نہیں ہیں تو یقیناً معاف کرنا بھی سیکھ ہی جاؤں گی۔‘‘ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

’’آپ کیا پئیں گی؟‘‘ وہ نرمی سے بولا۔

’’نہیں‘ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے تھے بلکہ اِن فیکٹ‘ میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی تھی۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولی۔

’’یہی نا کہ میں نے اپنے کام کے لیے آپ کو کیوں چنا؟‘‘ وہ اس طرح بولا جیسے یہ بات اریشہ اس سے پہلے بھی کہہ چکی ہو۔

’’جی۔‘‘ اس نے اپنی حیرت ظاہر کیے بنا کہا۔

’’میں نے آپ کو خود کو پروف کرنے کا موقع نہ دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی‘ اس کا احساس مجھے آپ کے وہ پراجیکٹس دیکھ کر ہوا جو آپ نے شرافت علی کی کمپنی کے لیے کیے ہیں، اس لیے آپ کو یہ موقع دے کر میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ وہ صاف گوئی سے بولا۔

’’کیا یہ ضروری ہے کہ میں آپ کی آفر قبول کروں۔‘‘ اریشہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’آپ کے لیے تو پتا نہیں‘ بٹ‘ آپ کی کمپنی کے لیے ضرور Important ہے۔‘‘ وہ سنجیدہ تھا۔

’’اگر کمپنی کے لیے ضروری ہے تو او کے‘ میں تیار

ہوں۔‘‘ اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔

’’تھینکس۔‘‘ وہ ممنونیت سے بولا۔

☆......☆

انسان بڑی عجیب چیز ہے‘ نفرت ہو یا محبت‘ دونوں میں ہی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ مولوی شمس الدین بھی اپنی نفرت اور اپنے بھائی کو نیچا دکھانے کی خواہش میں ہر شے فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے ارسل کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی تھی جس میں پر یقین ہو کر لکھوایا کہ ارسل نے مومنہ کو اغوا کر لیا ہے اور اس کی وجہ خاندانی دشمنی ہے۔

ارسل اس وقت آفس میں تھا جب انسپکٹر داور اس سے ملنے آئے۔ اس نے ہاتھ ملانے کے بعد انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر متوجہ ہوا۔

’’جی فرمایئے‘ آپ کو مجھ سے اتنا ارجنٹ کیوں ملنا تھا؟‘‘ ارسل نے انسپکٹر داور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’آپ کے تایا جان نے آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔‘‘ انہوں نے اطلاع دی۔

’’کس سلسلے میں؟‘‘ ارسل کو سمجھ نہیں آئی۔

’’اُن کا کہنا ہے کہ آپ نے اپنی کزن مومنہ کا اغوا کیا ہے۔‘‘ انسپکٹر نے تفصیل بتائی۔

’’واٹ ربش...... میں ایسا کیوں کروں گا؟‘‘ اسے دھچکہ سا لگا۔

’’ان کا کہنا ہے کہ آپ نے خاندانی دشمنی کی وجہ سے یہ کیا ہے۔ آپ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب کے انکار پر آپ نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے نہیں کی تو نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔‘‘ انسپکٹر نے وہی سب من و عن بتایا جو مولوی شمس الدین نے اُن سے کہا تھا۔

’’دیکھیے انسپکٹر صاحب‘ یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنی کزن سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر یہ خواہش اب بھی مجھ تک ہی محدود ہے۔ میرے گھر والوں نے بھی اُن سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔‘‘ ارسل نے وضاحت دی۔

’’ہوسکتا ہے‘ آپ سچ کہہ رہے ہوں مگر جتنی قانونی کارروائی ضروری ہے‘ وہ تو ہمیں کرنی پڑے گی۔ مولوی صاحب ایک معتبر ہستی ہیں‘ اگر ہم نے فوری کارروائی نہ کی تو لوگ ہمارے خلاف بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ جن لوگوں کی بات پر لوگ آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں‘ غلط ہوں یا صحیح‘ ان کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ نہیں سوچتے۔ سو پلیز‘ ہماری پوزیشن سمجھیں اور ہمارے ساتھ چلیے۔‘‘

’’آپ کو جو پوچھنا ہے‘ آپ یہاں بھی پوچھ سکتے ہیں۔‘‘ ارسل نے نرمی سے کہا۔

’’مجھے احساس ہے کہ اس طرح ایک لڑکی کے اغوا میں آپ کا انوالو ہونا اور اس الزام کی تردید کے لیے پولیس اسٹیشن جانا آپ کے خاندان کی اچھی شہرت اور مارکیٹ میں آپ کی ریپوٹیشن کے لیے خطرناک ہے۔ بٹ آئی ایم ہیلپ لیس۔‘‘ وہ ذرا نادم تھا۔

’’ٹھیک ہے‘ چلیے۔‘‘ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور انسپکٹر داور کے پیچھے چل پڑا۔

اس کے تمام اسٹاف کے لوگ اسے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے‘ ارسل کو یقین تھا کہ اس واقعہ کے بعد وہ اس کی پہلے کی طرح عزت نہیں کر پائیں گے۔

☆......☆

’’ابا......! یہ آپ نے کیا کیا؟ ارسل کے اوپر اتنا بڑا الزام لگا دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بے گناہ ہے حالانکہ پاکیزہ بتا چکی ہے کہ مومنہ اپنی مرضی سے گئی ہے؟‘‘ حامد کو پتا چلا تو وہ بپھر گیا۔

''میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرے دشمن میرے گھر میں ہیں' بجائے یہ کہ باپ کا ساتھ دیں' غیروں کا ساتھ دے رہے ہیں؟'' مولوی صاحب تخت پر براجمان تھے اوراس وقت انہوں نے سامنے کھڑے حامد اور پاکیزہ اور دور کرسی پر بیٹھی خدیجہ بیگم کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ وہ غیر نہیں ہیں اور دوسری بات یہ کہ کسی کو غلط کرتے دیکھ کراسے روکنے کے بجائے بڑھاوا دینا دشمنی ہے اور ہم آپ سے دشمنی نہیں کرنا چاہتے۔'' حامد اس بار نرمی سے بولا۔

''مجرم کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔'' وہ اکڑ کر بولے۔

''اور ارسل کا جرم یقیناً یہی ہے کہ وہ محمود چچا کا بیٹا اور طیبہ دادی کا پوتا ہے۔'' حامد نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بکو مت اور خبردار جو میرے معاملات میں دخل اندازی کی کوشش بھی کی۔ بڑے آئے مجھے غلط اور صحیح کا سبق پڑھانے والے!!'' وہ حقارت سے بولے۔

''پاکیزہ اور خدیجہ بیگم بھی حامد کی ہم خیال تھیں مگر مولوی شمس الدین کے ڈر سے انہوں نے زبان تک نہیں کھولی البتہ حامد نے فیصلہ کرلیا تھا۔

☆......☆

''ساری زندگی میں نے بھائی صاحب کو عزت دی جس کا صلہ انہوں نے یہ دیا کہ میرے بیٹے کو زمانے بھر میں رسوا کردیا۔ اتنا گھناؤنا الزام لگا کر اسے ہر اپنے پرائے کی نظروں میں ذلیل کردیا۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں' نیکی کا بدلہ آج کے زمانے میں بدی ہی ہے۔'' محمود صاحب اس ساری سچویشن سے دلبرداشتہ تھے۔ اپنے بیٹے پر الزام لگنے کا دکھ تھا' جس کا اظہار وہ اپنی ماں' بیوی اور بیٹے کے سامنے کررہے تھے۔

''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شمس الدین نفرت میں حد سے گزر جائے گا اور تمہارے بیٹے کو بدنام کرنے کے لیے اپنی بیٹی کا نام استعمال کرے گا۔'' طیبہ بیگم حیران تھیں۔

''آج کے بعد میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے' اگر آپ ان سے کوئی رشتہ رکھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو پابند نہیں کروں گا مگر بہرحال میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔'' محمود' طیبہ بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ انہیں تو خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔

یہ سب کچھ جانے کیا ہوگیا تھا' وہ پریشان تھیں اس لیے کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ ندا خاموش تھیں۔ خاموش تو ارسل بھی تھا مگر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

کیا؟؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆

''حامد بھائی' آپ نے ارسل بھائی کی بروقت مدد کرکے' ان کی بے گناہی کی گواہی دے کر بہت اچھا کیا' ورنہ ایک گلٹ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا۔'' پاکیزہ خوش تھی۔ دونوں اس وقت حامد کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

''لیکن پتا ہے پری' ارسل بہت خفا لگ رہا تھا۔ اس نے شکریہ بھی بڑے روکھے سے انداز میں ادا کیا تھا۔'' حامد پریشان تھا۔

''بھائی......! جوان کے ساتھ ہوا ہے' اس کے بعد تو کوئی بھی انسلٹ محسوس کرے گا نا بلکہ بھائی......! میں تو سوچ رہی ہوں کہ ہم ارسل بھائی سمیت، سب لوگوں کا سامنا کیسے کریں گے؟'' پاکیزہ سوچ سوچ کر شرمندہ تھی۔

''پری......! کیوں نا' کل ہم چاچو کے گھر سے ہو آئیں' اپنی طرف سے معافی ہی مانگ لیں گے۔''

حامد نے آئیڈیا دیا۔

''ٹھیک تو ہے بھائی......! مگر ہم دونوں کا ایک ساتھ' ایک وقت پر جانا ناممکن ہے۔ ابا نے تو مجھے کالج جانے کے لیے بھی منع کردیا ہے۔'' وہ افسردہ تھی۔

''مگر تمہارے تو ایگزامز ہونے والے ہیں نا؟'' حامد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی بھائی......! مگر میں نے دانستہ کوئی احتجاج نہیں کیا ورنہ ابا سمجھتے کہ میں بھی باغی ہورہی ہوں اور یہ سوچ اُن کو تکلیف دیتی۔ میں اُن کی زندگی میں سے تکالیف اگر ختم نہیں کرسکتی تو انہیں مزید بڑھنے سے روک تو سکتی ہوں نا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کاش......مومنہ بھی اس طرح سوچتی مگر اس نے تو اتنی خود غرضی سے اپنے بارے میں فیصلہ کیا کہ سب کچھ بکھیر دیا۔'' حامد افسردہ ہوگیا تھا۔

''بھائی......! کیا آپ بھی ابا کی طرح مومنہ کو کبھی معاف نہیں کریں گے؟'' پاکیزہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ویسے میں شاہد سے بات کروں گا۔ وہ ابا کو اس بات کے لیے منالے گا کہ وہ تمہیں اپنی پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت دے دیں۔'' وہ شاید اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے موضوع بدل دیا۔ پاکیزہ خاموش ہوگئی تھی۔

☆......☆

زینل ملک کے محل جیسے گھر کو ڈیکوریٹ کرتے ہوئے وہ ذرا سا بھی نہیں گھبرائی۔ وہ دل وجان سے اس کے درودیوار کو سجانے میں مصروف تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے بالوں کو بے ترتیبی سے باندھے' گلے میں اسکارف لپیٹے گلاس پینٹنگ میں مصروف تھی۔ گلاس ڈور لکڑی کی لمبی اور چوڑی میز پر رکھا تھا۔

غزل

جو ساعتِ گذشتہ لوٹ آئے
تو آنکھوں میں وہ سپنا لوٹ آئے

یہاں پیاسوں کی حالت دیدنی ہے
دُعا مانگو کہ دریا لوٹ آئے

ہم اُس محفل میں تنہا ہی گئے تھے
عجب ہے کیا جو تنہا لوٹ آئے

سنائیں گے تمہیں شہرِ اَجل کی
اگر ہم لوگ زندہ لوٹ آئے

یہ ممکن ہے اسی جنگل میں کاشی
کسی دن شہر سارا لوٹ آئے

کاشی چوہان

زینل ملک آیا تو جانے کیوں وہ اس عجیب و غریب حلیے میں اسے بہت اچھی لگی۔اس کی موجودگی کا اریشہ کو احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ دھیرے سے آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا کام بے حد خوبصورت ہے۔" وہ بے اختیار کہہ اٹھا اور شناسا آواز پر اریشہ نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔

"ہیلو..... آپ یوں اچانک یہاں؟" وہ حیران تھی۔

"بس ایسے ہی جی چاہا کہ یہاں آؤں اور آ گیا۔ ویسے آج آپ اکیلی کام کر رہی ہیں۔ آپ کا گروپ نہیں ہے۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اریشہ کو دیکھا۔

"ہاں وہ لوگ شاپنگ کے لیے گئے ہیں۔ دو دن بعد ہماری فرینڈ کی منگنی ہے نا' اس لیے۔" اس نے بڑے مصروف سے انداز میں کہا۔

"تو آپ کو شاپنگ کا یا آؤٹنگ کا شوق نہیں ہے؟" وہ حیران تھا۔

"کبھی مجھے شاپنگ اور آؤٹنگ کے علاوہ کوئی کام بھی نہیں تھا مگر پھر زندگی میں اچانک اتنا کچھ ہو گیا کہ سب کچھ بدل گیا۔ خوشی کا احساس تو درکنار' اب تو کبھی کبھی زندہ ہونے کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ وہ کون سے حالات تھے کہ جنہوں نے آپ کو اتنا بدل دیا اور ظاہر ہے' مجھے یہ جاننے کا حق ہے بھی نہیں مگر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی میری زندگی میں بھی کچھ ایسا ہوا تھا جس نے میری زندگی' میری شخصیت اور میری دنیا ہی بدل دی مگر میں نے اس وقت بھی خود کو احساسات سے عاری نہیں ہونے دیا کیونکہ میرے خیال میں زندگی جینے کے لیے ایک احساس کا زندگی اور دل میں ہونا ضروری ہوتا ہے خواہ وہ احساس آپ کو خوشی دے یا اذیت۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"آپ کون سے احساس کے ساتھ جی رہے ہیں؟" اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"احساسِ نفرت....." وہ بولا تو اریشہ بری طرح چونکی۔

جواب اس کی سوچ اور توقع کے برعکس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کہے گا' احساسِ ذمہ داری مگر.....

"مجھے یہ تو نہیں پتا کہ آپ کو نفرت کیوں اور کس سے ہے مگر میں اس کیفیت سے گزری ہوں اور اسی لیے بتا سکتی ہوں کہ محبت کے حصار میں جینا جتنا آسان ہے' نفرت کے ساتھ جینا اتنا ہی مشکل۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کو نفرت کی آگ میں جلا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ درحقیقت اس آگ میں خود جل رہا ہوتا ہے۔ جب نفرت انسان کے احساسات پر حاوی ہو جاتی ہے تو وہ دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب کچھ ختم کر کے انسان کو خالی کر دیتی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میری اور آپ کی زندگی میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہوں....." وہ مسکرائی اور جانے کیوں زینل کو اس کی مسکراہٹ اچھی لگی۔

☆.....☆

اریشہ گھر میں داخل ہوئی تو لان میں علیشہ کو ٹہلتے پایا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟" اریشہ نے قریب آ کر سوال کیا۔

"پاپا آئے ہیں۔" اس نے اطلاع دی۔

"وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟" اریشہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔" وہ غصے

سے بولی۔

"کہاں ہیں وہ؟" اریشہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔" علیشہ سابقہ انداز میں بولی۔ اریشہ بنا کچھ کہے تیزی سے اندر کی جانب بڑھی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ کر دم لیا۔

باسط صاحب' معیز اور صالحہ کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے' اسے دیکھتے ہی باسط صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور محبت سے بولے۔ "ہیلو اریشہ' کیسی ہو؟"

"آپ لوگوں کی بے اعتنائیوں کے باوجود غیر متوقع طور پر زندہ اور خوش ہوں اور یقیناً ہم لوگوں کو اس طرح سے دیکھ کر آپ کو خوشی تو نہیں ہوئی ہوگی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"یہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو؟ مت بھولو' میں تمہارا باپ ہوں۔" وہ خفگی سے بولے۔

"بھولنے کی عادت آپ کو اور سمز سیمر کو ہے۔ ہمارا دکھ یہ ہے کہ ہم سے کچھ بھی بھلایا نہیں جا رہا۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

"میں تم لوگوں کو لینے آیا ہوں۔ آج کے بعد تم دونوں میرے ساتھ رہو گی۔" وہ حد درجہ نادم تھے۔

"مگر اب ہماری زندگی میں آپ لوگوں کی جگہ ہے نہ ضرورت' بالکل اسی طرح جس طرح کل آپ لوگوں کی زندگیوں میں ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلی تھی۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے' اگر تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو اس او کے میں تم لوگوں کو سپورٹ کرتا رہوں گا۔ تم جتنی رقم چاہو گی' تمہیں مل جائے گی۔" وہ معیز اور صالحہ کے سامنے اپنی انسلٹ نہیں کرانا چاہتے تھے اس لیے جلدی سے بات ختم کر دی۔

"ہمیں آپ کی چیزوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنا بوجھ خود اٹھانا ہم نے سیکھ لیا ہے۔" اس نے اتنا کہا اور جتنی تیزی سے آئی تھی' اتنی تیزی سے چلی گئی۔

"بہت ضدی لڑکی ہے....." باسط صاحب پریشانی سے بولے۔

"بیٹیاں اکثر ماؤں پر ہی جاتی ہیں۔" صالحہ نے لقمہ دے کر باسط صاحب کی شرمندگی کو اور ہوا دی تھی۔

☆.....☆

پاکیزہ رات کو کھانے کے برتن دھو رہی تھی تبھی حامد اس کے پاس چلا آیا۔

"ابا سو گئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پری' میں آج چچا جان کے گھر گیا تھا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟" وہ فکرمند ہو گئی۔

"باقی سب لوگوں نے تو ذرا سی ناراضگی کا اظہار بھی کیا مگر حیرت انگیز طور پر ارسل بالکل نارمل تھا۔ اِن فیکٹ' وہ تو سب کو سمجھا رہا تھا کہ اتنی بڑی بات نہیں کہ جس کو انا کا مسئلہ بنا لیا جائے۔" وہ حیران تھا۔

"ارسل بھائی کا دل بہت بڑا ہے اسی لیے تو اتنی بڑی بات پر بھی کسی منفی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔" پاکیزہ کی نظروں میں اس کی عزت اور بڑھ گئی مگر جانے کیوں حامد بہت پریشان تھا۔

☆.....☆

"اتنے دن ہو گئے ہمیں ملتے ہوئے یہاں تک کہ ہم اچھے دوست بھی بن گئے مگر شاید ابھی تک تم مجھے اتنا قابلِ بھروسہ نہیں سمجھتے کہ اپنی پریشانی مجھ

سے شیئر کرسکو۔'' اریشہ نے ریستوران میں اپنے سامنے بیٹھے حامد سے شکوہ کیا۔

''میں تم پر بہت بھروسہ کرتا ہوں اتنا کہ تمہارے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کرچکا ہوں مگر تمہاری زندگی میں کیا پہلے پرابلمز کم ہیں جو میں مزید تمہیں پریشان کروں۔ بہرحال اب تو بتا دیا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

''حیرت ہے' میرے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود' میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو؟'' وہ حقیقتاً حیران تھی۔

''مجھے ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں مگر میرے اور تمہارے درمیان جو طبقاتی فرق ہے' اس کو سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ تم تک کا یہ فاصلہ کبھی طے نہیں کر پاؤں گا۔'' حامد خوفزدہ تھا۔

''میں اپنے فیصلوں میں خودمختار ہوں مگر تمہاری جتنی مذہبی فیملی ہے' ہوسکتا ہے کہ ان کے لیے' مجھے میری سچائیوں کے ساتھ قبول کرنا مشکل یا شاید ناممکن ہو۔''

اتنی دیر میں ویٹر آیا' ان دونوں کے لیے کافی سرو کی اور چلا گیا۔

''میں انہیں منانے کی پوری کوشش کروں گا اگر وہ نہ مانے تو ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔'' حامد نے جیسے سب سوچ رکھا تھا۔

''ایک دم سے میرے لیے اتنا بڑا قدم اٹھالو گے؟'' وہ حیران تھی۔

''ہاں' کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟'' اس نے وضاحت کرتے کرتے سوال ہی کرڈالا۔

''نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''مطلب؟'' وہ بری طرح چونکا تھا۔

''میں محبت پر یقین نہیں رکھتی۔'' وہ اس قدر صاف گوئی سے بولی کہ گمان کا تو شائبہ تک نہ تھا۔

''پھر تم نے مجھ سے شادی کے لیے ہاں کیوں کہی؟'' اس کی حیرت کم نہیں ہورہی تھی۔

''شادی ایک حقیقت ہے جس سے انسان فرار اختیار نہیں کرسکتا پھر مجھے بھی تو زندگی میں ایسا انسان چاہیے جس کے ساتھ میں اپنی خوشیاں اور غم بانٹ سکوں اور اس پر مکمل بھروسہ کرسکوں۔'' وہ سچائی سے بولی۔

''ایک عمر بھر کا رشتہ نبھانے کے لیے کیا یہ کافی ہے؟'' حامد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرے لیے تو کافی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

حامد کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس بارے میں اور کیا کہے' سو کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

☆......☆

شاہد کے کہنے پر مولوی شمس الدین نے پاکیزہ کو کالج جانے کی اجازت دے دی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس گھرانے پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔

پاکیزہ صبح کی جو گئی تو شام تک نہیں لوٹی تھی۔ گھر کے سارے افراد دہشت زدہ تھے۔ وہ سبھی صحن میں بیٹھے تھے۔

''کہیں پاکیزہ بھی تو مومنہ کے نقشِ قدم پر نہیں چل پڑی؟'' خدیجہ بیگم خوفزدہ تھیں۔

''امی......! خدا کے واسطے' مومنہ اور پاکیزہ کا کیا مقابلہ۔ ہماری پاکیزہ بہت معصوم ہے۔'' حامد نے انہیں ٹوکا۔

''تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے۔ اب اس گھر میں کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔'' مولوی صاحب نے حقارت سے کہا۔

''ابا......! آپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' حامد کے لہجے میں تاسف تھا۔

''اب تو مجھے شک ہونے لگا ہے کہ تم سب میری اولاد ہی نہیں ہو۔ میرا بیٹا تو اگر کوئی ہے تو وہ صرف شاہد ہے۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح بڑے فخر سے شاہد کا نام لیا۔

''میں پاکیزہ کو تلاش کرنے جارہا ہوں۔ خدا کے واسطے' اس مرتبہ ارسل کے خلاف رپورٹ مت لکھوا آیئے گا۔'' حامد نے ناگواری سے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

''دیکھ رہی ہو تم؟ تمہاری ہر اولاد کی زبان گز گز بھر کی ہوگئی ہے۔''

خدیجہ بیگم نے جواباً کچھ نہیں کہا اور کہتیں بھی کیا' انہوں نے تو سرے سے مولوی صاحب کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ ان کا سارا دھیان پاکیزہ کی جانب تھا۔ ان کا دل بس اس کے خیریت سے لوٹ آنے کے لیے دُعاگو تھا۔

☆......☆

حامد نے بہت تلاش کیا مگر پاکیزہ نہیں ملی البتہ اس کی کالج کی ایک سہیلی جس سے حامد واقف تھا' اس نے بتایا کہ چھٹی کے وقت پاکیزہ ہنستی مسکراتی ایک بڑی سی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر گئی تھی۔

حامد اس کی بات سن کر الجھ گیا۔ کوئی کچھ بھی کہتا' وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھا کہ پاکیزہ اپنی مرضی سے یہ سب کرسکتی ہے مگر پھر اس کی سہیلی بھی تو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں جتنا آرہا تھا' اس سے یہ ظاہر تھا کہ اگر پاکیزہ کا اغوا بھی ہوا ہے تو وہ کوئی شناسا ہی تھا۔

وہ شناسا کون ہوسکتا تھا؟ اس کی کسی سہیلی کا بھائی؟ مگر اس کی تو تین ہی سہیلیاں تھیں' ایک اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی' دوسری کا کوئی بھائی نہیں تھا اور تیسری کا اگر کوئی بھائی تھا تو وہ معذور تھا اور اس کے پاس گاڑی چھوڑ' سائیکل بھی نہیں تھی۔ اب ان کے علاوہ اگر پاکیزہ کسی کے ساتھ جاسکتی تھی تو وہ ارسل ہی تھا مگر اُن کے گھرانے کی طرف سے جتنا کچھ ارسل کے ساتھ ہوچکا تھا' اس کے بعد تو حامد اس سے پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا' کجا اس پر شک کرنا......

☆......☆

رات ہورہی تھی' پاکیزہ اس فلیٹ کے فرش پر بیٹھی رورہی تھی۔ وہ کمرے میں آیا' اس کے ہاتھ میں شاپر تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا اور کرسی گھسیٹ کر اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''میں تمہارے لیے کھانا لایا ہوں' کھالو۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ پاکیزہ نے نگاہ اٹھا کر اسے نفرت سے دیکھا۔

''زہر لادیں مجھے......اب میرے لیے اس سے اچھا کچھ اور نہیں ہوسکتا......'' وہ پھنکاری۔

''اب ایسا بھی کچھ نہیں ہوا کہ تمہیں زہر کھانا پڑے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ارسل بھائی' آپ نے جس طرح سے مجھے دھوکہ دیا ہے' اس کے بعد تو میں کبھی بھی' کسی پر بھروسہ نہیں کرپاؤں گی۔ آپ نے مجھ سے کہا کہ دادی کی طبیعت خراب ہے اور وہ مجھے یاد کررہی ہیں اور یہاں لے آئے' کیوں؟؟ کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا؟'' وہ ہچکیوں سے رورہی تھی۔

''میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا مگر تمہیں یہاں لائے بنا مولوی صاحب کو یہ سبق کبھی نہیں دے سکتا تھا کہ عزت اگر ذلت میں بدل جائے تو ہوتا کیا ہے؟ مومنہ کا سارا الزام مجھ پر ڈال کر ذلت کے بجائے انہوں نے لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹیں مگر اب وہ کیا کریں گے؟ اب تمہارے غائب ہونے کا الزام کسے دیں گے؟ آج تمہیں صرف یہاں اس طرح موجود رہ کر تکلیف ہورہی ہے اور مجھے اس

وقت کتنی تکلیف ہوئی ہوگی جب تمہارے باپ نے مجھے میرے اسٹاف کے سامنے ذلیل کیا تھا۔ میرے درد، میرے کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو تم۔'' وہ غصے میں تھا۔

''آپ کو یہ سب یاد ہے مگر حامد بھائی نے آپ کے لیے جو کیا' اس کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟'' اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے ارسل کو دیکھا۔

''ہے مگر سب سے زیادہ اہمیت میرے لیے عزت کی ہے اور......''

''جو صرف آپ کی ہے اور دوسروں کی نہیں۔ ہے نا؟'' پاکیزہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے اسے ناگواری سے دیکھا۔

''بہرحال کھانا یہاں رکھا ہے' کھا لینا۔ مجھے کام ہے' میں بعد میں آؤں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز' مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں' کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔'' وہ ملتجی تھی۔

''لے جاؤں گا مگر پہلے اُن کے تڑپنے کا تماشا تو دیکھوں جو دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غرور سے اکڑی مولوی شمس الدین کی گردن کو جھکتے ہوئے تو دیکھوں جو دوسروں کو بے عزت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔'' اس کے اندر کوئی اور ہی نیا انسان بول رہا تھا۔

''آپ کو ابا کو اپنے سامنے جھکا کر خوشی ہوگی۔'' وہ حیران تھی۔

''تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟'' ارسل نارمل سے لہجے میں بولا۔

''حیرت سے زیادہ افسوس ہو رہا ہے۔ میں آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کی ذات کا کوئی پہلو اتنا تاریک بھی ہو سکتا ہے۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

''ابھی تو بہت کچھ ایسا ہونا باقی ہے جو تم جیسی لڑکی نہیں سوچ سکتی۔'' وہ اتنا کہہ کر چلا گیا۔

پاکیزہ اسے پکارتی رہ گئی مگر اسے نہ رکنا تھا، نہ رکا۔

وہ بے دم سی ہو کر واپس فرش پر بیٹھ گئی۔ اسے جانے کیوں بہت زیادہ ڈر لگ رہا تھا۔

☆......☆

''خوبصورت ہے' اچھی ہے مگر جانے کیوں بہت الجھی الجھی سی رہتی ہے؟ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں بہت سے راز دفن ہیں اور جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے عمران کہ میں وہ ہر راز جان لوں۔ اکثر جب وہ بات کرتی ہے تو گم صم سی ہو جاتی ہے اور ایسے میں اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ سے جاتے ہیں۔ اس وقت دل میں ایک خواہش جنم لیتی ہے کہ کاش میں اس ہر ایک وجہ کو ختم کر سکوں کہ جس نے اس کی مسکراہٹ چھین کر اس کی آنکھوں کو نمی دے دی ہے۔'' زینل ملک آج جانے کیوں بے اختیاری کے عالم میں اریشہ کے متعلق اتنا کچھ کہتا چلا گیا۔

عمران اسے چند لمحے بغور دیکھتا رہا پھر بولا۔

''زینل' تمہیں پھر سے محبت ہونے لگی ہے۔''

اس انکشاف پر زینل چونکا' عمران کے ڈرائنگ روم میں اے سی آن تھا مگر اس کے باوجود اس کو لمحہ بھر کے لیے یوں لگا، جیسے اس کا وجود آگ میں جھلس رہا ہو' چیخیں' سسکیاں اور بند ہوتی آنکھیں لمحہ بھر میں اسے گھیرنے لگیں۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

''نہیں' مجھے محبت نہیں ہو سکتی' کبھی بھی نہیں ہو سکتی......'' وہ تقریباً چیخ کر بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عمران نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ محبت انسان زندگی میں ایک ہی بار کرتا ہے مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ محبت ہو جانا ایک فطری عمل ہے' یہاں انسان بے بس ہو جاتا ہے۔''

''مگر میں بے بس انسان نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایمن کے بعد اب کوئی میری زندگی میں نہیں آئے گا اور میں اس پر قائم ہوں اور قائم رہوں گا۔'' وہ جذباتی ہو گیا۔

''ایک بات کہہ رہا ہوں' یقیناً تمہیں اچھی نہیں لگے گی مگر دوست ہوں اس لیے کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ زینل' ایمن بھابھی مر گئی ہیں اور تم زندہ ہو اور زندہ انسان اگر اپنی خواہشات اور احساسات کو مار دے تو یہ تقدیر سے لڑنے' فطرت سے لڑنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں خدا کو پسند نہیں۔''

''عمران' تم جانتے ہو کہ ان تمام باتوں کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا تو پھر کیوں اپنے الفاظ ضائع کر رہے ہو؟'' زینل سفاکی سے بولا۔

''اگر تمہاری زندگی اور دل میں کسی کے لیے جگہ نہیں تو بتاؤ' کیوں وہ لڑکی اریشہ تمہاری گفتگو کا حصہ بنتی جا رہی ہے؟ کیوں اس کے متعلق تم اتنا سوچتے ہو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں زینل سے پوچھا۔

''ایسا تم سوچتے ہو ورنہ ذکر کسی کا بھی کیا جا سکتا ہے اور پھر ظاہر ہے کہ اتنا وقت وہ میرے سامنے رہتی ہے تو اس کا شاملِ گفتگو ہو جانا اتنی بڑی بات تو نہیں۔''

''ہاں' یہی بات ہے۔'' عمران نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر اسے یقین تھا کہ زینل کے دل میں، کوئی گھر کر گیا ہے۔

☆......☆

ارسل کو گھر میں دیکھ کر مولوی شمس الدین کا خون کھول اٹھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس گھر میں آنے کی؟ کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ اس گھر میں مت آیا کرو مگر سچ ہے' ڈھیٹوں کی اولاد تو ڈھیٹ ہی ہوتی ہے نا۔'' وہ ناگواری سے بولے۔ ارسل نے بڑے ضبط سے یہ سنا اور نرمی سے بولا۔

''تایا جان' آپ چاہے مجھے سو گالیاں دیں مگر میں اتنے مشکل حالات میں آپ لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اپنے خاندان کی طرح میں نے بھی آپ لوگوں سے بے لوث محبت کی ہے اور کرتا رہوں گا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

حامد اور خدیجہ بیگم متاثر ہوئے تھے مگر مولوی شمس الدین کو تو اس پر اعتبار ہی نہ تھا مگر اس سے پہلے وہ کوئی سخت بات کہتے' مدیحہ برقعے میں ملبوس گھر میں داخل ہوئی۔ اسے اس طرح سے دیکھ کر سبھی پریشان ہو گئے۔

''آپ اس طرح سے یہاں؟ خیریت تو ہے؟'' حامد پریشان ہو گیا۔

''انہوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رونے لگی۔

''مگر کیوں؟'' حامد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ کہتے ہیں کہ جیسے تمہاری دونوں بہنیں گھر سے بھاگ گئیں' تم بھی ایک دن بھاگ جاؤ گی۔ انہیں اپنے گھر میں گندگی کا ڈھیر نہیں چاہیے۔'' مدیحہ اتنا کہہ کر رو پڑی۔

اس لمحے ارسل نادم ہو گیا۔ اس نے تو پاکیزہ کے گھر سے چلے جانے کی خبر مدیحہ کے سسرال تک اس لیے گمنام فون کر کے پہنچائی تھی تا کہ مولوی صاحب کی بدنامی کا چرچا گلی گلی ہو مگر اسے کیا پتا تھا

کہ اس کا انتقام مدیحہ کو لے ڈوبے گا۔

اس سے مزید وہاں نہیں رکا گیا۔ وہ چلا گیا' اس نے سوچ لیا تھا کہ جو بھی ہو وہ پاکیزہ کو گھر پہنچا دے گا ورنہ وہ جتنا وقت گھر سے باہر رہے گی' لوگ جانے اس کے بارے میں کیسی کیسی کہانیاں بنا لیں گے' وہ یہ بھی تو نہیں چاہتا تھا مگر.....

☆.....☆

ارسل اس کے پاس پہنچ گیا' وہ جوں کی توں بیٹھی تھی۔ ارسل کو اتنی جلدی دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر وہ دوبارہ چونکی تھی۔

"اٹھو پاکیزہ' تمہیں گھر لے کر جانا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ واقعی مجھے گھر لے جا رہے ہیں نا؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی اور اسی بے یقینی نے ارسل کو شرمندہ کر دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ پاکیزہ نے چادر درست کرتے ہوئے اس کی تقلید کی تھی۔

گھر ابھی بہت دور تھا تب ہی پاکیزہ نے گاڑی روکنے کو کہا۔ ارسل نے گاڑی روک دی۔ "ابھی تو گھر بہت دور ہے پھر تم نے یہاں اندھیرے میں گاڑی کیوں رکوا دی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے پاکیزہ کو دیکھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ کوئی آپ کو میرے ساتھ دیکھے۔ میں تو بدنام ہو چکی ہوں' آپ کے دامن پر داغ نہیں لگنا چاہیے۔ یوں بھی ابا نہ سہی مگر اس محلے کے بہت سارے لوگ محمود چچا کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اُن کو اگر پتا چل گیا کہ میری بدنامی میں اُن کے بیٹے نے اہم کردار ادا کیا ہے تو اُن کا مان ٹوٹ جائے گا اور جب کسی انسان کا مان ٹوٹتا ہے تو وہ کس اذیت سے گزرتا ہے' اس کا اندازہ کم از کم آپ نہیں لگا سکتے۔" وہ دکھ سے بولی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

ارسل ندامت کے بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا تھا۔

پاکیزہ گھر میں داخل ہوئی تو سارے محلے کی عورتیں اس کے گھر میں جمع تھیں۔ حامد اور مولوی شمس الدین موجود نہیں تھے' سب ہی اسے دیکھ کر چونک گئے۔

☆.....☆

"ارسل' تم کہاں تھے؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں؟" ندا بیگم لان میں ٹہل رہی تھیں۔ اسے اتنی دیر سے آتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"ماما' وہ..... میں..... تایا جان کے گھر تھا۔"

"خیریت؟ تم وہاں کیسے پہنچ گئے؟" ندا بیگم نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ماما..... وہ..... پاکیزہ کو کسی نے اغواء کرلیا ہے....." اس نے جلدی سے اطلاع دی۔

"ہیں..... یہ..... کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ بوکھلا گئیں۔

"ماما..... آپ کو وہاں جانا چاہیے' آخر دکھ کی گھڑیوں میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔"

"جانا تو میں بھی چاہتی ہوں مگر تمہارے پاپا کو اچھا نہیں لگے گا۔"

"ماما..... آپ پاپا کو سچویشن تو بتائیں۔ دیکھیے گا' وہ خود آپ کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔ ماما..... پلیز' اس وقت تایا جان کا مت سوچیں۔ تائی جان کو آپ کی ضرورت ہے۔" وہ ہانپتی تھا۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں' تم جاؤ' فریش ہو جاؤ۔" وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھنے لگیں پھر ایک دم سے رک گئیں اور پلٹ کر بولیں۔ "تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا نا؟"

"ماما..... میری فکر مت کریں' آپ پلیز' پاپا سے بات کریں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

ندا بیگم اثبات میں سر ہلا کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

☆.....☆

ندا بیگم اسٹڈی میں داخل ہوئیں تو محمود صاحب بہت غور سے ایک فائل دیکھ رہے تھے۔ ندا بیگم نے ایک لمحے کو اپنی تمام ہمتیں مجتمع کیں اور پھر بولیں۔

"ارسل آ گیا ہے۔" انہوں نے اطلاع دی۔

"ہاں' اچھا اتنی دیر کہاں تھا؟ فون بھی ریسیو نہیں کر رہا تھا؟" وہ اب کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگے تھے۔

"وہ..... بھائی صاحب کے گھر تھا۔"

وہ بولیں تو محمود صاحب کی انگلیاں ساکت ہوئیں اور نگاہیں اٹھ گئیں۔

"وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ میں نے منع نہیں کیا تھا؟" انہیں غصہ آ گیا۔

"محمود! پاکیزہ کو کسی نے اغواء کرلیا تھا۔ حامد نے اسے بتایا تو وہ رہ نہیں سکا' چلا گیا۔" ندا بیگم نے تفصیل بتائی۔

محمود صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ سب کیسے؟" وہ بے یقین سے تھے۔

"اتنی تفصیل تو ارسل کو بھی نہیں پتا ہے اس لیے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔" آخر کو انہوں نے مدعا بیان کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں' یوں بھی جتنی ذلت وہ ہماری کر چکے ہیں' وہ کافی ہے۔ مزید ذلیل ہونے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔" اُن کے لہجے میں دکھ تھا۔

"محمود! آپ اتنے سنگدل نہیں ہیں جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا میں نہیں جانتی کہ اُن لوگوں کو ذرا سی تکلیف آپ کو کتنا تڑپاتی ہے اور ساری عمر جب آپ نے بدلے کی خواہش نہیں رکھی تو پھر آج اپنی محبت کو کیوں مشروط کر رہے ہیں۔" وہ نرمی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے' تم لوگوں کو جانا ہے تو جاؤ مگر میں ہرگز اُن کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"ٹھیک ہے مگر میں پہلے ماما جان کو بتا دوں' بعد میں معلوم ہوگا تو وہ برا مانیں گی کہ انہیں کیوں نہیں بتایا؟" وہ اتنا کہہ کر چلی گئیں۔ وہ طیبہ بیگم کو اس بات سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔

☆.....☆

دُعا کرنا

کبھی کبھی ضروری ہوتا ہے
قطع تعلق بھی پیار میں
کہ رشتے ٹوٹ نہ پائیں
تعلق بوجھ نہ بن جائیں
مگر کچھ تحریریں مٹائی نہیں جاتیں
کچھ لمحے بھی بھلائے نہیں جاتے
کچھ اپنے ایسے ہوتے ہیں
جو دل میں ہمارے رہتے ہیں
اور دل کے یہ مکان
چاہ کر بھی خالی نہیں ہو پاتے
پھر سے کبھی یہ مت کہنا
"میرے لیے دُعا کرنا"
دُعا میں اپنوں کا نام نہ ہو تو
ہاتھ اُٹھائے نہیں جاتے

بشریٰ سعید

ندا بیگم اور ارسل کو دیکھ کر مولوی شمس الدین کا منہ بن گیا مگر گھر میں اس وقت اتنی خواتین موجود تھیں کہ انہیں کچھ کہنا مناسب نہیں لگا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ندا بیگم نے کھڑکی سے دیکھا' پاکیزہ کو اندر اپنے گھیرے میں لیے بہت سی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ندا بیگم اندر چلی گئیں جبکہ ارسل باہر حامد کے ساتھ صحن میں بچھے تخت پر ہی بیٹھ گیا۔

''شاہد کہاں ہے؟'' ارسل نے یونہی سوال کیا۔

وہ اس وقت بھی تبلیغی دورے پر گیا ہوا ہے۔'' حامد نے بےزاری سے کہا۔

''ہوں......'' ارسل اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

ندا بیگم اندر گئیں تو پاکیزہ بے اختیار اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی' تب ایک عورت بولی۔

''رو لو بیٹی! جی بھر کر رو لو۔ اب رونے کے سوا تم کر بھی کیا سکتی ہو۔''

دوسری بولی۔ ''مگر بیٹی! کتنے ہی آنسو بہا لو' اب تمہاری عزت تو واپس نہیں آ سکتی۔''

''خدا کے واسطے' خاموش ہو جایئے۔ میں کتنی مرتبہ آپ لوگوں کو بتاؤں کہ میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہوا۔'' پاکیزہ تڑپ کر چیخ اٹھی۔

''دیکھو بھئی' یہاں کوئی بچہ نہیں ہے کہ تمہاری بات پر یقین کر لے۔ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کو کوئی یونہی اغوا کرے گا اور پھر یونہی چھوڑ جائے گا؟ کمال ہے' سچ تو یہ ہے کہ تم اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی تھیں اور منہ کالا کر کے واپس آئی ہو اور اب خود کو پارسا اور معصوم ثابت کرنے کے لیے کہانیاں بنا رہی ہو۔''

پاکیزہ تو اپنے متعلق یہ سب سن کر سکتے میں ہی آ گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے بھی لوگوں کی نگاہوں میں اپنے لیے تحقیر دیکھنا پڑے گی۔ جس احساسِ ذلت کے کرب سے اس لمحے وہ گزر رہی تھی' اس کا اندازہ بھی کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔

کچھ لوگوں کی باتیں سن کر اور کچھ پاکیزہ کی حالت دیکھ کر ندا بیگم جیسی نرم طبیعت کی مالک عورت کو بھی غصہ آ گیا۔

''آپ لوگ کتنی بے حس ہیں۔ دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے ان پر نمک چھڑک رہی ہیں؟ آپ خود بیٹیوں والی ہو کر کسی اور کی بیٹی کی تذلیل کیسے کر سکتی ہیں؟'' وہ بے یقین تھیں۔

''ہماری بیٹیاں باکردار ہیں' مولوی صاحب کی بیٹیوں کی طرح نہیں' ایک گھر سے بھاگ گئی' دوسری طلاق لے کر آ گئی اور تیسری جو گل کھلا کر آئی ہے' اس کا بھی راز جلد ہی کھل جائے گا۔'' وہ خاتون حقارت سے بولیں۔ مدیحہ کو طلاق ہو گئی' یہ بات تو ندا بیگم کو بھی اب پتا چلی تھی مگر اس وقت انہیں پاکیزہ کے سوا کسی کی پروا نہ تھی۔

''پلیز' آپ لوگ یہاں سے چلی جائیں۔'' وہ سختی سے بولیں اور ساری خواتین بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

ندا بیگم کبھی پاکیزہ کو تسلی دے رہی تھیں' کبھی بت بنی خدیجہ کی دلجوئی کر رہی تھیں اور کبھی بلکتی مدیحہ کو سنبھال رہی تھیں۔

☆......☆

''شمس الدین کے گھر تو میں بھی جانا چاہتی ہوں مگر جانے وہ میرے اس طرح جانے کا کیا مطلب نکالے؟'' ناشتے پہ موجود طیبہ بیگم نے اپنے بیٹے محمود سے ان خدشات کا اظہار کیا جو اُن کے دل میں تھے۔

''ماما جان! مجھے بھی ان لوگوں کی بہت فکر ہے مگر بھائی صاحب کی بدگمانی نے دونوں خاندانوں کے درمیان جو فاصلے پیدا کر دیے ہیں' انہیں مٹانے کی اب

مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' محمود بے بسی سے بولے۔

''تم دونوں اپنی انا کا قد جتنا چاہے' بلند کر لو مگر میں یہ نہیں کر سکتی کیونکہ ایک ماں کے لیے اس کی اولاد اس کی انا اور عزتِ نفس سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اسے میں نے جنم نہیں دیا مگر وہ میرے شوہر کی اولاد ہے۔ میری ممتا اس کے لیے بھی اتنی ہی تڑپتی ہے جتنی تمہارے لیے۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

''ماما جان......! میں نے اس دن بھائی صاحب کے لیے جو کہا' آپ اس سے ہرٹ ہوئی ہیں نا؟'' محمود نے ان کی خفگی کو محسوس کر لیا تھا۔

''میرے صرف دو ہی بیٹے ہیں' وہ بھی اگر انا کے خول میں سمٹ کر میری ممتا کو آزمائش میں ڈال دیں گے تو اس بات سے خوشی تو نہیں ہو گی نا۔ میں مانتی ہوں کہ شمس الدین بہت سی جگہوں پر بہت غلط ہے مگر مجھے صرف اس بات کا جواب دو کہ اگر کوئی غلط ہو یا ہمیں سمجھ نہ پائے تو کیا اسے تنہا چھوڑ دینا مسئلے کا حل ہے؟ کیا ہمارا ظرف اتنا چھوٹا ہے کہ ہم معاف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں؟'' وہ بولیں۔

''ماما جان......! آج تک بھائی صاحب نے مجھ سے کتنی مرتبہ زیادتی کی مگر میں نے اف تک نہیں کی' پر اس بار انہوں نے میرے بیٹے پر جو الزام لگایا' وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔''

''جب ارسل نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ وہ سب کو معاف کر چکا ہے تو اب تم کیوں اپنا دل بڑا نہیں کرتے؟''

''ٹھیک ہے ماما جان' اگر آپ یہ چاہتی ہیں تو میں ایک بار پھر اُن کے سامنے جھک جاؤں گا۔'' وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

''جیتے رہو' خوش رہو۔'' وہ حقیقتاً خوش ہو گئیں، اس لیے ڈھیروں دعائیں بھی دے ڈالیں۔

☆......☆

کون

کون گزرے ہوئے موسموں کی طرف
جائے گا
جب ہوا چل پڑی
تو یہ دل بھی زمانے کے ہمراہ
رنگوں کے پیچھے نکل جائے گا
اُس طرف
جس جگہ
خواب ملتے نہیں
پھول کھلتے نہیں
ہونٹ ہلتے نہیں
صرف آنکھیں
دکھوں کے سمندر سے بھر جاتی ہیں
جس جگہ تتلیاں
حبس میں سانس لینے سے مر جاتی ہیں

ارشد ملک

صالحہ بیگم کے تو آج کل پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ اُن کا بیٹا شعیب لندن سے واپس آ گیا تھا۔ اُن دونوں بہنوں کو البتہ شعیب میں کوئی خاص بات نہیں لگی تھی۔ علیشہ کا خیال تھا کہ اسے شوآف کرنے کا بہت شوق ہے اور اریشہ نے بڑی فراخدلی سے اسے بگڑا ہوا رئیس زادہ قرار دے دیا تھا۔ اسی خوشی میں انہوں نے ایک تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ رات علیشہ اور اریشہ اسی بارے میں بات کر رہی تھیں۔

''کیا مطلب' آپ پارٹی میں نہیں جائیں گی؟'' علیشہ نے کپڑوں کا انتخاب کرتی اریشہ کو دیکھا تو بیڈ پر اُٹھ بیٹھی۔

''نہیں بھئی' ہر گز نہیں' ایک تو اس لیے کہ ان اسٹوپڈ لوگوں کو حرکتیں کرتے دیکھ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے دوسرا عیرہ کی منگنی کا فنکشن ہے جو میں کسی صورت مس نہیں کر سکتی۔ میرا تو خیال ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔'' اس نے آفر دی۔

''میرا خیال ہے کہ میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے ورنہ صالحہ آنٹی کو تو آپ جانتی ہیں' ذرا ذرا سی بات کو کتنا بڑا ایشو بنا دیتی ہیں اور میں اُن کی بے وجہ کی باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''بہر حال تمہاری مرضی مگر میں تو بالکل نہیں رکوں گی۔'' وہ شانے اچکا کر بولی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' علیشہ دوبارہ سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اریشہ پھر کی مناسبت سے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔

☆.....☆

''اس بدنامی سے نجات کا بس یہ ذریعہ ہے کہ پاکیزہ کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔'' مولوی شمس الدین نے بڑی رازداری سے خدیجہ بیگم سے کہا۔

''جو ہوا ہے' اس کے بعد اس سے شادی کون کرے گا؟ ہماری بدنامی کے چرچے تو گلی گلی ہو رہے ہیں۔'' خدیجہ بیگم دکھ سے بولیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان کی آواز کسی کنوئیں سے آ رہی ہو۔ دونوں بیڈ پر برابر برابر بیٹھے تھے۔

''تم کسی رشتہ کرانے والی سے بات کرو' میں بھی کوئی مناسب انسان دیکھتا ہوں۔ میں اس بدنامی کو اب سینے سے لگا کر نہیں رکھ سکتا۔'' وہ سنگدلی سے بولے۔

''اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ کہہ تو رہی ہے نا پھر آپ اسے کیوں اپنی بدنامی کی وجہ سمجھ رہے ہیں؟'' خدیجہ نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اس کے کہنے اور ہمارے ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات تو اس معاشرے اور یہاں کے لوگوں کی ہے اور لوگوں کی نظر میں اب وہ معتبر نہیں رہی۔'' وہ صاف گوئی سے بولے۔

''ہوں.....'' وہ ماننے کے لیے مجبور تھیں۔

''اور یہ ندا اور ارسل اب تک یہاں ہیں؟ اُن سے کہو وہ چلے جائیں۔ اُن کے چہرے دیکھتا ہوں تو اپنی ماں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا احساس اور زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔'' اُن کے لہجے میں نفرت تھی۔

''جتنا کچھ ہمارے ساتھ ہو چکا ہے' وہ کافی ہے۔ اب کوئی نیا تماشا لوگوں کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سدا یہاں رہنے نہیں آئے' چلے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہماری عزت چلی گئی ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئیں۔

جانے کیوں پہلی مرتبہ مولوی شمس الدین کو خدیجہ بیگم پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے نرمی سے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ خدیجہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ وہ انہیں تسلی دینے لگے۔

☆.....☆

پاکیزہ کے کمرے کے سامنے صحن میں حامد اور ارسل چارپائیاں بچھائے لیٹے تھے۔ حامد تھکا ہوا تھا، اس لیے سو گیا مگر احساسِ جرم ارسل کو سونے نہیں دے رہا تھا۔ پاکیزہ کے کمرے سے آتی آوازوں نے خود بخود ارسل کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''پاکیزہ مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولتیں' اس کے باوجود میں کم سے کم یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ آخر تمہارے اغوا میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ وہ لوگ چاہتے کیا تھے؟'' ندا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

اب شاید ارسل کا پردہ فاش ہونے میں چند لمحے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی سماعتیں منتظر تھیں۔

''میں ان لوگوں کو نہیں دیکھ پائی کیونکہ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی مگر میں نے ایک آواز سنی' کوئی مردانہ آواز میں کہہ رہا تھا کہ یہ وہ لڑکی نہیں جسے یہاں لانا تھا اور پھر ان لوگوں نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور ایک ویران راستے پر چھوڑ کر چلے گئے۔ میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی۔'' پاکیزہ نے بڑی مشکل سے یہ جھوٹ بولا تھا۔

اس ساری گفتگو کے دوران اس نے ایک بار بھی ندا بیگم کی جانب دیکھا نہیں تھا' شاید ان سے نگاہ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ باہر کھڑا ارسل بے حد تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے احساسِ جرم کے بوجھ تلے وہ دب کر مر ہی جائے گا۔

☆.....☆

اریشہ آج خاص طور سے تیار ہوئی تھی' پنک اور وائٹ کلر کے امتزاج سے بنا بے حد خوبصورت لباس کرتا پہنے' مناسب میک اپ کے ساتھ وہ بے حد الگ لگ رہی تھی۔ وائٹ اور پنک نگوں کی جیولری نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔

اُس وقت سب ہی عیرہ کے کمرے میں موجود تھیں' تبھی وہ بولی۔ ''ویسے آج اریشہ' تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔

''کیا؟'' ساری سہیلیاں متوجہ ہو گئیں۔

''بھئی' آج میری منگنی ہے' اگر تم اتنی خوبصورت لگو گی تو مجھے کون دیکھے گا؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''بے فکر رہو' ہمارے دولہا بھائی کی نظر بہت کمزور ہے' وہ تمہارے سوا کسی کو نہیں دیکھیں گے۔'' مانہ نے شرارت سے کہا تو سب ہنس پڑیں۔

عیرہ انہیں گھورنے لگی۔

''بھئی' بعد میں گھور لینا' ابھی تو نیچے چلو۔ تمہارے سسرال والے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' اریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ذرا دیر میں سب ہی نیچے آ جائیں اور زینل ملک کی نگاہ لمحہ بھر کے لیے اریشہ پر ٹھہر گئی تبھی اریشہ کی نگاہ بھی اچانک زینل ملک پر پڑی تھی۔ اس نے عیرہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ یہاں کیسے آ گئے؟'' وہ حیران تھی۔

بسیرا

جنگل
میری آنکھوں کا بسیرا ہے
اور میں اپنا جنگل
اپنے پاؤں سے باندھ کر چلتا ہوں
قدموں کی خاک
اور جنگل میں طاؤس
ایک ساتھ ناچتے ہیں

احسن سلیم

''میں نے انوی ٹیشن دیا تھا اور حیرت انگیز طور پر سرآ بھی گئے۔''

''مگر میں نے تو سنا تھا کہ یہ کوئی فنکشن' کوئی پارٹی اٹینڈ نہیں کرتے؟'' ماہین بھی بولی۔

''یار' میں تو خود حیران ہوں' کہاں تو یہ اتنی بڑی بڑی پارٹیز میں نہیں جاتے اور کہاں ہم مڈل کلاس لوگوں کے فنکشن میں آ گئے۔'' وہ حیران ہونے سے زیادہ ممنون تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ بندہ سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔'' اریشہ جلدی سے بولی۔

''اچھا خیر' یہ سب بعد میں' ابھی تم لوگ جاؤ اور سر کو تھوڑی کمپنی دو۔'' وہ ملتجی تھی۔

اریشہ اور ماہین آگے بڑھیں تب ہی عیبرہ بولی۔

''اریشہ' تم نے کہا تھا' تم ہمیں حامد سے ملواؤ گی۔ کہاں ہے وہ؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اس کا سیل مسلسل آف ہے۔ اب میری کوئی بات ہوتی تو اسے بلاتی نا۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''ہوں' یہ تو ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولیں اور پھر اریشہ اور ماہین آگے بڑھ گئیں۔

''آپ کا یہاں آنا ہمارے لیے بہت بڑا سرپرائز ہے۔'' اریشہ نے زینل ملک سے صاف بات کہی۔

''صرف اس لیے کہ عیبرہ اور میری کلاس میں فرق ہے۔'' وہ مسکرایا اور اس سے پہلے کہ ماہین ناں کہتی' اریشہ نے ہاں کہہ دیا۔

''کچھ چیزیں اپنے اندر اس قدر مقناطیسیت رکھتی ہیں کہ ہم چاہیں بھی تو خود کو اُن کے قریب جانے سے نہیں روک سکتے۔'' وہ بغور اریشہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

ماہین نے اس بات کو نوٹس کیا تھا مگر اریشہ نے نہیں البتہ وہ اس کے جملے پر چونکی ضرور تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''انسان کے خلوص میں بھی تو ایک طرح کی مقناطیسیت ہوتی ہے نا۔'' زینل ملک نے لمحوں میں بات بدل دی۔

اریشہ مطمئن ہو گئی البتہ ماہین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

فنکشن سے لوٹنے کے بعد سے زینل ملک نا چاہتے ہوئے بھی اریشہ کو سوچ رہا تھا' کیوں' یہ اسے نہیں پتا تھا۔ اس نے تو آج ایک ایسی حرکت بھی کر ڈالی تھی جس کی اسے خود سے بھی توقع نہ تھی۔ اس نے چھپ کر اریشہ کی تصویریں بنالی تھیں اور اب وہ موبائل میں وہ تصویریں بار بار دیکھ رہا تھا۔ اسے خود پر ہنسی بھی آ رہی تھی کہ اس نے کیا ٹین ایجرز والی حرکت کی تھی۔ اگر اریشہ کی سہیلیاں دیکھ لیتیں تو یقیناً ان کی نظروں میں اس کی عزت باقی نہ رہتی۔

☆......☆

''ہاں بھئی' پارٹی کیسی رہی؟'' اریشہ فریش ہو کر بستر پر آئی تو بے زار سی لیٹی علیشہ سے پوچھا۔

''سارے لوگ جی بھر کر اپنی امارت کا رعب جھاڑ رہے تھے۔ خواتین کپڑوں اور جیولری کی مقابلہ بازی میں مصروف تھیں اور پوری پارٹی میں کوئی بیس مرتبہ صالحہ آنٹی نے اپنے مہمانوں کو یہ بتایا کہ ہم پر کیا مشکل پڑی تھی اور انہوں نے ہمیں سہارا دیا ہے۔'' علیشہ نے اس بے زاری سے اریشہ کی توقع کے عین مطابق جواب دیا تھا۔

''اصل میں ایسے لوگوں کو لگتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی جتا کر لوگوں کی نظروں میں معتبر ہو رہے ہیں جبکہ حقیقتاً وہ انسانیت کی سطح سے بہت نیچے گر چکے ہوتے ہیں۔ خیر' بات صرف محسوس کرنے کی ہے۔'' اریشہ کے لہجے میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

''اچھا چھوڑیں' یہ بتائیں' آپ کا فنکشن کیسا تھا؟ عیبرہ آپی کیسی لگ رہی تھیں اور آپ کی باقی فرینڈز نے کیا پہنا تھا؟'' وہ جاننے کو بے قرار تھی اور پھر اریشہ اسے تقریب کی روداد سنانے لگی۔

☆......☆

فون مسلسل بج رہا تھا۔ ندا بیگم اس وقت لائبریری سے نکلی ہی تھیں انہوں نے فوراً ہی ریسیور کان سے لگایا۔ ''ہیلو......''

''ہیلو ندا' میں تمہاری خدیجہ بھابھی بول رہی ہوں۔'' انہوں نے جلدی سے تعارف پیش کیا۔

''جی بھابھی! السلامُ علیکم!'' انہوں نے محبت سے جواب دیا۔

''جیتی رہو' خوش رہو۔'' خدیجہ نے دل سے دُعا دی۔

''خیریت ہے بھابھی' آپ نے صبح صبح کیسے فون کیا؟'' ندا بیگم نے وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جہاں اس وقت دس بج رہے تھے۔

''وہ......اصل میں آج کچھ لوگ پاکیزہ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ میں بھلا اُن سے کیا بات کروں گی؟ کوئی سوال کر بیٹھے تو کیا جواب دوں گی؟ اس لیے میں چاہتی ہوں' تم یہاں آ جاؤ۔'' خدیجہ بیگم نے اصل بات بتائی۔

''بھابھی' مجھے آنے میں کوئی اعتراض نہیں' آخر کو پاکیزہ میری بھی بچی ہے مگر آپ اگر بھائی صاحب سے پوچھ لیتیں تو اچھا تھا۔'' وہ جھجکیں۔

''میں نے اُن سے بات کر لی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے' انہیں کوئی اعتراض نہیں۔'' خدیجہ بیگم جلدی سے بولیں۔

''ٹھیک ہے' میں آ جاؤں گی۔'' وہ محبت سے بولیں اور خدیجہ بیگم نے شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

ندا وہاں سے سیدھی طیبہ بیگم کے کمرے میں

غزل

وہ آ گئے ہیں چاہنے والوں کے سامنے
مطلع طلوع ہو گیا آنکھوں کے سامنے

مجھ سے تو خوش نصیب یہ خانہ بدوش ہیں
بے گھر میں سوچتا ہوں یہ خیموں کے سامنے

ذہنوں میں اُن کے ناچتے ہیں نفرتوں کے عکس
جب والدین لڑتے ہیں بچوں کے سامنے

حسرت سے تک رہا تھا کھلونے کھڑا ہوا
بچہ غریب کا وہ دکانوں کے سامنے

ہے نفرتوں کا زہر یہاں خون میں مگر
سر جھک رہا ہے خون کے رشتوں کے سامنے

دیوار کو گرا نہ سکا میں جہیز کی
سر کس طرح اٹھاؤں گا بہنوں کے سامنے

عارفؔ کے دل میں بس گئی اِک پھول کی مہک
کچھ پھول کھل رہے تھے مکانوں کے سامنے

عارف شفیق

آ ئیں اور انہیں ساری تفصیل بتائی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنی جلدی اتنا اچھا رشتہ اور وہ بھی خود شمس الدین نے تلاش کرلیا۔'' طیبہ بیگم بے یقین سی تھیں۔

''ماما جان......! مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اپنی عزت کے خیال سے پاکیزہ کو کنوئیں میں ہی نہ دھکیل دیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھائی صاحب سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔'' ندا بیگم فکرمند تھیں۔

☆......☆

ندا بیگم دانستہ ارسل کو ساتھ نہیں لائی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ارسل کو دیکھ کر شمس الدین کا خون کھول جاتا ہے اور وہ کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی تھیں۔

خدیجہ بیگم کے ساتھ مل کر انہوں نے چائے کا بڑا شاندار سا انتظام کر ڈالا تھا مگر جب وہ لوگ آئے تو دونوں کو ہی سخت مایوسی ہوئی۔

لڑکا پڑھا لکھا ضرور تھا مگر عمر میں کم سے کم پاکیزہ سے بیس سال بڑا تھا۔ صورت وشکل بھی بڑی معمولی سی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماں اور بہنیں تھیں۔ دونوں برقعے پہنے بیٹھی تھیں۔

وہ لوگ پاکیزہ کے متعلق سب کچھ جاننے کے باوجود اس رشتے پر راضی ہو گئے تھے۔ ندا بیگم کو اُن کی یہ مثبت سوچ اچھی لگی۔

پاکیزہ چائے لے کر آئی تو انہوں نے یوں سر سے پاؤں تک پاکیزہ کا جائزہ لیا جیسے اسے بیاہنے نہیں' خریدنے آئے ہوں۔ یہ بات خدیجہ بیگم اور ندا بیگم دونوں کو ناگوار گزری مگر وہ ضبط سے بیٹھی رہیں۔

''دیکھیے' ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی اگر اس رشتے کے لیے راضی ہوئے ہیں تو اس کا سبب مولوی صاحب کی شرافت اور کردار ہے لیکن ہمارے خاندان والوں کو یہ پتا چل گیا کہ ہم نے ایسی لڑکی کو بہو بنایا ہے جو اتنے گھنٹے کسی اور کے ساتھ گزار کر آئی ہے تو ہماری جان مشکل میں آ جائے گی۔'' لڑکے کی والدہ گویا تمہید باندھ رہی تھیں۔ اس وقت یہاں خواتین کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔

''آپ کو جو کہنا ہے' صاف صاف کہیں' گھما پھرا کر بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ندا بیگم کو اُن کے الفاظ غصہ دلا رہے تھے۔

''میں چاہتی ہوں کہ کیوں نا' لڑکی کا میڈیکل چیک اپ کرا لیا جائے تا کہ خاندان والوں کے منہ بند ہو جائیں۔'' انہوں نے مشورہ دیا اور اس کے ساتھ ہی ندا بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''آپ ہوش میں تو ہیں؟ جانتی بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ یہاں رشتہ لینے آئی ہیں یا ایک لڑکی کو ذلت کی کھائی میں دھکیلنے؟'' ندا بیگم غصے سے بولیں۔

''ہائے بہن......! ہم نے ایسا کیا کہہ دیا؟ آخر خاندان بھر کو یقین دلانے کے لیے ہمارے پاس کوئی تو ثبوت ہونا چاہیے نا؟'' وہ بڑی معصومیت سے بولیں۔

''ایک شریف لڑکی کو ایسی آزمائش میں ڈالنا' اس کے لیے موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔''

''اگر اس کی شرافت کا اتنا یقین ہے تو اسے اپنی بہو کیوں نہیں بنا لیتیں؟'' وہ طنز سے بولیں۔ خدیجہ بیگم دنگ تھیں جبکہ ندا بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔

''دیکھا' اپنی باری آئی تو کیسے بولتی بند ہو گئی، اسی لیے نا کہ کوئی آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلتا۔ تم اپنے ہو کر کوئی ہمدردی نہ کر سکے اور ہم جو حوصلہ کر رہے ہیں تو دس باتیں ہمیں سنا دیں اور الٹا غلط بھی ٹھہرا رہے ہو۔'' وہ ناراضگی سے بولیں۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جانے کیوں میرے دماغ میں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ بہرحال اب بھی دیر نہیں ہوئی' میں اعلان کرتی ہوں کہ آج سے پاکیزہ اس گھر میں میرے اَرسل کی امانت ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولیں اور وہ لوگ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

''ندا......! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے خاندانی معاملات کیسے ہیں۔ کس برتے پر تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی؟'' خدیجہ بیگم خفا ہو گئی تھیں۔

''میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ اب جو بھی ہو' میں پاکیزہ کو اس بے رحم معاشرے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔'' اُن کا لہجہ اب بھی مضبوط تھا۔

مولوی شمس الدین غصے میں بھرے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ارسل بھی تھا۔

انہیں اندر آتے دیکھ کر جہاں ندا بیگم نے سر اٹھا لیا تھا' وہیں خدیجہ بیگم تھر تھر کانپنے لگیں۔ پاکیزہ حیران وپریشان کھڑی تھی۔ حامد کے چہرے پر بھی کچھ ہو جانے کا خدشہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اندر آتے ہی برس پڑے۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اسے مت بلاؤ۔ ان سے ہماری خوشی نہیں دیکھی جاتی مگر تم تو ہو ہی ندا کی بے وقوف...... اب دیکھو' بیٹی کا گھر بسنے سے پہلے اجاڑ دیا......'' انہیں خدیجہ بیگم پر غصہ آ رہا تھا۔

''بھائی صاحب' آپ فکر مت کریں' پاکیزہ کا گھر ضرور بسے گا۔ آپ پلیز' میرے ارسل کو قبول کر لیں۔'' ندا بیگم نے نرمی سے کہا۔ حامد کے چہرے پر خوشی تھی مگر مولوی صاحب کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

''میرے اوپر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میں اپنی بیٹی کو محمود کے بیٹے سے بیاہ دوں۔'' وہ حقارت سے بولے۔

غزل

کل خوابوں کی نگری سے جب نکلا میں
میرا خالی کمرہ تھا اور تنہا میں

تم کو منزل خود کو رستہ کر ڈالا
اپنی کھوج میں آخر کب تک رہتا میں

یادوں کی رِم جھم میں بھی تھی رسوائی
تجھ کو بھول گیا ہوں اور کیا کرتا میں

چند شکستہ تیغ و تیر تھے میرے پاس
ان سے لمبی بازی کیسے لڑتا میں

اُس کا میرا کیا رشتہ اور کیا ناتا
سمجھو ڈوبنے والا وہ اور تنکا میں

خود سے جیت کے خود کو کب تک دیتا مات
اپنے آپ سے کتنا آگے جاتا میں

یاد ہے اب تک مایوسی کی رات سمیر
ایک دیے کی خاطر کب تک ترسا میں

نعیم سمیر

''آپ اس سے نفرت کریں یا محبت' وہ آپ کا بھتیجا ہے' آپ کا خون ہے۔ دوسرے اگر ہماری عزت کا مذاق اڑائیں' اس سے تو بہتر ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کا درد بانٹ لیں۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''مجھے تم لوگوں کی ہمدردیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اسی حقارت سے بولے۔

''بہر حال اب ہم بہت جلد باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گے۔'' وہ اتنا کہہ کر چلی گئیں۔

مولوی صاحب بڑبڑاتے رہ گئے۔

☆......☆

''اتنی بڑی بات تم نے کیسے کہہ دی؟'' محمود صاحب' طیبہ بیگم اور ارسل کے ساتھ ساتھ ہما اور نمرہ بھی چونکی تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہر فرد حیران تھا۔

''کیوں' پاکیزہ میں کوئی کمی ہے؟'' ندا نے محمود صاحب کی جانب شاکی نظروں سے دیکھا۔

''یہ بات نہیں ہے' پرابلم یہ ہے کہ رشتوں میں پہلے ہی جتنا الجھاؤ ہے' اس کے ہوتے ہوئے رشتے کی گنجائش نہیں نکلتی اور تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ بھائی صاحب اس رشتے کے لیے خوشی سے راضی ہو جائیں گے؟'' وہ حیران تھے۔

''سچ تو یہ ہے محمود کہ میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا' ہاں' مجھے پاکیزہ کے چہرے میں اپنی بیٹیوں کے چہرے دکھائی دیے۔ اس کے آنسو جیسے میرے دل پر گر رہے تھے۔''

''مگر میں کسی حالت میں پاکیزہ سے شادی نہیں کروں گا۔'' ارسل اتنا کہہ کر اٹھ گیا۔

''اپنے بیٹے کا فیصلہ سن لیا۔'' محمود صاحب نے انہیں متوجہ کیا۔

''ارسل سے میں بات کرلوں گی۔'' طیبہ بیگم نے کہا۔

''ماما جان......! آپ بھی اپنی بہو کا ساتھ دے رہی ہیں۔'' محمود کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

''ندا نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا' تم لوگ اوور ری ایکٹ کر رہے ہو۔'' طیبہ بیگم رسان سے بولیں۔

''ماما جان......! آپ سے بہتر بھائی صاحب کو کوئی نہیں جانتا' اس کے بعد بھی آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' وہ الجھ گئے۔

''یوں سمجھو کہ میرے دل میں ہمیشہ ایک کسک سی رہی ہے کہ میں شمس الدین کے لیے وہ نہیں کرسکی جو کرنا چاہتی تھی۔ اب اس کی اولاد کے لیے کچھ کرنے کا موقع مجھے تقدیر سے ملا ہے' میں وہ ہرگز ضائع نہیں کروں گی اور سچ تو یہ ہے کہ کرنا چاہتی بھی نہیں ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولیں۔

محمود خاموش ہو گئے۔ ہما آپا اور نمرہ بے حد خوش تھیں' انہیں پاکیزہ پسند تھی۔

☆......☆

اریشہ پارک میں ٹہلتے ہوئے حامد سے اتنے دن نہ ملنے کا شکوہ کر رہی تھی' تبھی حامد نے اسے پاکیزہ کے بارے میں بتایا۔

''تو تم لوگوں کو تو فوراً ہاں کہہ دینی چاہیے نا' جہاں تک میرا تجربہ ہے' اپنے سب سے زیادہ بے رحم ہوتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے اپنے ماں باپ کا عکس لہرا گیا۔ وہ اب بھی بول رہی تھی۔ ''پہلی مرتبہ میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ اپنے اتنے مخلص بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہاری چاچی واقعی کمال کی عورت ہیں۔'' اریشہ نے داد دی۔

''خوش تو میں بھی بہت ہوں اریشہ' مگر ابا مانیں تو ہماری خوشی مکمل ہو نا۔'' وہ بات کرتے کرتے بینچ پر

بیٹھ گئے۔

''تم اپنے ابا کو سمجھاؤ نا' تقدیر بار بار مہربان نہیں ہوتی۔'' اریشہ نے اصرار کیا۔

''وہ مانیں' تب نا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''حامد' تمہیں کیا لگتا ہے' تم میرے لیے اپنے ابا کو کنوینس کرلو گے؟'' جانے کیسے اسے خیال آ گیا۔

''کرلوں گا اور اگر نہ کرسکا تو میں بغاوت کردوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''نہیں حامد' میں تمہارے گھر والوں کی رضامندی کے بنا تمہاری زندگی میں نہیں آنا چاہتی۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''اچھا' فی الحال تم اس بات کی ٹینشن مت لو کیونکہ جب تک پاکیزہ کا معاملہ حل نہیں ہو جاتا' یہ بات کرنا فضول ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

☆......☆

''پاپا' آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں نے مومنہ سے کتنی محبت کی ہے اور اب تک میرے دل میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایسے میں کیسے میں کسی اور لڑکی اور وہ بھی اس کی سگی بہن سے شادی کرلوں؟'' ارسل' محمود صاحب کے کیبن میں بیٹھا ان سے بات کر رہا تھا۔

''دیکھو ارسل' اس وقت بات جذبات کی نہیں' انسانیت کی ہے۔ کیا تمہارا ضمیر یہ گوارہ کرے گا کہ ایک معصوم لڑکی' لوگوں کے بتائے نام نہاد اصولوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔'' محمود صاحب نرمی سے بولے۔

''میں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ نہیں اٹھا رکھا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میں ساری دنیا کی نہیں' پاکیزہ کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

''اگر آپ کو اس سے زیادہ ہمدردی ہے تو اس کی شادی اپنے جاننے والوں میں سے کسی کے ساتھ کرا دیں۔ بٹ آئی ایم سوری پاپا' میرے دل اور میری زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''میں نے تمام عمر اپنے بچوں کو کسی معاملے میں فورس نہیں کیا' اب بھی نہیں کروں گا' یوں بھی میں نے تو تمہاری ماں اور دادی کی خاطر پوچھا ہے ورنہ پاکیزہ کے لیے میں عرفان کا انتخاب کر چکا تھا۔'' وہ مطمئن تھے۔

''آپ اُسی عرفان کی بات کر رہے ہیں نا جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے؟ جس کی سولہ کی بیٹی اور سترہ سال کا بیٹا ہے؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''ہاں۔'' محمود صاحب نے تصدیق کی۔

اس مرتبہ ارسل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پاپا' آپ نے تو تایا جان سے بھی زیادہ سنگدلانہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت اس شخص کی عمر کیا ہے اور اس کے بازاری عورتوں کے ساتھ......'' بات کرتے کرتے وہ چپ ہو گیا۔ وہ باپ کو عرفان صاحب کے معمولات کی کیا وضاحت دیتا۔

''بہر حال جو بھی ہے' مجھے یقین ہے کہ وہ پاکیزہ کو خوش رکھے گا۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''مگر وہ پاکیزہ کے قابل ہرگز نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اب اس کی زندگی کے کسی معاملے میں بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔'' اس مرتبہ محمود صاحب کا لہجہ سخت تھا۔

ارسل خاموش ہو گیا مگر محمود صاحب کی یہ بات اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

☆......☆

مولوی شمس الدین کا اچانک سے پاکیزہ اور

ارسل کے رشتے کے لیے رضامند ہو جانا، سب کے لیے حیران کن تھا مگر اس کے باوجود جب خدیجہ بیگم نے فون پر ندا بیگم کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے فوری طور سے جا کر طیبہ بیگم کو بتایا جو لائبریری میں بیٹھی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھیں۔

"ابھی محمود کا فون آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ ارسل نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" انہوں نے خوش ہونے کے بجائے سنجیدگی سے اطلاع دی۔

"اب اسے کیا مسئلہ ہو گیا؟" ندا بیگم کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔

"کہتا ہے کہ وہ مومنہ کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتا۔"

"اس لڑکی کے لیے پاکیزہ کو ٹھکرا رہا ہے جو اسے چھوڑ کر چلی گئی اور اس کا اب تک کوئی اتا پتا نہیں ہے۔"

"اب میں اس معاملے میں کیا کہوں؟" طیبہ بیگم تھکے تھکے سے انداز میں بولیں۔

"پر میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟" وہ اطمینان سے بولیں۔

"ندا، مجھے تم پر یقین ہے پر پھر بھی جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ یہ نہ ہو کہ یہ نیکی ہمارے گلے کی ہڈی بن جائے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھو! اگر ارسل کو کنونس کرنا تو محبت سے، اسے فورس کرنے یا ایموشنل بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے اگر وہ مان بھی جائے گا تو بعد میں بہت سارے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے اختیار میں کچھ نہیں رہے گا۔" طیبہ بیگم بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

"آپ فکر مت کریں، میں ان سب چیزوں کا خیال رکھوں گی۔" ندا بیگم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ طیبہ بیگم خاموش ہو گئیں مگر وہ متفکر تھیں۔

☆.....☆

آج پھر اریشہ خوفزدہ ہو کر نیند سے جاگ اٹھی تھی جبکہ علیشہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اریشہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ آخر مجھے اس احساسِ جرم سے کب نجات ملے گی کہ میں ایک.....'

اس نے گہری سانس لی۔ مجھ سے جو گناہ ہوا' انجانے میں ہوا اور انجانے میں کیے گناہوں کی معافی تو مل ہی جاتی ہے پھر یہ بے چینی میرے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ ایسا کیا کروں کہ اس اذیت سے نجات مل جائے؟ وہ ایک کرب مسلسل سے گزر رہی تھی۔

'کیوں نا' میں اس شخص کو تلاش کروں۔' اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا۔ مگر میں تو اسے جانتی بھی نہیں' اسے دیکھا تک نہیں پھر کہاں اور کیسے اسے تلاش کر سکوں گی؟' اس کا دماغ بری طرح الجھ گیا۔ اس نے چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆.....☆

ارسل کے ذہن میں کئی طرح کی سوچیں پنپ رہی تھیں۔ کبھی عرفان کا خیال آتا اور پاکیزہ کا تاریک مستقبل نگاہوں میں گھومتا تو وہ فیصلہ کر لیتا کہ اسے پاکیزہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس سے کم از کم وہ ایک اذیت ناک زندگی گزارنے سے بچ جائے گی مگر مومنہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتے ہی سارے فیصلے دم توڑ جاتے۔ کوئی احساس باقی نہ رہتا سوائے اس کے کہ اسے مومنہ سے شدید محبت ہے اور اس کے بنا رہنا ارسل کے لیے ممکن نہیں۔'

وہ یونہی خود سے الجھ رہا تھا جبھی ندا بیگم نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور بولیں۔ "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" اور اس کے ساتھ ہی ارسل پہلے چونکا اور پھر

مسکرا دیا۔

"آ جائیے نا ماما' آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" وہ دروازے تک گیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا اور وہ صوفے پر بیٹھ گئیں تو وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔

"ضرور کوئی اہم بات ہو گی ورنہ میرے روم میں آپ آتی نہیں ہیں۔" محبت بھرا شکوہ تھا۔

"بھائی صاحب نے پاکیزہ کے لیے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے۔" وہ تمہید باندھے بولیں۔

"آپ کی پاپا سے بات ہوئی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

"ہاں' وہ بتا رہے تھے کہ تم نے انکار کر دیا ہے۔" وہ مطمئن تھیں۔

"اس کے باوجود آپ بات آگے بڑھانے کا سوچ رہی ہیں؟" وہ حیران تھا۔

"دیکھو ارسل' میں جانتی ہوں کہ تم مومنہ سے محبت کرتے ہو مگر اب مومنہ یہاں نہیں ہے۔ کہاں ہے' اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ تمہیں شادی تو کرنی ہی ہے نا تو پھر پاکیزہ سے کیوں نہیں۔ اس میں ایسی کیا کمی ہے؟" وہ سوالیہ انداز میں بولیں۔

"ماما' میں آپ لوگوں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ مجھ سے آپ لوگوں کی کتنی امیدیں اور خواہشات وابستہ ہیں' اس کا مجھے احساس ہے اور اسی لیے اپنی خواہش کے برعکس میں شادی ضرور کروں گا اور وہ بھی جس سے آپ لوگ کہیں گے' اس سے کروں گا مگر جس دن مومنہ آئے گی' اسے اپنی زندگی میں شامل ضرور کروں گا پھر چاہے مجھے اپنی بیوی کو طلاق ہی کیوں نا دینی پڑے لیکن اگر پاکیزہ اس کی جگہ ہوئی اور طلاق میں نے اسے دے دی تو آج جوڑ آپ لوگوں کو ہے' وہ کل حقیقت بن جائے گا۔ مطلب کہ خاندان بکھر جائے گا۔ خود پاکیزہ کے ساتھ بھی زیادتی ہو گی اور سب سے بڑھ کر سب کی نظر میں مومنہ مجرم بن جائے گی۔" وہ بہت دور کی سوچ رہا تھا۔

"ارسل' آج تم ہماری عزت رکھ لو' کل جو تم چاہو گے' وہی ہو گا اور میں تمہیں اس کا یقین دلاتی ہوں کہ مومنہ اس گھر کی بہو بنے گی اور پاکیزہ کی طلاق پر کوئی ہنگامہ نہیں ہو گا۔"

"ماما' آپ بہت بڑی بات کہہ رہی ہیں۔" وہ حیران تھا۔

"جو کہہ رہی ہوں' سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں' یوں بھی جب تم سے طلاق لے کر پاکیزہ کی بہت اچھی جگہ شادی ہو جائے گی تو سب کی زبانیں خود بخود بند ہو جائیں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔

"اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو واقعی کوئی کچھ نہیں بول سکے گا۔" ارسل خوش تھا۔

"تو کیا اب تم اس شادی کے لیے تیار ہو؟" ندا بیگم نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے مگر دیکھیے' آپ نے جو وعدہ کیا ہے' اسے بھولیے گا نہیں۔" ارسل نے گویا یاد دہانی کرائی۔

ندا بیگم اثبات میں سر ہلا کر چلی گئیں۔

☆.....☆

"تم مجھے پاکیزہ کی شادی میں نہیں بلاؤ گے؟" خوشخبری سنتے ہی اریشہ نے فون پر شکوہ کیا۔ وہ اس وقت زینل ملک کے گھر کام میں مصروف تھی۔

"ہمارے یہاں لڑکیاں شادی سے پہلے سسرال نہیں آتیں۔" وہ آفس میں بیٹھا تھا اس لیے ریلیکس ہو کر بات کر رہا تھا۔

"تو میں پاکیزہ کی سہیلی بن کر آ جاتی ہوں۔"

اس نے آئیڈیا دیا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے' اس طرح تم ہمارے خاندان والوں کو بھی دیکھ لو گی اور ہمارے ماحول کو بھی دیکھ لو گی

اماں اور چاچی سے بھی مل لو گی۔ مستقبل میں یہ دونوں خواتین تمہارے بڑے کام آنے والی ہیں۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"اچھا بس زیادہ ہنسنے والی کوئی بات نہیں اور ویسے مسٹر' تمہیں آفس میں کوئی کام وام نہیں ہوتا جو سارا دن لڑکیوں سے باتیں کرتے رہتے ہو؟ اب فون بند کرو اور کام میں دل لگاؤ۔" وہ حاکمانہ انداز میں بولی۔

"اب ایک دل میں کہاں کہاں لگاؤں؟" وہ بھی موڈ میں تھا۔

"یااللہ! حامد' تم کتنے فلمی ہوتے جا رہے ہو نا؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

حامد ہنس پڑا۔ "اچھا اب اپنا کام کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔" اریشہ نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس کا فون بند ہوتے ہی عبیرہ اور ماہین اُن دونوں کے ریلیشن شپ پر تبصرہ کرنے لگیں۔ کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ دروازے کے قریب کھڑے زینل ملک نے ان کی ہر بات سنی تھی اور جس طرح سے آیا تھا' اسی طرح سے لوٹ گیا۔

☆......☆

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے زینل ملک کے ذہن میں جانے کیوں بہت الجھن تھی۔ اریشہ کی زندگی میں کوئی اور تھا تو مجھے کبھی احساس کیوں نہیں ہوا؟ مجھے کیوں یہ یقین تھا کہ اس کی لائف میں کوئی نہیں ہو سکتا اور اسے بڑی آسانی سے جگہ مل جائے گی۔ اس کی زندگی میں بھی اور دل میں بھی۔

'مگر میں اس بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ ضروری تو نہیں کہ اگر میرے دل میں اریشہ کے لیے کچھ جذبات ہیں تو اس کے دل میں بھی ضرور میرے لیے فیلنگز ہونی چاہئیں مگر یہ سب حقیقت تسلیم کرنے کے باوجود میرے دل کو برا کیوں لگ رہا ہے؟' اسے خود اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن بہر حال زینل ملک' اریشہ کی فون پر ہونے والی باتیں سن کر بے حد ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

☆......☆

پاکیزہ کی شادی بڑی سادگی سے ہو رہی تھی' یہ مولوی صاحب کی شرط تھی مگر ابھی کسی کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اور کیا کیا شرط سوچے بیٹھے ہیں؟

اریشہ اور علیشہ دونوں شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ سب کو یہی پتا تھا کہ وہ پاکیزہ کی سہیلیاں ہیں۔ حامد نے پاکیزہ کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، اسی لیے وہ ان سے اسی طرح ملی جیسے کوئی اپنی سہیلیوں سے ملتا ہے۔

اریشہ اسے خود تیار کرنا چاہتی تھی اس لیے باقی سب کو باہر بھیج دیا۔ اب وہ اور پاکیزہ کمرے میں اکیلی تھیں۔ دونوں پلنگ پر بیٹھی تھیں تبھی اریشہ بولی۔ "ایک بات پوچھوں' برا تو نہیں مانو گی؟"

"پوچھیں نا۔" وہ نرمی سے بولی۔

"تم اس شادی سے خوش نہیں ہو کیا؟" اریشہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے نگاہیں چرا لیں۔

"اگر تم خوش نہیں تو تمہیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔" اریشہ نے صلاح دی۔

"انکار کر کے میں سب کو دکھی نہیں کرنا چاہتی' یوں بھی میری وجہ سے سب لوگ بہت کچھ برداشت کر چکے ہیں۔" وہ افسردہ تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہاری شادی ہوتے ہی اس خاندان کی بدنامی' نیک نامی میں بدل جائے گی؟" اسے اس لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔

"یہ شادی درحقیقت میرے لیے فرار ہے۔

میں ابا' امی اور بھائیوں کو فیس نہیں کر سکتی اور مدیحہ آپا' جن کا گھر میری وجہ سے اجڑ گیا' وہ جب مجھے دیکھتی ہیں تو میری ہمت نہیں ہوتی کہ میں اُن سے نظر ملا سکوں۔" وہ حد درجہ نادم تھی۔

"صرف اس وجہ سے تم اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟" وہ حیران تھی۔

"زندہ رہنا میری بدقسمتی ہے ورنہ یہ جو زندگی نام کی شے ہے نا' اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ بے زار تھی۔

"بہر حال چلو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دلہن بناتی ہوں۔" اس نے اتنا کہا اور تھوڑی دیر میں اسے دلہن بنا کر آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو' ویسے کہتے ہیں کہ دلہن بننے کے بعد لڑکی کی فیلنگز بدل جاتی ہیں۔ اب بتاؤ' تم کیا فیل کر رہی ہو؟" اریشہ نے شرارت سے کہا۔

"پتا ہے' کچھ لوگوں کے یہاں روایت ہے کہ وہ لوگ لڑکیوں کو دلہن بنا کر ان کے آخری سفر پر روانہ کرتے ہیں اور تب جو فیلنگ اس لاش کی ہوتی ہے' وہی میری ہے۔" وہ مسکرائی مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے جو درد تھا' وہ اس کی آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا۔ اریشہ خاموش ہو گئی تھی۔

بارات آ گئی تھی۔ نکاح شروع ہو گیا۔ یہ نکاح مولوی شمس الدین نہیں بلکہ کوئی اور مولوی صاحب پڑھا رہے تھے مگر جب حق مہر کی بات ہوئی تو سارے چونک اٹھے۔ مولوی شمس الدین نے دو فیکٹریاں اور ایک کوٹھی کے علاوہ خاصی زمین حق مہر میں لکھانے کی بات کی تھی اور اس سب کے متعلق کسی کو نہیں پتا تھا۔

اب سب کو علم ہو گیا کہ مولوی شمس الدین اس رشتے کے لیے مان کیسے گئے تھے۔

"پاپا' یہ نکاح نہیں' سودا ہے اور مجھے یہ سودا منظور نہیں۔" ارسل اٹھنے لگا مگر محمود صاحب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولے۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ میرے ساتھ چلو۔" وہ اتنا کہہ کر مولوی صاحب اور باقی لوگوں سے معذرت کر کے ارسل کو گھر سے باہر لے آئے۔

"بھائی صاحب' کچھ کریں گے' اس کا مجھے یقین تھا مگر یہ سب کریں گے' اس کا اندازہ نہیں تھا۔ درحقیقت وہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ پاکیزہ میری بہو بنے۔"

"تو پاپا' آپ لوگ بھی ضد چھوڑ دیں ناں' بارات واپس لے چلیں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"ارسل' مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم اور بھائی صاحب مل کر پاکیزہ کو زندہ درگور کیوں کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے' وہ کافی نہیں کہ یوں بارات واپس لے جا کر اس بچی کو جینے کے لائق ہی نا چھوڑیں۔" وہ دکھ سے بولے۔

"میں ایسا نہیں چاہتا' خود اس کا باپ ایسا چاہتا ہے۔" وہ حقارت سے بولا۔

"شٹ اپ ارسل...... یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو؟ میرا اور ان کا جو بھی معاملہ ہے' میں اپنی اولاد کو کبھی یہ حق نہیں دوں گا کہ وہ میرے بھائی صاحب کے لیے برا کہنا تو دور' برا سوچیں بھی اور دوسری بات یہ کہ میں نے اور میری ماں نے عمر بس ایک مقصد کے ساتھ گزار دی کہ بھائی صاحب کو ہمارے خلوص اور رشتوں کی صداقت پر یقین آ جائے۔ وہ یہ مان لیں کہ رشتے سگے اور سوتیلے نہیں ہوتے' رشتے صرف رشتے ہوتے ہیں اور جب سے تمہاری ماں میری زندگی میں آئی ہے' اس نے بھی ہمیشہ اس خاندان کو ایک کرنے کی کوشش کی ہے اور آگے ہم تم سے بھی یہی امید رکھتے ہیں کیونکہ تم.....

ہمارے بیٹے ہو۔'' وہ نرم پڑ گئے۔

''پاپا' مگر یہ جو تایا جان اتنا کچھ مانگ رہے ہیں' وہ..... شادیاں کیا اس طرح سے ہوتی ہیں؟''

''دیکھو ارسل بیٹا' خدا نے مجھے اتنا دیا ہے کہ اگر اس میں سے میں جتنا بھی بھائی صاحب کو دے دوں' کم نہیں ہوگا اور انہیں کچھ دے کر مجھے جتنی خوشی ہوگی' اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے اس لیے اندر چلو اور بنا کسی ردعمل کا اظہار کیے' یہ نکاح قبول کرلو۔ اسی میں سب کی عزت ہے۔'' وہ حاکمانہ انداز میں بولے۔

''ٹھیک' میں یہ نکاح کر لیتا ہوں مگر یاد رکھیے پاپا' میں خوش نہیں ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر اندر چلا گیا۔

محمود صاحب فکرمند تھے۔

☆.....☆

پاکیزہ رخصت ہو کر ارسل کے گھر میں آ گئی۔ یہ وہی گھر تھا' وہی کمرہ جہاں اس وقت اس کے بجائے مومنہ کو ہونا چاہیے تھا مگر جانے وہ کہاں تھی؟

ارسل کمرے میں آیا اور اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''نکاح سے پہلے تک تم سے ہمدردی بھی تھی اور اس بات کے سبب میں تمہیں بہت بلندی پر محسوس کر رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا' اس کے باوجود تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو گئیں مگر تمہارے باپ نے نکاح کی آڑ میں ہم سے اتنا کچھ لے کر جس طرح تمہیں بیچا ہے' اس کے بعد تو مجھے تم بہت پستی میں دکھائی دے رہی ہو۔ جانے کیوں مجھے تم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔''

پاکیزہ خاموش تھی جبکہ وہ اب بھی بول رہا تھا۔ ''جب گھر سے چلا تھا تو باوجود اس کے کہ میں مومنہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں' یہ فیصلہ کر کے گیا تھا کہ تمہارے لیے اپنی زندگی اور ہو سکا تو اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کروں گا مگر یہ تب ممکن تھا جب تم اس گھر میں بیوی بن کر آتیں مگر تمہارے باپ نے مجھے تمہارا شوہر بننے سے پہلے تمہارا خریدار بنا دیا اور اس حساب سے میری زندگی میں تمہاری حیثیت کیا رہے گی' اس کا اندازہ تم لگا سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

پاکیزہ خاموش تھی' لمحہ بھر کے لیے تو ارسل کو یوں لگا کہ جیسے وہ کسی پتھر کے بت سے مخاطب ہے، اس لیے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''تم میری بات سن رہی ہو؟''

''اگر آپ نے مزید کچھ نہیں کہنا تو کیا میں چینج کرنے چلی جاؤں؟''

اس کے نارمل لہجے نے ارسل کو چونکا دیا۔ اس مرتبہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پاکیزہ نے اپنے سوٹ کیس میں سے کپڑے نکالے اور تبدیل کرنے چلی گئی۔

'حیرت ہے' میری اتنی باتوں کے جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔' وہ حیران تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ باہر آئی تو سادہ سے کاٹن کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ چادر نما دوپٹے سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ آئی اور اس کی جانب دیکھے بنا صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ ارسل نے کوئی سوال نہیں کیا اور آرام سے کمبل اور تکیہ لا کر اس کے قریب رکھ دیا۔

''یہ اے سی کمرہ ہے' یہاں سونے کے لیے کمبل کی ضرورت پڑے گی۔'' اس نے اتنا کہا اور خود بھی چینج کرنے چلا گیا۔

واپس آیا تو وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کمرہ اس وقت بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس کو سردی کا احساس تک نہیں تھا۔ ارسل بھی لاتعلق ہو کر سو گیا۔

پاکیزہ کے ذہن میں وہ سارے الفاظ گونج رہے تھے جو ارسل نے اس سے کہے تھے۔

☆.....☆

صبح ارسل کی آنکھ کھلی تو حیران رہ گیا' وہ جوں کی توں سوئی ہوئی تھی۔ کمبل اور تکیہ اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ 'کیا پاگل لڑکی ہے' بیٹھے بیٹھے ہی سوگئی۔ کہیں بخار وغیرہ نہ چڑھ گیا ہو؟' وہ اٹھ کر قریب چلا آیا اور اسے آواز دی۔ ایک' دو' تین..... تیسری آواز پر پاکیزہ کی آنکھ کھل گئی۔ ارسل کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھی اور نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

''ساری رات اے سی میں اس طرح..... تم ٹھیک ہو نا؟'' ارسل نے نرمی سے پوچھا۔

پاکیزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا' تب وہ مزید بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں سبھی لوگ تمہارے پاس آئیں گے' میں نہیں چاہتا کہ تم اُن سے رات کے حوالے سے کوئی بھی بات کرو۔'' پاکیزہ نے پھر سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گونگی تو تم ہو نہیں پھر اس خاموشی کی وجہ؟'' ارسل کو اب اس کی اتنی خاموشی کھٹک رہی تھی۔

''میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں یقین نہیں کرسکتا۔'' ارسل بے یقین تھا۔

''یقین پانے کی اب مجھے خواہش نہیں اور یقین دلانے کی اب میں ضرورت محسوس نہیں کرتی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''بالکل اپنے باپ پر گئی ہو۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی غرور اپنی جگہ قائم ہے مگر یاد رکھنا' میں اب چاہے' تمہارے غرور کو اپنے قدموں تلے روند ڈالوں۔'' جواباً پاکیزہ خاموش رہی اور سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالنے لگی تبھی ارسل بولا۔ ''ماما اور رما آپی نے کچھ ڈریسز تمہارے لیے وارڈروب میں چھوڑے ہیں' اُن میں سے کچھ پہن لو۔'' اس کا لہجہ حاکمانہ تھا۔ پاکیزہ نے کچھ کہے بنا ایک ڈریس نکالا اور فریش ہونے چلی گئی۔

ایک مرتبہ مومنہ نے ارسل کو بتایا تھا کہ پاکیزہ کو بھاری کپڑے اور پرپل کلر بالکل پسند نہیں۔ وہ ایسی چیزیں دیکھتے ہی چڑ جاتی ہے مگر یہ ڈریس اتفاق سے بھاری بھی تھا اور کلر بھی اس کا ناپسندیدہ تھا مگر اس نے اعتراض تو دور' اس پر کسی قسم کا تبصرہ بھی نہیں کیا۔ وہ باہر آئی تو ارسل پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ کلر تو تمہیں بالکل پسند نہیں پھر کیوں پہن لیا؟ چوائسز تو بہت ساری ہیں' کچھ اور پہن لیتیں۔''

''مجھے جینا بھی پسند نہیں' اس کے باوجود جی رہی ہوں تو باقی چیزیں اگر مرضی و خواہش کے برعکس ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''یہ سب باتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تم کتنی مظلوم اور ہم کتنے ظالم ہیں۔ اگر تمہارے ذہن میں یہ سوچ ہے تو اسے کھرچ ڈالو کیونکہ زہر کا پیالہ میرے حصے میں آیا ہے اور یہ زہر مجھے قطرہ قطرہ پینا پڑے گا۔'' اس نے اتنا کہا اور تولیہ لے کر نہانے چلا گیا۔

''زہر پینا کسے کہتے ہیں' شاید اس کا آپ کو اندازہ بھی نہیں۔'' وہ خود سے مخاطب تھی۔

☆.....☆

اریشہ رات سے بے حد پریشان تھی' اس کی آنکھوں نے جو دیکھا تھا' وہ حقیقت تھی مگر اس حقیقت کو قبول کرتے اسے ڈر لگ رہا تھا کیونکہ اگر یہ حقیقت کھل جاتی تو اس کا اور حامد کا رشتہ قائم رہنا ناممکنات میں سے تھا مگر اس نے تمام ڈر اور خدشات بالائے طاق رکھ کر اس سے بات کرنے کا

فیصلہ کرلیا۔

اریشہ نے فون کر کے حامد کو شام کو ریستوران میں بلایا تھا۔

☆......☆

پاکیزہ کمرے میں داخل ہوئی تو طیبہ بیگم ایزی چیئر پر بیٹھی تھیں۔ وہ قریب چلی آئی۔

''دادی......! آپ نے بلایا تھا؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بیٹھو' مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے سامنے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

وہ جا کر بیٹھی تو طیبہ بیگم بھی آ کر اس کے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''میں جانتی ہوں کہ جن حالات میں تم دونوں کی شادی ہوئی ہے' وہ ایسے ہرگز نہیں تھے کہ تم لوگوں کی زندگی کی ابتدا خوشگوار انداز میں ہوئی ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم دونوں کے لیے یہ رشتہ کسی آزمائش سے کم نہیں مگر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر تم اپنے ذہن و دل میں وسعت پیدا کرلو گی تو اس رشتے کو منزل مل جائے گی۔ عورت میں رشتوں کی سمجھ مرد سے زیادہ ہوتی ہے بیٹا!'' وہ نرمی سے بولیں۔

''معاف کیجیے گا دادی جان' عورت میں سمجھ نہیں' صرف سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور سمجھوتہ ان لوگوں اور ان رشتوں سے کیا جاتا ہے جو انسان کے مقدر میں لکھ دیے گئے ہوں اور یہ رشتہ جو میری بہن کا نصیب تھا' میرا مقدر کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ دکھی تھی۔

''ہمارا مقدر' ہماری خواہشات یا جذبات کے تابع نہیں ہوتا۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''میرا دل اور میری روح پہلے ہی بوجھل ہے' میں مزید کسی کی امیدوں یا رشتوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔'' وہ اتنا کہہ کر اٹھی اور چلی گئی۔

اسی وقت ندا بیگم چائے لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اسے روکنا چاہتی تھیں مگر وہ نہیں رکی۔ وہ چائے کی ٹرے لیے اندر چلی آئیں۔

''یہ پاکیزہ کو کیا ہوا؟'' ندا بیگم نے سوالیہ نگاہوں سے طیبہ بیگم کو دیکھا۔

''توقع کے برعکس کچھ بھی نہیں ہوا۔'' طیبہ بیگم گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

''میں ارسل سے بات کروں گی۔'' ندا بیگم صوفے پر ٹکتے ہوئے بولیں۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے' انہیں خود اس رشتے کو سمجھنے دو۔ ابھی ہم جتنا انہیں سمجھائیں گے' یہ ہم سے بدگمان ہوتے جائیں گے اور یہ رشتہ اُن کے لیے بوجھ بنتا جائے گا' یوں بھی ہم انہیں رشتوں کی نزاکت سمجھا سکتے ہیں مگر رشتے نبھانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ 'ندا' تجربہ مشاہدے سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے' انسان تب تک دوسروں کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک اس کے پاس اپنا ذاتی اچھا یا برا تجربہ موجود نہ ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولیں۔ ندا بیگم خاموش ہوگئیں۔

☆......☆

''اب بتاؤ' فون پر اتنا پریشان کیوں تھیں؟'' شام ریستوران میں بیٹھے ہوئے حامد نے اریشہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے بہت بڑی بات ہے مگر میں نہیں جانتی کہ تم اس پر یقین بھی کر سکو گے کہ نہیں؟'' وہ بہت پریشان تھی۔

''تم اطمینان سے کہو' اس یقین کے ساتھ کہ مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے؟'' وہ نرمی سے بولا۔

''حامد' میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میری ماما نے اپنے سے کم ایج کے لڑکے سے شادی کی ہے۔'' اس کا انداز یاد دلانے والا تھا۔

''ہاں تو......'' حامد نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''تو وہ لڑکا کوئی اور نہیں' تمہارا بھائی شاہد ہے۔'' اریشہ نے آخر وہ بات کہہ دی جو وہ کہنا چاہتی تھی۔

''اریشہ' تم ہوش میں تو ہو؟ جانتی بھی ہو' تم کس کے متعلق بات کر رہی ہو؟ میرا بھائی عام انسانوں سے بہت مختلف ہے اور دنیاوی چیزوں کا اسے کوئی لالچ نہیں ہے تو پھر وہ تمہاری والدہ جیسی عمر کی عورت سے شادی کیوں کرے گا؟'' حامد کو غصہ آ گیا۔

''تم اس کے بارے میں جو کہہ رہے ہو' وہ اس کا ایک روپ ہے۔ اس کا دوسرا روپ میں نے دیکھا ہے۔ وہ صرف لالچی ہی نہیں' بلکہ عیاش' بدنیت اور بہت ہی گھٹیا انسان بھی ہے۔ اس نے میری ماں سے دولت کے لیے شادی کی ہے۔ کتنی لڑکیاں ہیں جن سے اس کا افیئر ہے یہاں تک کہ اس نے میرے ساتھ بھی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''بس اریشہ......! میں اگر تم سے محبت کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میرے بھائی کے بارے میں جو چاہو' کہہ سکتی ہو۔ میرا بھائی ایک باکردار شخص ہے۔'' وہ غصے میں آ گیا۔

''تمہارا بھائی ایک مکار شخص ہے جو شاہد بن کر تم لوگوں کو اور سمیر بن کر میری ماں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو یہ دیکھو۔''

اس نے اتنا کہہ کر اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر حامد کے سامنے رکھ دی جس میں وہ اپنے سے کئی گنا بڑی عورت کے ساتھ تھا مگر اس میں شاہد کا حلیہ بدلا ہوا تھا' وہ سیدھا سادہ شاہد نہیں' ایک ہائی سوسائٹی کا رئیس زادہ لگ رہا تھا۔ اس نے میز پر سے تصویر اٹھائی اور بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔ اریشہ اب پریشان تھی۔

☆......☆

حامد سیدھا گھر آیا تھا۔ اتفاق سے مولوی صاحب اور شاہد دونوں گھر پر تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' حامد نے تصویر شاہد کے سامنے رکھ دی اور تصویر پر نظر پڑتے ہی شاہد کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''کیا ہے یہ؟'' مولوی صاحب نے سوالیہ نظروں سے حامد کو دیکھا۔

خدیجہ بیگم اور مدیحہ بھی اندر آ چکی تھیں۔

''آپ کے نیک اور پارسا بیٹے کی اصلیت......'' حامد اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ سب جھوٹ ہے' اریشہ کی سازش ہے' میں تو اس عورت کو جانتا بھی نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''کون اریشہ......؟'' حامد نے معصومیت سے سوال کیا۔

اب شاہد کے پاس جواب نہیں تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں اریشہ کا نام لے لیا تھا۔

''کوئی مجھے بتائے گا کہ یہاں کیا تماشا چل رہا ہے؟'' مولوی صاحب بےزاری سے بولے۔

''آپ جسے بہت نیک سمجھتے ہیں' جسے اپنے غرور کہتے ہیں' وہ ایک دھوکے باز انسان ہے' اس نے ایک عورت کو اکسا کر پہلے اسے طلاق لینے پر مجبور کیا اور پھر دولت کے لیے اس سے شادی کرلی۔ اس کی وجہ سے اُس عورت کی بیٹیاں دربدر ہوگئیں۔ تبلیغی دوروں کے بہانے یہ جو غائب رہتا تھا' یہ...... یہ عیاشی کر رہا تھا۔'' حامد نے اسے حقارت سے دیکھا۔

''شاہد......! تم نے یہ سب کیوں کیا؟'' مولوی صاحب نے صدمے کی سی کیفیت میں پوچھا۔

''یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ساری

زندگی آپ نے ہمیں اصول ونظریات کے بوجھ تلے دبا کر رکھا' ہماری تمام خواہشات اور ہماری شخصیت کو ختم کر دیا' ہمیں ایک عام انسان کی طرح جینے نہیں دیا' اسی لیے مجھے چور دروازہ تلاش کرنا پڑا جس کے کھلتے ہی مجھے وہ سب ملا جو میں چاہتا تھا مگر میری آزاد زندگی میں کبھی کوئی رکاوٹ نہ آئے' اسی لیے میں دہری زندگی جینا شروع کر دی۔ آپ کے سامنے وہی کیا جو آپ چاہتے تھے اور آپ کی نظروں سے اوجھل وہ کیا' جو میں چاہتا تھا۔ میں شاید ساری زندگی آپ سے یہ بات چھپا تا لیکن بہرحال اگر پتا چل بھی گیا ہے تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بھی جو ہوا' اچھا ہوا۔ میں بھی یہ دہری زندگی جیتے جیتے تھک گیا تھا۔ میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میرے لیے خوشی اور سکون ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھا بھی مولوی شمس الدین سامنے آ گئے۔

''تم ہمیں اس طرح سے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ کیا تمہارا باپ تمہارے لیے کچھ نہیں؟''

''آپ میرے لیے وہ ڈیمک ہیں' جو دھیرے دھیرے میری زندگی کی خوشیاں' خواہشیں اور صلاحیتیں چاٹ رہا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر چلا گیا۔ مولوی صاحب بالکل ساکت ہو گئے تھے۔

اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جو بیٹا اُن کا غرور تھا' وہی اُن کے غرور کو پاش پاش کر دے گا۔

☆.....☆

حامد نے پاکیزہ کو فون کر کے شاہد کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ پاکیزہ کو اس کی کہی باتوں اور گھر چھوڑنے کے فیصلے سے دکھ ہوا تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی اور یہ دکھ ایسا تھا جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور یہ دکھ وہ کسی کے ساتھ بانٹنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مولوی شمس الدین' شاہد کو کتنا چاہتے تھے' یہ وہ جانتی تھی' اس لیے یہ سوچ کر وہ فکرمند تھی کہ جانے شاہد کے اس طرح سے چلے جانے پر ابا پر کیا بیت رہی ہوگی۔

کھانے کے دوران بھی وہ یہی سوچ رہی تھی۔ پلیٹ میں کھانا جوں کا توں تھا۔

''کیا ہوا بیٹا' کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟'' محمود صاحب نے پیار سے کہا۔

''وہ.....ویسے ہی.....بھوک ہی نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''صبح ناشتے میں صرف چائے پی' دوپہر میں تھوڑے سے چاول کھائے اور اب بھی کہہ رہی ہو' بھوک نہیں ہے؟'' ندا بیگم حیران تھیں۔

''دل نہیں ہے تو زبردستی کی ضرورت نہیں' یہ اس کا اپنا گھر ہے' جب جی چاہے گا' کھا لے گی۔'' محمود صاحب نے پیار سے کہا۔

''جتنا کچھ پہلے دے چکے ہیں' وہ کافی نہیں ہو اب اس گھر پہ بھی اختیار دے رہے ہیں؟ یہ ناہو کہ مولوی صاحب کل اس کے بھی کاغذات مانگنے لگیں۔'' ارسل طنز سے بولا۔ پاکیزہ کچھ کہے بنا اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''ارسل' یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟'' محمود صاحب نے اسے گھورا۔

''رہنے دیں پاپا' اُن محترمہ کو بھی اپنے والد صاحب کی طرح ناراض ہونے کی عادت سی ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''کھانا ختم کر لو تو مجھے میری اسٹڈی میں ملو۔'' انہوں نے اتنا کہا اور کھانے کی میز چھوڑ کر اٹھ گئے۔

طیبہ بیگم اور ندا بیگم نے بھی کھانا چھوڑ دیا' تب وہ نرمی سے بولا۔

''اچھا سوری' اب آپ لوگ تو کھانا مت چھوڑیں۔''

''سوری' ہمیں نہیں' پاکیزہ کو کہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' ندا بیگم بولیں۔

''اسے کیوں؟'' ارسل نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''جو کچھ تم نے بھائی صاحب کے لیے کہا ہے' اس سے پاکیزہ بہت ہرٹ ہوئی ہے۔'' ندا بیگم نے وضاحت کی۔

''اچھا بابا' اسے بھی کہہ دوں گا مگر اس وقت میں اتنے مزے کا کھانا چھوڑ کر جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ اس انداز میں بولا کہ ندا بیگم مزید اصرار نہ کر سکیں۔

☆.....☆

محمود صاحب نے ارسل کو بہت کچھ سنا دیا تھا' اس لیے جب وہ کمرے میں آیا تو بہت غصے میں تھا اور ایسے میں پاکیزہ کو کھڑکی میں کھڑے ہو کر اطمینان سے لان کا نظارہ کرتے دیکھ کر ارسل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اس کی پشت پر آن ٹھہرا۔ پاکیزہ کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔

''اتنے ڈرامائی انداز میں میز سے اٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ دہاڑا۔ پاکیزہ نے کوئی جواب نہیں دیا' تب وہ مزید بولا۔ ''مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ سچ لوگوں کو اتنا کڑوا کیوں لگتا ہے؟'' وہ طنز سے بولا۔

''میری زندگی میں ہر سچ جھوٹ کا سہارا لے کر داخل ہوا ہے' اس لیے میرے پاس دونوں پر تبصرہ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم مظلوم اور ساری دنیا ظالم ہے؟'' وہ ناگواری سے بولا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''تمہارا انداز' تمہارا رویہ تو یہی ثابت کرتا ہے کہ میں تم پر ظلم ڈھا رہا ہوں؟''

اس کو غصہ آ رہا تھا مگر جواباً وہ بڑے سکون سے بولی۔ ''اگر آپ کو مزید کچھ نہیں کہنا تو کیا میں سو سکتی ہوں؟'' وہ اجازت طلب کر رہی تھی۔

☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک ارسل کی آنکھ کھل گئی۔ اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی' اس لیے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے کمرے میں سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے صوفے کی جانب دیکھا' وہاں پاکیزہ موجود نہیں تھی۔ اس نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں تو وہ اسے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی روتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ارسل کو سامنے دیکھ کر اس نے جلدی سے سر ڈھانپا اور آنسو صاف کیے۔ وہ اکڑوں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اتنا حبسی نہیں ہوں کہ تم مجھ سے اپنے آنسو بھی چھپاؤ۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اس قدر اپنے بھی نہیں کہ آپ کو اپنا ہر زخم دکھا سکوں۔'' اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

''تو کون ہیں تمہارے اپنے؟ وہ جنہوں نے تمہیں بیچ دیا؟'' وہ طنز سے بولا۔

''مجھے اپنی حیثیت اور اپنا مقام اچھی طرح پتا ہے۔ آپ کو بار بار یاد دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ دکھ سے بولی۔

ارسل کو اس لمحے تھوڑی سی ندامت ہوئی۔ اسے شاید اس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی' اس لیے اس مرتبہ نرمی سے گویا ہوا۔

''اگر میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے تو اس کے لیے سوری۔''

''سوری انہیں کہا جاتا ہے جن کی کوئی عزت ہوتی ہے اور ایک اغوا شدہ لڑکی جس کے اپنوں نے

اس کی بولی لگائی ہو‘اس کی عزت کی بھلا کیا قیمت ہوسکتی ہے۔‘‘ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ارسل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا ہاتھ یوں لگا کہ جیسے کوئی انگارہ چھولیا ہو‘وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

’’تمہیں تو بہت تیز بخار ہے‘ تم نے بتایا بھی نہیں؟‘‘ پاکیزہ نے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔

’’میں ٹھیک ہوں‘ آپ سو جائیں۔‘‘

’’تمہیں اس طرح تکلیف میں چھوڑ کر؟‘‘ وہ حیرت سے بولا۔

’’یہ پہلے دن طے ہو چکا تھا کہ میری خوشیاں‘غم یا کوئی بھی تکلیف نہ کبھی آپ کا مسئلہ ہوگی اور نہ ہی ان کا حصہ دار بنے رہنا آپ کا فرض ہوگا۔‘‘اس کا انداز جتانے والا تھا۔

ارسل بنا کچھ کہے بیڈ کی جانب بڑھا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ٹیبلیٹ نکال کر پانی کا گلاس بھرا اور اس کے پاس چلا آیا۔

’’یہ کھا لو‘ بہتر فیل کرو گی اور سکون سے سو سکو گی۔‘‘ اسے جانے کیوں پاکیزہ پر ترس آرہا تھا۔

’’میں نے سنا تھا کہ آپ اپنی چیزوں کا بہت خیال رکھتے ہیں‘ آج یقین آگیا۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔

’’جو تم نے کہا ہے‘اس کی وضاحت کرو‘ میں نے کب تمہیں بے جان چیز کہا؟‘‘ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’جسے خریدا اور بیچا جائے‘ وہ جیتا جاگتا انسان تو نہیں ہوسکتا نا؟‘‘ وہ دکھی تھی۔

’’تمہیں جو کہنا ہے‘ کہو‘جو سوچنا ہے‘ سوچو‘ آئی ڈونٹ کیئر۔ یہ میری بے وقوفی ہے کہ تم سے ہمدردی کرنے چلا آیا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم سے ہمدردی کرنا بھی اتنا مشکل ہے۔‘‘ وہ بے زاری سے بولا اور گلاس اور ٹیبلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس بیڈ پر لیٹ گیا۔

وہ بھی واپس اپنی جگہ پر آکر لیٹ گئی۔

☆......☆

شاہد جب سے گھر چھوڑ کر گیا تھا‘ مولوی شمس الدین خاموش ہو گئے تھے۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

اچانک انہیں فالج کا اٹیک ہوگیا۔

حامد نے فی الحال پاکیزہ کو یہ اطلاع دینے کو منع کیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جس طرح سے پاکیزہ ان کے گھر سے رخصت ہوئی تھی‘ اس کے بعد فوراً ایسی اطلاع پا کر جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ ابھی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ابھی تو وہ اپنی نئی ذمہ داریاں نبھا رہی ہوگی۔

حامد ان کی خدمت میں لگا ہوا تھا تب ہی اریشہ بھی اس سے ملنے آئی تھی مگر جتنی دیر وہ بیٹھی رہی‘ حامد نے اس سے بات بھی نہیں کی تھی، اس لیے آج وہ اس سے آفس میں ملنے آئی تھی۔

’’جو ہوا‘ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں پھر مجھ سے کیوں خفا ہو؟‘‘ اریشہ کو بے چینی ہورہی تھی۔

’’تمہارا کوئی قصور نہیں مگر اس کے باوجود آج میرے باپ کی جو حالت ہے‘اس کی ذمہ دار تم ہی ہو اور میں خود کو بھی کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیا تھا اگر میں یہ سچائی چھپا لیتا‘ اس طرح کم سے کم میرا بھائی ہمارے پاس ہوتا اور میرے ابا ٹھیک ہوتے۔‘‘ اس کے اندر بہت سارے دکھ یکلخت بولے تھے۔

’’اتنا کچھ کہہ چکے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ کوئی راستہ ہے جس پر ہم ساتھ چل سکیں۔‘‘ اریشہ نے بڑی آس سے حامد کو دیکھا۔

’’اب کسی بھی راستے پر ہمارا ایک ساتھ چلنا ناممکن ہے۔‘‘ وہ قدرے سفاکی سے بولا۔

’’میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ تم یہ فیصلہ اتنی آسانی سے کرلو گے۔‘‘ وہ دکھ سے بولی۔

’’میں نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ تمہاری وجہ سے میں اتنا کچھ کھو دوں گا۔‘‘ وہ بھی دکھی تھا۔

اریشہ نے مزید کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے باہر چلی آئی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے حامد سے کبھی محبت نہیں تھی لیکن یہ یقین ضرور تھا کہ وہ اسے کبھی بیچ راہ نہیں چھوڑے گا۔

آج اس کا یقین ٹوٹ گیا تھا اور یقین ٹوٹنے سے جو تکلیف ہوتی ہے‘ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

☆......☆

پاکیزہ کی آنکھ کھلی تو اسے سر میں درد محسوس ہونے لگا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ وہ صوفے پر نہیں‘ بیڈ پر موجود ہے۔ اس نے جلتی آنکھوں سے سامنے دیکھا‘ ارسل صوفے پر سو رہا تھا۔ اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی۔

’کتنی قابلِ رحم ہوگئی ہوں میں کہ میرے دشمن بھی مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔‘اس نے تاسف سے سوچا۔ ’سمجھ نہیں آرہی کہ میں اپنی حالت پر روؤں یا ہنسوں؟‘ وہ بے حد تکلیف محسوس کررہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تبھی ارسل بھی اٹھ گیا اور اٹھتے ہی اس کے پاس چلا آیا۔

’’اب کیسی طبیعت ہے؟‘‘اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

’’میں ٹھیک ہوں اور آئی ایم سوری کہ آپ کو میری وجہ سے وہاں سونا پڑا۔‘‘ وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولی۔

’’اتنا فارمل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں‘ باقی باتیں اپنی جگہ مگر بہرحال میں بھی انسان ہوں اور اپنے جیسے دوسرے انسان کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہیں ہوسکتا اور ہاں‘ ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہو جانا‘ میں تمہیں ہاسپٹل لے جاؤں گا۔‘‘ وہ واقعی اس کو انسان کی طرح ہی ٹریٹ کر رہا تھا۔

’’آپ رہنے دیں‘ آپ کو آفس جانا ہوگا خوامخواہ میں وقت ضائع ہوگا۔‘‘ وہ نرمی سے بولی۔

’’وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے‘ تم سے جو میں کہہ رہا ہوں‘ تم وہ کرو۔‘‘ اس مرتبہ اُس کا انداز حاکمانہ تھا۔

☆......☆

’’آؤ‘ آؤ‘ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔‘‘ وہ‘ اریشہ کو اپنے اپارٹمنٹ میں دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوئیں۔

’’مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔‘‘ اریشہ سنجیدہ تھی۔

’’یہی نا کہ سمیر درحقیقت شاہد ہے اور ایک مولوی کا بیٹا ہے۔‘‘ وہ اطمینان سے بولیں۔

’’آپ کو کیسے پتا؟‘‘ وہ حیران ہوئی۔

’’سمیر نے مجھے خود بتایا ہے۔‘‘ وہ اسی انداز میں بولیں۔

’’مگر اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا ہوگا کہ اس نے آپ کو دولت کی خاطر دھوکہ دیا ہے؟‘‘ اریشہ جلدی سے بولی۔

’’وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے اور اس نے جو کیا‘ اسی محبت کی خاطر کیا۔ محبت میں تو سو گناہ معاف کردیے جاتے ہیں‘ ایک جھوٹ کیا چیز ہے۔‘‘ شاہد کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

’’حیرت ہے‘ پاپا کے تو سچ پر آپ نے کبھی یقین نہیں کیا اور اس شخص کا جھوٹ بھی آپ کے لیے اہم ہے۔‘‘ وہ حیران تھی۔

’’تمہارا باپ ایک بدکردار انسان ہے‘اس نے

میرے ہوتے ہوئے دوسری عورت کو مجھ سا مقام دے دیا مگر میرا ایسا نہیں ہے۔" وہ پریقین تھیں۔

"وہ کتنا گھٹیا ہے اس کا اندازہ آپ کو بہت جلد ہو جائے گا۔ میرا کام آپ کو سچ بتانا تھا یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی مرضی ہے۔" وہ اتنا کہہ کر جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔

☆......☆

"ماما جان پلیز رونا بند کردیں۔ اگر پاکیزہ کو پتا چلا تو وہ دکھی ہو جائے گی اور حامد نے بھی تو منع کیا ہے کہ ابھی اسے بھائی صاحب کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔" ندا بیگم نے انہیں تسلی دی۔

"شمس الدین کو اچانک سے کیا ہوا؟" طیبہ بیگم بے حد دکھی تھیں۔

"حامد نے بس اتنا کہا ہے کہ بھائی صاحب کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ اب وہاں جائیں گے تو پتا چلے گا کہ اصل بات کیا ہے۔" ندا بیگم نے وضاحت دی۔

"تم نے محمود کو بتایا؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ارسل تو آج آفس گیا نہیں ہے۔ وہ بھی آجائیں گے تو کام کا حرج ہوگا اور ویسے بھی محمود کو اچانک سے گھر میں دیکھ کر پاکیزہ سوچے گی تو ضرور کہ وہ بے وقت گھر کیوں چلے آئے؟" ندا بیگم نے وجہ بتائی۔

"تو پھر ہم چلتے ہیں۔" طیبہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ٹھیک ہے میں نمرہ سے کہتی ہوں کہ وہ ہما کے ساتھ گھر پر رہے تاکہ پاکیزہ کچھ محسوس نہ کرے بس ابھی چلتے ہیں۔ آپ کو اگر چینج کرنا ہو تو کرلیں۔" ندا بیگم اتنا کہہ کر چلی گئیں۔

مولوی شمس الدین کی حالت دیکھ کر اور شاہد کے متعلق سب کچھ جان کر ندا بیگم اور طیبہ بیگم بہت دکھی تھیں۔ وہ خدیجہ مدیحہ اور حامد تینوں کو تسلی دے رہی تھیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

☆......☆

ہاسپٹل میں کافی وقت لگ گیا تھا، اس لیے جب تک وہ فارغ ہوئے تب تک لنچ کا ٹائم ہو گیا۔

وہ پاکیزہ کو ایک ریسٹوران میں لے آیا وہیں اس کی ملاقات اپنے ایک دوست اور اس کی بیوی سے ہوگئی جو اس کی شادی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

"ارسل بھائی یہ کون ہیں؟" اس عورت نے دلچسپی سے پاکیزہ کو دیکھا جو ان کی سوسائٹی سے بالکل مختلف تھی۔

"یہ میری مسز ہیں۔" ارسل نے جلدی سے کہا۔

"اور اب باقی میں بتاتا ہوں۔" اس کا دوست شجاع بولا۔ "یہ مومنہ ہیں جن کے عشق میں ہمارا ارسل پاگل ہے ویسے مان گئے تمہاری محبت کو جسے چاہا اسے پالیا۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔

تبھی ارسل بولا۔ "شجاع ان کا نام پاکیزہ ہے۔"

شجاع کی ہنسی ایک دم سے غائب ہوگئی۔ اس کی بیوی بھی کچھ شرمندہ سی تھی۔

"آئی ایم سوری بھابھی مجھے پتا نہیں تھا اور آپ پلیز میری باتوں پر دھیان مت دیں میں تو یونہی بولتا رہتا ہوں۔" وہ وضاحت دے رہا تھا۔

"اٹس او کے۔" پاکیزہ نے نرمی سے کہا اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ ارسل بھی حیران ہوا تھا۔

☆......☆

ارسل فریش ہو کر باہر آیا تو پاکیزہ بیڈ پر تکیے سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی وہ قریب چلا آیا۔

"تھینکس تم نے جھوٹ بول کر سہی شجاع کو شرمندگی سے بچا لیا۔"

پاکیزہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کی کوئی بات بری ہی نہیں لگی۔" وہ ایک مرتبہ پھر ارسل کو حیران کر گئی۔

"یہ ناقابلِ یقین بات ہے کوئی بھی عورت اس عورت کا وجود تو کیا نام بھی برداشت نہیں کرسکتی جو اس کے شوہر کی زندگی میں اہم ہو اور جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا ہو۔" وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

"کسی عورت میں اور مجھ میں بہت فرق ہے ایسی فیلنگز ان عورتوں کی ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں سے اپنے خواب خواہشات اور توقعات وابستہ کرلیتی ہیں۔ خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے خواہشات کو دل میں جگہ بنانے نہیں دی اور توقعات...... وہ بھی اب کسی سے نہیں ہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں میری محبت توجہ ساتھ کچھ بھی نہیں چاہیے؟" وہ بےیقین سا تھا۔

"میں خدا سے کبھی وہ نہیں مانگتی جس کے متعلق مجھے یقین ہو کہ وہ چیز میرے لیے ہے ہی نہیں۔" وہ نگاہوں کا زاویہ بدل کر بولی۔

"اگر میرے اور مومنہ کے جذبات کی گہرائی سے اس قدر واقف تھیں تو یہ شادی کیوں کی؟" وہ شاکی انداز میں بولا۔

"میری شادی ہونا ضروری تھی کیوں؟ یہ آپ جانتے ہیں۔" انداز جتانے والا تھا۔ اس مرتبہ ارسل نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ وہ مزید بولی۔ "اور رہی بات کہ آپ سے کیوں کی تو کسی نے میری رائے لینا تو دور مجھ سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ جسے جو ٹھیک لگا وہ کرتا چلا گیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا تو میں دنیا کے کسی بھی شخص کا انتخاب کر لیتی مگر آپ کا نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ مومنہ کی جگہ آکر تمہیں کیسا لگ رہا ہوگا مگر تم فکر مت کرو جس دن مومنہ آگئی تمہیں اس بندھن سے رہائی مل جائے گی۔ اس کے بعد تم جیسے اور جس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہو کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔" وہ نرمی سے بولا۔ پاکیزہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

☆......☆

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حامد تمہارے ساتھ اس طرح کرے گا۔" عبیرہ کو افسوس ہو رہا تھا۔ دونوں اس وقت ماہین کے گھر پر تھیں۔

"میں جن غیر یقینی حالات سے اپنے والدین کی وجہ سے گزر چکی ہوں اس کے بعد شاید میرے لیے یہ سب غیر معمولی نہیں ہے۔" اریشہ سنجیدگی سے بولی۔

"تعلق خاص ہو یا عام یوں اچانک ٹوٹ جانے کا دکھ تو ہوتا ہے نا۔" عبیرہ بولی۔

"میں تو کہتی ہوں جو ہوا اچھا ہوا۔ جو شخص اتنی سی بات پر بیچ راہ میں چھوڑ سکتا ہے وہ اس قابل ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اسے انسان عمر بھر کا یقین سونپ دے۔" ماہین جلدی سے بولی۔

"ماہین ٹھیک کہہ رہی ہے اریشہ یوں بھی اگر خدا ہم سے ایک چیز لے لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس سے بہتر چیز دینا چاہتا ہے۔ تم دیکھنا تمہیں ایسے انسان کا ساتھ ملے گا جو تمہارے ہر دکھ کا مداوا کردے گا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ اریشہ خاموش تھی۔

☆......☆

"آپ لوگ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟" رات ناشتے کی میز پر سب جمع ہوئے تو ارسل نے پوچھا۔ محمود صاحب بھی متوجہ ہوگئے۔

"ہاں' وہ میں اور ماما جان اپنے ایک پرانے جاننے والوں کے یہاں عیادت کو گئے تھے۔ تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتایا کہ تم لوگ خوامخواہ پریشان ہوگے۔" ندا بیگم نے جلدی سے کہا تو ارسل مطمئن ہوگیا، البتہ محمود صاحب کو ندا بیگم کا پریشان چہرہ دیکھ کر پریشانی ہو رہی تھی۔ کچھ طیبہ بیگم کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بھی گمان ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے مگر بہرحال اس وقت، وہ بچوں کے سامنے انہیں کریدکریدکر ان کا بھرم نہیں توڑنا چاہتے تھے۔

"کیا ہوا' خیریت تو ہے؟" ندا بیگم جو نہی تمام کاموں سے فارغ ہوکر کمرے میں آئیں تو محمود صاحب نے پہلا سوال یہی کیا۔

"میری صورت دیکھ کر آپ کو الہام ہو جاتا ہے کہ خیریت نہیں ہے۔" وہ مسکرائیں۔

محمود صاحب نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

تمہاری کیفیات جاننے کے لیے مجھے لفظوں کی ضرورت نہیں۔" اُن کے لہجے میں محبت تھی۔

"اگر اندازہ ہوگیا تھا تو اس وقت کیوں نہیں پوچھا؟" وہ دلچسپی سے بولیں۔

"تم شاید بچوں سے چھپانا چاہتی تھیں، اس لیے مناسب نہیں لگا اور یوں بھی میاں بیوی کو ایک دوسرے کا بھرم ہر حال میں قائم رکھنا چاہیے۔"

"بھائی صاحب کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔" آخر انہوں نے بم پھوڑ ہی دیا۔

"کب' کیسے اور تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" وہ شاکڈ تھے۔

"صبح حامد کا فون آیا تو ہمیں پتا چلا۔ ہم وہیں گئے تھے۔ آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ بات پاکیزہ تک پہنچے۔ اس کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور آپ کو یوں اچانک بلاتے تو یہ سب چھپانا بڑا مشکل ہو جاتا۔" ندا بیگم نے وضاحت کی۔

"اب بھائی صاحب کیسے ہیں؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"پہلے سے بہتر ہیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے حامد سے کہا ہے کہ انہیں اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ سارا خرچہ ہم خود اٹھائیں گے۔" وہ نرمی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے مگر اس وقت میں انہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔" وہ پریشان ہوگئے تھے۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔" وہ اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"ابھی چلیں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"اس وقت بہت رات ہو چکی ہے۔ وہ لوگ سارا سارا دن جاگتے ہیں۔ ابھی تو سو گئے ہوں گے۔ اس وقت انہیں پریشان کرنا اچھی بات نہیں ہے۔" وہ نرمی سے بولیں۔

محمود نے اثبات میں سر ہلا دیا گویا وہ اُن سے متفق تھے۔ ندا بیگم اب مطمئن تھیں۔

☆.....☆

اریشہ، کمرے میں داخل ہوئی تو علیشہ لیٹی ہوئی تھی۔ "کیا ہوا' تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟" علیشہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

"یونہی آپی' بھوک نہیں ہے۔" علیشہ جلدی سے بولی۔

"تمہاری بھوک کو کیا ہوگیا ہے اور یہ وقت بے وقت تم بستر میں کیوں لیٹی رہتی ہو؟ چہرہ دیکھ کر لگتا

ہے جیسے بہت تھکی ہوئی ہو۔" اریشہ نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ پریشان مت ہوں' میں ٹھیک ہوں۔" وہ نگاہوں کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔

اریشہ آکر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"علیشہ، تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہیں؟" وہ فکرمندی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں' بس ذرا سا سر میں درد ہے۔ تھوڑا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

"اگر تم کہو تو صبح ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"نہیں ڈاکٹر نہیں..... مطلب' ضرورت نہیں ہے۔" وہ بری طرح بوکھلا گئی۔

اریشہ کو اس کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

☆.....☆

ارسل کافی دیر سے ٹی وی لاؤنج میں تھا۔ واپس کمرے میں لوٹا تو وہ صوفے پر بستر لگائے لیٹ چکی تھی۔ وہ قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بیڈ پر سونا پھر دوبارہ یہاں سونے کا مطلب؟" اسے غصہ آگیا۔

"وہ..... چاچی نے بتایا کہ آپ اپنے بیڈ کے بنا سو نہیں پاتے پھر رات کو میں نے دیکھا بھی کہ آپ کو تھنی پرابلم ہوئی تھی اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنے بستر پر ہی سو ئیں۔ بلیوی' مجھے یہاں کوئی پرابلم نہیں اور اب تو بخار بھی اتر چکا ہے۔ صبح تک میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔" وہ نرمی سے بولی۔

"ٹھیک ہے' اگر تمہیں میری اتنی فکر ہے تو تم بھی وہیں میرے ساتھ بیڈ پر سو جاؤ۔" وہ نارمل سے لہجے میں بولا۔

اس کی بات پر پاکیزہ چونکی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے اور یوں بھی ہماری شادی ہو چکی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

پاکیزہ خاموش ہوگئی۔ شاید اس لیے کہ اس معاملے میں بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

☆.....☆

صبح آنکھ کھلتے ہی پاکیزہ کی پہلی نگاہ اپنے برابر سوئے اس شخص پر پڑی جس نے کل رات اچانک ہی اپنے اور اس کے درمیان کے تمام فاصلے مٹا ڈالے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں' جو ہوا تھا' اچھا تھا یا برا' بہرحال ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر فریش ہونے چلی گئی۔ واپس آئی تو ارسل جاگ چکا تھا۔ ملازم اسے بیڈ ٹی دے گیا تھا جو سائیڈ ٹیبل پر موجود تھی۔ ارسل بیڈ پر بیٹھا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرکے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بال سلجھانے لگی۔ ارسل آکر اس کی پشت پر قدرے فاصلے سے کھڑا ہوگیا۔

"رات جو ہوا' وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیسے سب کچھ پس منظر میں چلا گیا اور فقط ایک مرد کی ایک خواہش اور ایک ضرورت رہ گئی۔" وہ نہایت صاف گوئی سے بولا' اس بات سے بے خبر کہ اس کے الفاظ سامنے والے کو اپنے حقیر اور ارزاں ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ پاکیزہ خاموش رہی' تب وہ مزید بولا۔ "تم کچھ نہیں کہو گی؟"

"آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں؟" وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولی۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اس رشتے کی وجہ سے اس خوش فہمی کا شکار ہو جاؤ کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں' میرے دل میں تمہارے لیے جذبات ہیں اور تم نے مومنہ کی جگہ لے لی ہے۔" وہ حد درجہ سنگدلی سے بولا۔

(اس دلچسپ ناول کی تیسری اور آخری قسط اگلے ماہ پڑھیے۔)

ناولٹ

رضوانہ عزیز شیخ

روشن ہوئے چراغ راستے

اب بہت حد تک اس خوفناک خواب کو وہ بھول چکی تھی۔ البتہ اپنے ننھے سے بیٹے کو بھلانا اُس کے لیے ممکن نہ تھا۔ آج بھی اچانک ہی کام کرتے کرتے جنید کی یاد آ گئی، نامعلوم وہ کب تک کھوئی رہتی اگر شہزاد.....

احساس کی گیرائی لیے، نئی مصنفہ کی دوشیزہ کے لیے پہلی تحریر، ناولٹ کی صورت

دو ہفتے کی ہنگامہ آرائی کے بعد معمولات زندگی بحال ہونے لگے تھے۔ ارجمند کی شادی کو پندرہ دن ہوگئے تھے۔ وہ کچن میں ناشتے کے بعد کچن کی صفائی کررہی تھی۔ اسے بارہ بجے تک دوپہر کے کھانے کی تیاری بھی کرنی تھی۔

اس کی ساس کشور بیگم نے اب رسمی ناز برداریوں سے ہاتھ کھینچ کر روایتی ساسوں والا رویہ اپنانا شروع کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے رویے میں روایتی سرد مہری بھی جھلکنے لگی تھی۔

"ارجمند! ارے بھئی کہاں ہو؟"

کشور بیگم کی آواز پر وہ تیزی سے ان کے کمرے میں پہنچی۔

"جی امی۔" وہ دروازے میں کھڑی سعادت مندی سے پوچھنے لگی۔

"آج دوپہر کے کھانے میں بریانی بنالو۔ فہد کے ماموں آرہے ہیں۔ کھانا یہیں کھائیں گے۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولیں۔ "اور ہاں آئندہ مجھے امی مت کہنا۔ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"وہ..... مجھے فہد نے یہی کہا تھا کہ میں آپ کو امی کہا کروں۔" ارجمند نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔ سمجھیں اور جاکر کام دیکھو۔" کشور بیگم کے لہجے میں مزید اور سختی آگئی۔

"جی۔" وہ خاموشی سے سر ہلاتی دوبارہ کچن میں آگئی۔

دوپہر ڈیڑھ بجے تک ماموں جان آگئے، کھانے کی تیاری میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ اس نے جلدی جلدی رائتہ تیار کیا اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ ماموں جان کو بریانی بہت پسند آئی تھی۔ انہوں نے فوراً تعریف کی۔

"ارجمند بیٹا! کھانا بہت اچھا بناتی ہیں آپ۔"

"شکریہ ماموں جان۔" وہ مسکرائی۔

"کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ ارجمند بیٹی نے گھر کے باقی کام بھی سنبھال لیے ہیں۔" اس کے سسر رفیق صاحب نے بھی ماموں جان کی تائید کی۔

رفیق انکل، ارجمند کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور وہ بھی ان کی شخصیت میں باپ کی شفقت محسوس کرتی تھی۔ وہ روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں بالخصوص کھانا بنانے پر اس کی تعریف ضرور کرتے تھے تاکہ اسے نئے گھر اور نئے ماحول میں اپنی جگہ بنانے میں آسانی ہو۔ ان کے خیالات، کشور بیگم کی روایتی سوچ سے خاصے مختلف تھے، جس پر اکثر بیگم سے ناراضگی بھی رہتی لیکن وہ ٹال دیتے تھے۔

"آپ آج کل بہو بیگم کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔ خیر تو ہے۔ اتنی تعریف تو اس کی، میں نے فہد کے منہ سے بھی نہیں سنی۔ ٹی وی بند کرکے کشور بیگم نے کتاب پڑھتے رفیق صاحب کو مخاطب کیا۔

"وہ نئی نئی اس گھر میں آئی ہے بیگم..... ہماری حوصلہ افزائی اور شفقت سے جلدی ایڈجسٹ ہو سکے گی۔"

"ہونہہ! آپ کو بڑی فکر ہے بہو محترمہ کے ایڈجسٹ ہونے کی۔" کشور بیگم الفاظ چباتے ہوئے بولیں۔

"آخر آپ کو اس سے شکایت کیا ہے۔ دو ہفتے تو گزرے ہیں شادی کو۔" رفیق صاحب نے کتاب بند کردی۔

"ایک چھوٹی کوڑی تو رانی صاحبہ اپنے ساتھ لائی نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ شکایت کیا ہے؟"

یہ بات کشور بیگم کو شادی سے پہلے بھی کھٹک رہی تھی اور آج دل کی بات زبان سے ادا ہو ہی گئی تھی۔

"ایسا نہ کہیے کشور۔ پلیز ایسا نہ کہیے۔ وہ بچی

سلیقہ مندی، شرافت اور اعلیٰ اخلاق کی دولت سے مالا مال ہے۔ جس کے سامنے لاکھوں کا جہیز بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔" رفیق صاحب نے سمجھایا۔

"اجی رہنے دیں۔ بھاڑ میں جائے اخلاق اور شرافت۔ اچار ڈالنا مجھے ان فضول چیزوں کا۔" کشور بیگم غصے سے بولیں۔

"جن باتوں کا تم یہاں راگ الاپ رہے ہو ناں۔ آج کل کے دور میں ان کی نکے کی بھی اوقات نہیں ہے۔" ان کی پیشانی کی شکنیں مزید گہری ہوگئیں۔

"اچھا تو پھر کس چیز کی اوقات ہے آپ کی نظر میں؟"

"ہونہہ..... میرا منہ نہ کھلواؤ۔ بولوں گی تو تم سے برداشت نہ ہوگا۔" وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ رفیق صاحب نے بھی غصے سے رخ بدل لیا۔

☆.....☆

ارجمند، رفیق صاحب کے مرحوم دوست کی بیٹی تھی۔ اظہر صاحب، ارجمند کی شادی کے لیے بہت پریشان تھے۔ گریجویشن کے بعد ارجمند کے لیے چند رشتے دیکھے گئے مگر ہر کسی کو بھاری جہیز درکار تھا۔ رشتے کے لیے آنے والے کی خاطر تواضع پر سینکڑوں روپے خرچ ہوتے مگر جب بات نہ بنتی تو وہ بہت مایوس ہوجاتے۔

رفیق صاحب اپنے دوست کی پریشانی سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا۔ "فی الحال بیٹی کی شادی کا معاملہ موخر کردو۔ ابھی وہ صرف گریجویٹ ہے۔ اسے یونیورسٹی میں داخل کرواؤ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو زیادہ اچھے رشتے ملتے ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے نا صرف اس کی قدر بڑھے گی بلکہ وہ اپنا اور تم سب کا سہارا بھی بن سکے گی۔ دو تین سال ٹھہر جاؤ۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

اظہر صاحب نے گھر آکر مہناز بیگم سے مشورہ کیا۔ وہ بھی رفیق صاحب کی رائے سے متفق تھیں۔

"رفیق بھائی بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جاب وہ نہ بھی کرے۔ سسرال میں اس کی عزت تو ہوگی۔ اللہ ہماری بچی کو اس لائق کرے۔" مہناز بیگم نے دعا دی۔

"آمین۔ ارجمند بیٹی خیر خیریت سے ایم اے کرلے۔ اس دوران ہم کوشش کرکے کچھ چیزیں بھی اس کے جہیز کے لیے بنا لیں گے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔" اظہر صاحب نے کہا۔

"میری بچی تو آج کل چپ چپ رہنے لگی ہے۔ جو دیکھنے آتا ہے بعد میں کسی بہانے سے انکار کردیتا ہے۔ کہہ رہی تھی مجھ سے روز روز لوگوں کے سامنے نہیں جایا جاتا تماشا بن کے۔" مہناز بیگم بولیں۔

"تم اسے بتا دو کہ ابھی ہم نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ اب اسے کسی کے سامنے نہیں جانا پڑے گا اور اسے خوش خبری سنا دو کہ وہ یونیورسٹی میں داخلے کی تیاری کرے۔" اظہر صاحب مسکرائے۔

"ضرور..... کیوں نہیں۔" مہناز بیگم بھی مطمئن ہوگئیں۔

دونوں میاں بیوی خوشی خوشی اپنی بیٹی کے مستقبل کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے۔

ارجمند کو بھی زندگی کا یہ نیا رخ بہت بھلا لگا۔ وہ شادی اور رشتے کی الجھنوں سے نکل کر یونیورسٹی کی خوب صورت اور آزاد فضاؤں کی خوشبو محسوس کرنے لگی۔ اس کے لیے یہ تصور ہی بہت روح افزا تھا۔ زندگی ایک نئی راہ پر آنے والی تھی۔

☆.....☆

یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات میں پہلا دن تھا۔ بعد سب طلبہ و طالبات ایک دوجے سے متعارف

ہو رہے تھے۔ شعبہ نفسیات کی زندگی میں اہمیت بیان کی جا رہی تھی۔

وہ اپنی زندگی کے ان دو سالوں کے حوالے سے شدید پرجوش تھی۔ اب اس نے شادی کے خیال کو ذہن سے نکال کر اپنے مستقبل کے خواب تراشنا شروع کر دیے تھے۔ اب وہ کیریئر کے بارے میں خاصی سنجیدہ تھی۔

اپنے سبجیکٹ پر پوری توجہ مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اپنے پسندیدہ شعبے کی تعلیم و تربیت وہ پورے ذوق و شوق سے حاصل کر رہی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسٹڈیز اور ریسرچ اس کی دلچسپی میں مزید اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔ لائبریری میں وہ ایک روز Behavioural Sciences کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ شہزاد نے آ کر اسے چونکا دیا۔ ارجمند نے پلٹ کر دیکھا تو اسے مسکراتے پایا۔

"ہر وقت کتابوں میں سر کھپاتی ہو میڈم سائیکالوجی۔ کیا کرو گی اتنا پڑھ کے۔ کبھی اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیا کرو۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"جناب! آپ اتنے ہینڈسم بھی نہیں ہیں کہ لڑکیاں پڑھائی چھوڑ کر صرف آپ کو دیکھتی رہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں بالکل بھی خوب صورت نہیں ہوں؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"کتنا بولتے ہو تم۔ تمہیں تو سائیکالوجسٹ کی بجائے ایکٹر بننا چاہیے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر میڈم۔" وہ واقعی ایکٹنگ کرنے لگا۔ ابھی وہ کچھ اور ڈائیلاگز بھی بولتا لیکن ارجمند نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فوراً اسے خاموش کروا دیا۔

"شی...... باتیں مت کرو...... یہ لائبریری ہے۔"

پھر وہ رفتہ رفتہ بہت اچھے دوست بن گئے۔ تاہم ارجمند نے خود کو صرف شہزاد تک محدود نہیں رکھا بلکہ دیگر کلاس فیلوز سے بھی اچھے تعلقات رکھے۔ وہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اور نہ ہی کوئی اسکینڈل افورڈ کر سکتی تھی۔

خوش اخلاق اور خوش گفتار تو وہ تھی ہی۔ شہزاد کی رفاقت نے اسے بذلہ سنجی بھی سکھا دی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلے نے اس کی طبیعت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔ ورنہ پہلے تو وہ خاصی سنجیدہ رہا کرتی تھی۔ اب وہ گھر آ کر چھوٹی بہن انجمن اور امی سے ہنستی بولتی اور گھر میں رونق لگاتی۔ ہاں لیکن، اس نے شہزاد کا ذکر کبھی خاص طور پر نہ کیا۔ اس کا تعارف ارجمند نے صرف کلاس فیلو کی حیثیت سے کروایا تھا۔ ایک تو وہ ای ابو کے مزاج سے واقف تھی، دوسرے شہزاد سے کبھی پسندیدگی یا شادی کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

دونوں بے تکلف ضرور تھے لیکن مستقبل میں کوئی نیا تعلق قائم کرنے کے معاملے میں وہ غیر یقینی کا شکار تھی۔ شہزاد اپنے والدین کا واحد بیٹا تھا اور گلبرگ جیسے پوش علاقے میں اس کا گھر تھا۔

طبقاتی تفریق نے ارجمند کو کبھی ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ شہزاد نے خود بھی کبھی یہ موضوع نہ چھیڑا، لہٰذا اس کا حالِ دل بھی آشکار نہ ہو سکا۔ اس نے بیرونِ ملک تعلیم کے حوالے سے چند بار دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ جس سے اس کے مستقبل کے ارادے ظاہر تھے۔

ایم ایس سی کے آخری سمسٹر کے دوران، رفیق صاحب ان کے گھر آئے۔ ارجمند کو دیکھ کر وہ پہلی ہی نظر میں اس کی شرافت، خوش اخلاقی اور ذہانت کے قائل ہو گئے۔ اس کے کلینک بنانے اور کیریئر کے آغاز کے ارادے نے رفیق صاحب کو متاثر کیا

اور انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ اپنے دوست کی لائق بیٹی کی سائیکالوجسٹ بننے میں ہر ممکن مدد کریں گے۔ اظہر صاحب تو ذاتی طور پر اپنی بیٹی کے لیے شاید ایسا نہ کر پاتے۔

ارجمند کے فائنل امتحان سے تقریباً دو ماہ قبل اظہر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ شوگر کے مریض تھے۔ ایک دن ان کی شوگر بہت زیادہ بڑھ گئی۔ افراتفری کے عالم میں قریبی اسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ شوگر کے سبب انہیں ہیپاٹائٹس بھی ہو گیا تھا، دل اور دیگر اعضاء بھی متاثر ہوئے تھے۔

رفیق صاحب کو پتا چلا تو فوراً پہنچے مگر ان کا عزیز دوست، اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ لگتا تھا کوئی پریشان کن خواب دیکھ رہے تھے جہاں آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

انہوں نے ارجمند، انجمن اور بیگم اظہر کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی بلکہ اپنے عزیز دوست کے انتقال کے بعد تو وہ دل ہی دل میں ارجمند کو اپنی بہو بنانے کا سوچنے لگے تھے۔

☆......☆

والد کی وفات نے ارجمند کے مزاج پر ایک بار پھر سنجیدگی کی چادر تان دی۔ شہزاد کو اس کے دکھ اور پریشانی کا احساس تھا۔ وہ اسے ممکنہ حد تک خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔

ارجمند کی جاب صرف فائنل ایگزام پر منحصر تھی۔ وہ ایم ایس سی کر کے اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کا سہارا بننا چاہتی تھی۔ اپنے علاوہ، ان دونوں کی ذمہ داری بھی اس پر تھی۔

اس نے رفیق انکل سے شام میں پارٹ ٹائم جاب کرنے کی بات کی تو انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں اور اسے فائنل امتحان دینے تک کچھ اور نہیں سوچنا چاہیے۔ بعد ازاں ارجمند کو خود بھی یہ بات بہت معقول لگی۔ واقعی اسے ایگزام تک تو اپنے ذہن کو مزید بوجھ سے آزاد رکھنا تھا بعد میں تو کام کرنا ہی تھا۔ تو پھر چند مہینے مزید انتظار کرنے میں کیا حرج تھا۔

پیپرز سے فارغ ہونے کے بعد شہزاد نے ایک جگہ دونوں کی انٹرن شپ کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس طرح دونوں کی رفاقت میں مزید دو ماہ کا اضافہ ہو گیا۔

رفیق صاحب اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر مہناز بیگم کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے فوری طور پر کوئی جواب دینے سے گریز کیا۔

"رفیق بھائی بہت شکریہ۔ آج اگر اظہر ہمارے درمیان ہوتے تو بہت خوش ہوتے لیکن اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ بیٹی کی شادی کی تمام ذمہ داری، اب تنہا مجھ پر ہے۔ میں آپ سے چند دن کی مہلت چاہوں گی اور پھر ارجمند کی مرضی بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ ارجمند بیٹی انکار نہیں کرے گی۔ ہمیں اس کی جاب اور کلینک پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی اس خواہش کو پورا کرنے میں ہر طرح سے اس کی مدد کروں گا۔"

"رفیق بھائی آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ہماری بچی پر آپ کا بھی حق ہے لیکن......" مہناز بیگم نے جملہ نامکمل رہنے دیا۔

رفیق صاحب بھی سمجھ گئے۔

"جی بھابی، آپ ضرور غور و خوض کر لیجیے۔ فہد بیٹا بھی آپ سے مل لے گا۔ پھر جیسے آپ کی مرضی۔" رفیق صاحب نے بھی انہیں مہلت دے دی۔

امی نے ارجمند سے بات کی۔ اس نے حتمی جواب دینے سے پہلے شہزاد سے ذکر کیا۔ اس نے اس بات کو کہ ارجمند کے ہونے والے خسر اس کے بعد از شادی کیریئر اور کلینک کھولنے میں اس کی مدد کریں گے۔ یہ بات سن کر ان کی خاصی تعریف کی اور کہا۔

''اگر تمہارے انکل اتنے Co-operative ہیں تو پھر یقیناً تم وہاں خوش رہو گی۔'' وہ بولا۔

''ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ تو پھر میں ہاں کر دوں؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''I think so''۔ شہزاد نے جواب دیا۔

''لیکن شہزاد کیا مجھے صرف اسی ایک رشتے پر اکتفا کر لینا چاہیے؟ I mean...... اس سے اچھا بھی تو مل سکتا ہے۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''اور اگر مزید اچھے کے انتظار میں یہ رشتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو؟'' وہ حقیقت پسندی سے بولا۔

شہزاد جانتا تھا کہ ارجمند اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی تھی۔ وہ یقیناً ارجمند کو دوست کی حیثیت سے پسند کرتا تھا مگر اس کے والدین، اس کی شادی کسی امیر گھرانے میں کرنا چاہتے تھے اور پھر ایم ایس سی کے بعد اسے مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی جانا تھا۔ مستقبل کی تصویر واضح تھی اور شادی کا فیصلہ تن تنہا کر لینا، اس کے بس میں نہ تھا۔

اگر رشتہ ازدواج کی ذمہ داریاں نبھانا مشکل لگے تو پھر بہتر ہے کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیتے ہوئے صرف دوستی کے رشتے تک محدود رہا جائے۔ اسی لیے تو شادی کو ایک جوا قرار دیا گیا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بعض اوقات یا تو ہم صحیح انتخاب تک نہیں پہنچ پاتے یا غلطی سے اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔''

''تم اللہ کا نام لے کر اس نئے رشتے کی طرف قدم بڑھاؤ اور جہاں تک ہم دونوں کی دوستی کا سوال ہے تو میں ایک اچھے دوست اور غمگسار کی حیثیت سے ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تم جب آواز دو گی، مجھے اپنے بہت قریب پاؤ گی......وعدہ۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے پر خلوص اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ یقین دلایا۔

شہزاد کے اس محبت آمیز رویے اور پُر یقین لہجے نے اسے بہت اعتماد اور حوصلہ بخشا۔ امی اور انجمن کے بعد اب شہزاد اس کا تیسرا دوست تھا، جسے وہ ضرورت کے ہر لمحے میں آواز دیتی۔

''تھینک یو ویری مچ شہزاد۔ تم واقعی میرے بہت اچھے دوست ہو اور ہمیشہ رہو گے۔ ہے ناں۔'' ارجمند نے تائید طلب نظروں سے شہزاد کو دیکھا، جس نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں مسکرا دیے۔

☆......☆

ایک سادہ مگر پر وقار تقریب میں اس کا فہد سے نکاح اور پھر رخصتی کر دی گئی۔ تقریب میں شہزاد کے علاوہ چند اور کلاس فیلوز بھی موجود تھے۔

لاہور میں ایم ایس سی کے فائنل کے فوراً بعد ہی شہزاد بیرون ملک داخلے کا پروسیس شروع ہو گیا تھا۔ ستمبر میں اس کی کلاسز کا آغاز ہونا تھا۔ اس دوران ملاقات تو نہیں البتہ فون پر ضرور رابطہ رہا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز ارجمند کو فون کر لیا کرتا۔ اپنی تیاریوں کے بارے میں بتاتا اور اس کی خیریت دریافت کرتا اور پھر ارجمند کی شادی کے دو ماہ بعد ہی وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک روانہ ہو گیا۔

☆......☆

ارجمند کی ساس کشور بیگم نے شادی کے پندرہ دن بعد ہی ساس پن کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ پہلے انہیں ارجمند کے منہ سے اپنے لیے امی کا لفظ برا لگا۔ پھر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مین میخ

Monthly DOSHEEZA Karachi

ہر گھر کی زینت

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

صاف ستھرے ذوق کا آئینہ دار

ایک خوب صورت اور معیاری ڈائجسٹ جسے نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔

زرِ سالانہ

اندرون ملک =/600 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یواے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

فون: 021-34939823 - 021-34934369 فیکس: 021-34930470

نکالنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارجمند کے جہیز نہ لانے پر تو انہیں خاصا شکوہ تھا ہی، اب اس کے خلاف بولنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا، جب انہوں نے اسے شہزاد سے موبائل پر باتیں کرتے دیکھ لیا۔

''یہ تم فون پر کس سے اتنی لمبی لمبی باتیں کرتی ہو؟'' فون بند کرتے ہی کشور بیگم کی آواز نے ارجمند کو چونکا دیا۔ وہ پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

''میرا کلاس فیلو ہے شہزاد۔ پڑھنے کے لیے باہر جارہا ہے۔ اسی کا فون تھا۔'' وہ مسکرائی۔

''اسے نہیں معلوم کہ تم شادی شدہ ہو اب؟'' انہوں نے گھورا۔

''کیوں نہیں، وہ تو خود میری شادی میں شریک تھا۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

''کیوں فون کرتا ہے تمہیں؟'' وہ اصل موضوع پر آئیں۔

''بس خیریت معلوم کرنے کے لیے۔'' وہ بولی۔

''خیریت معلوم کرنے میں اس نے ایک گھنٹہ لگا دیا۔'' کشور بیگم نے قطع کلامی کی۔ ''دیکھو لڑکی ہمارے ہاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ بہوئیں گھنٹہ گھنٹہ بھر اپنے کلاس فیلوز سے باتیں کریں۔ فہد کو پتا چلے گا تو جانتی ہو کیا کرے گا؟'' انہوں نے خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیا۔

''کیا کرے گا؟'' ارجمند نے حیرت سے جاننا چاہا۔

''ہوش کے ناخن لے لڑکی، تو جانتی نہیں کہ میرا بیٹا اس معاملے میں کتنا سخت ہے۔''

''کس معاملے میں؟'' وہ ابھی تک حیران تھی۔

''یہ تو اب وہ تجھے آکر ہی بتائے گا۔'' کشور بیگم تلملاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

اس کی ساس کا مقصد ارجمند کو دھمکانا اور دبانا تھا لیکن اس پر تو وہ اثر ہی نہ ہوا جو کشور بیگم چاہتی تھیں۔

شام کو جب فہد آیا تو اسے پتا چلا کہ اس کی بیوی یونیورسٹی فیلوز سے ہنس ہنس کر فون پر گپ شپ کرتی ہے۔ وہ تھا تو تعلیم یافتہ اور مہذب مگر اندر سے وہی روایتی ماں مرید شوہر جس کے لیے ماں کے الفاظ قرآن و حدیث کا درجہ رکھتے تھے۔

''امی بتا رہی تھیں کہ تمہارا کوئی کلاس فیلو، آئے دن تمہیں فون کرتا ہے اور باتوں میں کھو کر تم گھر کے کام کاج سے بھی غفلت برتتی ہو؟'' فہد نے رات کو اس سے پوچھا۔

''دیکھیں فہد! چھوٹی چھوٹی باتوں کا بتنگڑ بنانا اور ان پر بحث کرنا مجھے نہیں آتا۔ امی نے خوامخواہ ڈانٹا تھا مجھے۔ اب بھلا بتایئے کہ اپنے یونیورسٹی فیلوز سے فون پر بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟'' وہ بھی سپاٹ لہجے میں بولی۔

''یونیورسٹی چھوڑ چکی ہو ناں تم۔ تو پھر کلاس فیلوز کو بھی چھوڑ دو۔''

''فہد، میں کوئی جاہل گنوار گھر کی چار دیواری میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ جس سے آپ اس طرح گفتگو کر رہے ہیں۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''اچھا تو دیوی جی، کس طرح گفتگو کروں آپ سے۔ آپ حکم کریں تو ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر بات کروں۔'' اس کا طنز انتہائی غیر متوقع اور بے موقع تھا۔

ارجمند کو بہت رنج ہوا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆

اس نے رفیق انکل سے اپنا کلینک شروع کرنے کی بات کی تو وہ کہنے لگے۔ ''جی بیٹا! آپ جب کہو۔ میں دفتر کے لیے مناسب جگہ کا انتظام کردوں گا۔ لیکن بیٹا کیا تم تنہا سنبھال سکو گی سب کچھ؟ مطلب کہ تم نے کیا پلاننگ کی ہے؟''

''انکل میرا ایک کلاس فیلو شہزاد تو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جارہا ہے اگر وہ یہاں ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن میں اپنے باقی کلاس فیلوز سے بات کرتی ہوں۔ شاید کوئی اچھا پارٹنر مل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ Already اس پروفیشن میں ہیں، ان میں سے کسی سے Attach ہو جاؤں۔'' ارجمند نے اپنا پلان بتایا۔

''ہوں۔ آپ دیکھو، کیا چیز آپ کے لیے بہتر ہے۔ اپنے کلاس فیلوز سے۔ سینئرز سے بات کرو۔ جو چیز زیادہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اس پر کام شروع کرو۔''

''جی انکل Sure۔'' ارجمند مطمئن ہوگئی۔

''کیا کام شروع کرنے جارہے ہیں، سسر اور بہو؟'' اسی وقت کشور بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے آخری جملہ سن لیا تھا۔

''ارجمند کا کلینک۔'' رفیق انکل نے مختصر جواب دیا۔

''اچھا اور یہ گھر کون سنبھالے گا؟'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''گھر سنبھلا ہی ہوا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارجمند کوئی گنوار اور اجڈ لڑکی نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کر روٹیاں پکایا کرے۔ میں نے اپنی بیٹی سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کروں گا۔'' رفیق صاحب سپاٹ لہجے میں بولے اور فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔ ارجمند بھی خالی کپ اور ٹرے لے کر اندر کچن میں چلی گئی۔

دراصل رفیق صاحب کی بدقسمتی کہ بیوی معمولی تعلیم یافتہ، غیر متحمل مزاج تو تھیں ہی، اب بیٹے کی شادی کے بعد تو نہایت جانبدار اور متعصب خیالات کی حامل بھی ہوگئی تھیں۔ رفیق صاحب کو اس بات پر بہت رنج تھا کہ کشور بیگم نے ارجمند کو بہو سمجھا، بیٹی نہیں۔ اور جہیز نہ لانے پر انہیں بہو سے سخت شکوہ

غزل

عالم سا عالم ہے، اب تم یاد نہیں آتے
کیسا قاتل غم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

دنیا یعنی دنیا یعنی میری دل دنیا
درہم اور برہم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

اِک بے احوالی سی ہے ایسی جو ہے بیش از بیش
حالتِ دل کم کم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

زخم ہیں سینے کے کجلائے اور سرِ شب سے
داغ کی لو مدھم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

زخموں کی ہر فصل ہے گزری، بس بے فصلی ہے
مرہم ہی مرہم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

اب نہیں دل کا کوئی زمانہ، کوئی زمانہ بھی
آن سی اب جم جم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

وحشتِ تحیر بے جنبش ہے اور عجب کچھ ہے
ہر آہُو بے رَم ہے، اب تم یاد نہیں آتے

جون ایلیا

تھا۔ حالانکہ رشتہ طے کرتے ہوئے اس موضوع پر رفیق صاحب نے انہیں خاصا سمجھایا بھی تھا مگر کہاں......لاکھ سمجھانے کے باوجود ہی مرغ کی ایک ٹانگ!! انہوں نے جیسے تیسے اپنے شوہر کی پسند سے بہو لانے پر تو صبر کرلیا مگر اب اسے جا و بے جا تنقید اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنا کر دل کی بھڑاس نکالتی تھیں۔

رفیق صاحب کو بھی معاملے کی نزاکت کا پورا احساس تھا۔ وہ بھی ارجمند کو پورا پورا سپورٹ کرتے لیکن کبھی کبھی یہ بھی سوچنے لگتے کہ انہوں نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اگر وہ فہد اور ارجمند کی شادی کے سلسلے میں ڈیڑھ دو سال ٹھہر جاتے تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ وہ یہ باتیں سوچ کر پریشان ہوا کرتے تھے۔ پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر مطمئن ہوجاتے۔

☆......☆

کچھ عرصے بعد ہی ارجمند کی کوشش رنگ لائی۔ وہ کافی دنوں سے اپنے کلاس فیلوز اور سینئرز سے رابطے میں تھی۔ آخر کار یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ایک External فیکلٹی ممبر اسے اپنے ساتھ بطور جونیئر لینے پر رضامند ہوگئے۔

سر احمد نے بھی اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا۔ اسے کیس اسٹڈیز اور فائل ورک تک ہی محدود رکھا۔ البتہ مریضوں کے علاج کے حوالے سے وہ اس سے مشورہ ضرور لیا کرتے تھے۔ اس سے اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

اگلے چار ماہ ارجمند نے سر احمد کے ساتھ جونیئر سائیکالوسٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے کافی کچھ سیکھا۔ اسی دوران وہ امید سے ہوگئی چونکہ پہلا بچہ تھا، لہٰذا جلد ہی ڈاکٹر نے اسے گھر پر رہنے اور مکمل آرام کرنے کی ہدایت کردی۔

امی اور انجمن بے حد خوش تھیں مگر کشور بیگم کا وہی وتیرہ تھا۔ اب تو انہیں یہ بات بری لگنے لگی تھی کہ بہو بیگم ہر وقت آرام کرنے لگی تھیں۔ ملازمہ کے ہاتھ کا کھانا کشور بیگم کو پسند نہ تھا اور رفیق صاحب نے اسے ارجمند کے کھانے اور آرام کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کردی تھی۔ یہ دونوں باتیں کشور بیگم کو سخت ناگوار گزرتیں اور ملازمہ بے چاری کی آئے دن شامت آجاتی۔ کشور بیگم بڑے طنز سے فرماتیں۔

''بہو بیگم کو تو اچھا بہانہ ہاتھ آیا ہے، گھر کے کاموں سے جان چھڑانے کا۔ ارے ہم نے بھی بچے پیدا کیے ہیں۔ کبھی اس طرح پلنگ نہیں توڑا۔ ایک اس مہارانی کو دیکھو۔ لگتا ہے کوئی انوکھا ہی کام کرنے جارہی ہیں محترمہ۔''

یہ باتیں جب ارجمند کے کانوں تک پہنچتیں تو اسے بے حد رنج ہوتا مگر صبر کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

☆......☆

جب بچے کی پیدائش میں ایک ماہ باقی تھا تو فہد کی ایک دور کی عزیزہ ہما جن کی شادی گوجرانوالہ میں ہوئی تھی، لاہور فہد سے ملنے آئیں۔ انہیں دیکھ کر فہد اور کشور بیگم بہت خوش ہوئے۔

''ہما بی! تم تو عید کا چاند ہی ہوگئیں۔ شکر ہے تمہیں بھی ہمارا گھر یاد آیا۔'' کشور بیگم نے اس کا گلے لگا کر استقبال کیا۔

''بس آنٹی میں تھی بھی تو گوجرانوالہ میں۔ آپ لوگ سنائیے۔ فہد نے تو کبھی بھولے سے فون بھی نہیں کیا۔'' اس نے رسمی شکوہ کیا۔

''بس میں بھی مصروف ہوگیا ہوں، شادی کے بعد۔'' وہ بولا۔

''تم سناؤ۔ شبیر میاں کا کیا حال ہے۔ ساتھ نہیں آئے؟'' کشور بیگم نے اس کے شوہر کا پوچھا۔

''کیا بتاؤں آنٹی۔ وہ ساتھ نبھانے کے قابل کب تھا۔ اس کی عیاشیوں نے تو میرا جینا محال کردیا تھا اور پھر اولاد بھی کوئی نہیں۔ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر میں ہمیشہ کے لیے الگ ہوگئی۔'' اس نے مختصراً طلاق کا قصہ سنایا۔ کشور بیگم اور فہد دونوں حیران رہ گئے۔

''اب میں مستقل لاہور آگئی ہوں امی کے پاس۔'' ہما نے بتایا۔

دونوں نے ہما سے افسوس کیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی بوریت اور کسی مصروفیت کے نہ ہونے کا بھی ذکر کردیا۔

''چلیے کوئی نہ کوئی مصروفیت تلاش کر ہی لیں گے، ہم آپ کے لیے۔'' فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دو ہی دن بعد فہد نے ہما کو اپنے دفتر میں سپر وائزر کی سیٹ آفر کردی۔ ہما کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً فہد کا آفس جوائن کرلیا۔

فہد کو اس کی طلاق پر بڑی ہمدردی تھی۔ رفتہ رفتہ ہما صاحبہ نے اس ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ دونوں کا وقت ایک دوجے کے ساتھ گزرنے لگا۔ طلاق کے بعد حتیٰ کہ ازدواجی زندگی میں بھی، وہ چونکہ تنہا ہی رہ گئی تھی لہٰذا اب اس کا جھکاؤ غیر ارادی طور پر فہد کی طرف ہونے لگا۔

دوسری طرف بچے کی پیدائش کے دن قریب ہونے کی وجہ سے ارجمند کی اکثر طبیعت ناساز رہتی۔ بعض دفعہ تو ڈاکٹر کو گھر بلوانا پڑتا تھا۔ ایسے میں اسے فہد کی موجودگی اور ذہنی سہارے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی لیکن فہد کو ہر وقت ہما کا ساتھ مصروف رکھتا تھا۔

جو ناز و ادا، عشوہ و غمزہ اسے ہما میں نظر آتا، وہ ارجمند میں تو تھا ہی نہیں یا شاید اس نے کبھی ارجمند کو

دوشیزہ ایوارڈ یافتہ مصنفہ
نگہت اعظمی
کے یادگار افسانوں کا مجموعہ، جس کے کردار آپ کے ساتھ ساتھ ہمہ وقت رہتے ہیں۔ ایک ہی فضا میں وہ اور آپ سانس لیتے ہیں۔

آبگینے
شائع ہوچکا ہے
کتاب ملنے کا پتا:
علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ
اردو بازار۔ لاہور

قریب سے دیکھنے اور اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

ہما اب کزن سے محبوبہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ بیوی اور محبوبہ کا فرق اسے اب سمجھ میں آیا تھا اور وہ جب بھی دونوں کا موازانہ کرتا، ہمیشہ محبوبہ کو ہی حاوی پاتا۔ حسن و ادا، ناز و انداز، نشست و برخاست، پسند و ناپسند، خیالات، تزئین و آرائش، لباس و انتخاب..... ہر ہر لحاظ سے ارجمند پر فوقیت رکھتی تھی۔ فہد کو دکھ ہوتا کہ ہما اسے پہلے کیوں نہ مل گئی۔

آہستہ آہستہ یہ بات گھر تک بھی پہنچ گئی کہ فہد، ہما کو بہت اہمیت دینے لگا تھا۔ اس پر ارجمند اور رفیق انکل تو بے حد پریشان تھے لیکن کشور بیگم بہت خوش تھیں۔ ایک سال بعد تو انہیں ناپسندیدہ بہو سے نجات کا کوئی راستہ نظر آیا تھا۔ بھلا اس موقع کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتیں۔ انہوں نے فہد کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔

دراصل ان کا پروگرام ارجمند پر سوکن لانے کا تھا۔ نا صرف اس سے نجات بلکہ ہما کی والدہ چونکہ خاصی ویل آف تھیں لہٰذا جہیز کی صورت میں ان کی دولت اور معاشرتی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

رفیق صاحب زیادہ دن یہ برداشت نہ کر سکے اور ایک روز فہد ان کے ہاتھ آ ہی گیا۔

"بڑی باتیں سننے کو مل رہی ہیں آج کل تمہارے بارے میں؟"

"کیسی..... باتیں.....؟" اس نے گریز کی کوشش کی۔

"یہ ہما صاحبہ تم سے بہت فری ہو گئی ہیں؟"

"نہیں ابو۔ آپ سے کس نے کہا؟" فہد نے ٹالنا چاہا۔

"تم باپ بننے والے ہو۔ ارجمند کو اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے۔ کبھی اس کا حال بھی پوچھا ہے تم نے۔ چند ہی دن رہ گئے ہیں بچے کی پیدائش میں۔" ابو نے سمجھایا۔

"جی ابو..... آ..... ایکس کیوز می۔" وہ موقع پا کر نکل گیا۔

ابو کو اس کے ٹالنے والے رویے پر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے ہما سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆

رفیق صاحب نے ہما سے بات کی، اس نے تو صاف ہی انکار کر دیا۔

"رفیق انکل! لوگوں کی تو عادت ہے دو افراد کو ایک دوسرے سے ہنس کر بات کرتا دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھ لیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں۔" اس نے وضاحت کی۔

"بیٹا! لوگ بھی بلاوجہ کسی کو اسکینڈل لائز نہیں کرتے۔ پہاڑ بھی رائی سے ہی بنتا ہے۔"

"انکل پلیز آپ میرا یقین کریں۔ میں بخوبی جانتی ہوں کہ فہد شادی شدہ ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"اور چند ہی دنوں میں باپ بھی بننے والا ہے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تم دونوں کے درمیان ایک مناسب فاصلہ ہونا چاہیے۔ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔" رفیق احمد خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔ ہما خاموشی سے دیکھتی رہی۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ فہد کو غیر ارادی طور پر پسند کرنے لگی تھی۔ اسی لیے رفیق انکل کے سامنے آئیں بائیں شائیں کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

ہما نے فہد سے بات کی تو وہ لاپروائی سے کہنے لگا۔ "ہما! اگر ہم اچھے دوست ہیں اور اس دوستی کو نبھانے کا عہد کر لیں تو پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

"ہاں ہم دونوں کا صرف دوستی کا رشتہ ہے۔ لوگ تو پتا نہیں کیا کچھ سوچ لیتے ہیں۔" اس نے گویا

خود کو اور ساتھ ہی فہد کو بھی تسلی دی وہ دونوں غیر اختیاری طور پر روز بروز قریب سے قریب تر ہو رہے تھے۔

☆.....☆

ارجمند جلد ہی ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئی لیکن اس ننھے فرشتے کی آمد بھی فہد اور کشور بیگم کے مزاج میں نرمی نہ پیدا کر سکی۔ دونوں کے رویے میں ایک خوشگوار فرق آنے کی بجائے اب ارجمند کا وجود مزید ناقابلِ برداشت ہو گیا۔

دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے سے ہما کی تعریفیں کرتے۔ فہد کو اپنی پسند، اپنے تصورات کی ملکہ بڑی دیر سے ملی تھی اور کشور بیگم کو غریب اور مفلس بہو سے انتقام لینے کا بھرپور موقع اب ہاتھ آیا تھا۔ خواہش اور انتقام کے حصول نے ماں بیٹے کو ہمنوا کر دیا۔ دونوں اکثر ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ بیٹے کو حسین اور آئیڈیل بیوی چاہیے تھی، جسے دیکھنے والی ہر آنکھ سراہتی اور ماں کو امیر گھرانے کی بہو، جو ان کے فخر و غرور اور وقار میں اضافہ کرتی۔ جس کی امارت اور معاشرتی حیثیت کا ذکر وہ دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کر سکیں۔

بیٹا دبے الفاظ میں اپنی پسند کا اظہار کرتا اور ماں کا تائیدی انداز اس کی راہ ہموار کرتا۔ بچی کے دو پاؤں میں تو بہو اور سسر پس رہے تھے۔ بہو کی ازدواجی زندگی اور مستقبل داؤ پر تھا تو سسر کو اپنے عزیز دوست کی امانت سنبھال کر نہ رکھ سکنے کا غم کھایا جا رہا تھا۔ روزِ قیامت وہ اپنے دوست کو کیا جواب دیتے اور ارجمند کیونکر اپنی ذات پر ایسا داغ اور دل پر ایسا داغ سہتی۔ جس کا کوئی مداوا نہ تھا۔

☆.....☆

ارجمند، فہد کے کشیدہ رویے پر وہ سخت نالاں تھی۔ گزشتہ چند دنوں سے وہ جو کچھ سن رہی تھی، اس کے اندر ایک لاوا پک رہا تھا جو جلد یا بدیر پھٹنے والا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو شکایت کے لائق کبھی نہ سمجھا۔ جب سے ہما والا معاملہ سامنے آیا تھا، دونوں کے مابین ایک اجنبیت کی خلیج حائل ہو گئی تھی اور گزرتا ہوا وقت اس کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ کر رہا تھا۔

دوسری طرف کشور بیگم نے فہد کو دو ٹوک الفاظ میں دوسری شادی کا کہہ دیا تھا۔

"دیکھو فہد، اسلام نے نا صرف مرد کو چار شادیوں کا حق دیا ہے بلکہ طلاق کا بھی۔"

"اور اگر ارجمند نے عدالت کچہری کے چکر میں ڈال دیا تو.....؟"

"بیٹے، عدالتوں کے چکر میں وہ لوگ پڑتے ہیں، جن کی جیب میں پیسے ہوں۔ کوئی حیثیت ہو۔ کوئی پُرسانِ حال ہو۔ چھوٹے اور بھوکے ننگے لوگ اس قابل نہیں ہوتے۔" کشور بیگم کا طنز اور حقارت آمیز انداز ان کے جذبات کا ترجمان تھا۔

"اور بچہ..... ہما بچے کو قبول کر لے گی کیا؟"

"بچہ جس نے پیدا کیا ہے۔ اسے ساتھ بھی وہی لے کر جائے گی۔" کشور بیگم نے اپنے پوتے کا بھی خیال نہ کیا۔

☆.....☆

فہد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو عدد اسٹامپ پیپرز تھے۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے ایک کاغذ ارجمند کی طرف بڑھایا۔

"اسے پڑھ کر دستخط کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" ارجمند نے پہلے کاغذ اور پھر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ جواب دیے بغیر بدستور ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ آخر ارجمند کاغذ لے کر کھول کے دیکھنے لگی۔

"فہد!" وہ چیخی۔ "تم دوسری شادی کر رہے

ہو؟'' دوسری شادی کا اجازت نامہ پڑھ کر وہ سکتے میں رہ گئی۔

''ہاں۔'' فہد نے مختصر جواب دیا۔

''اور اگر میں انکار کردوں تو؟''

''تو مجھے طلاق کا حق حاصل ہے۔'' اس نے دوسرا کاغذ بیڈ پر رکھ دیا۔

ارجمند اسے تکتی رہ گئی۔ غم و غصے اور بے بسی نے اس کی قوتِ گویائی ہی سلب کرلی۔

''میں نے دونوں آپشنز تمہارے سامنے رکھ دیے ہیں۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ ایک کاغذ ارجمند کے ہاتھ میں اور دوسرا بیڈ پر رکھا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے دوسرا کاغذ اٹھا کر کھولا اور طلاق کے الفاظ پڑھ کر اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی چھا گئی لیکن پھر بھی اس نے دوسرا آپشن قبول کرلیا تھا۔

وہ تو سنا کرتی تھی کہ رشتہ ازدواج ہر رشتے پر فوقیت رکھتا ہے۔ والدین، بہن بھائی دیگر اقارب ایک مخصوص وقت تک ساتھ نبھاتے ہیں مگر شوہر اور بیوی کا تعلق دائمی ہوتی ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک بلکہ مر کر بھی یہ رشتہ نہیں لوٹتا لیکن نہیں...... آج یہ سب باتیں غلط ثابت ہو رہی تھیں۔ جس تعلق کی مضبوطی کے وہ قصے سنا کرتی تھی وہ کس قدر کھوکھلا اور ناپائیدار تھا اسے آج آگہی ہوئی۔

فہد نے اس کی توہین کی تھی۔ شدید توہین۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ جس کے بچے کو اس نے نو ماہ تک اپنے شکم میں رکھا اور اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اسے تخلیق کیا۔ وہ محض چند لمحوں میں اسے دودھ میں پڑی ہوئی مکھی کی طرح نکال کر پھینک گیا تھا۔

☆......☆

اس نے دو ہفتے کے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اپنا مختصر سامان ایک بیگ میں رکھا، جس میں فہد کے گھر کی کوئی چیز موجود نہ تھی اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ وہ گھر جس سے وہ اپنائیت کا رشتہ قائم کرنے آئی تھی مگر اسے بیگانگی ہی ملی۔ وہ گھر اس کا اپنا تھا ہی نہیں۔

☆......☆

انجمن نے کرسی پر نیم دراز خیالات میں گم صم ارجمند کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تو وہ چونک گئی۔

''کیا سوچتی رہتی ہیں ہر وقت؟'' وہ کرسی کھینچ کر قریب بیٹھ گئی۔

''انجمن...... میرا حال، ماضی اور مستقبل کی الجھنوں میں پتا نہیں کہاں کھو گیا ہے۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''آپی! آپ کے سوال میں ہی اس کا جواب بھی ہے۔ ماضی گزر چکا ہے اور مستقبل آپ نے دیکھا نہیں تو پھر پریشانی کیسی مائی ڈیئر سسٹر؟''

''نہیں انجمن...... تم، مجھ جیسی بدنصیب کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ماضی کی اذیت اور مستقبل کا خوف ان دونوں سے تو شاید ہی جان چھوٹے کبھی۔'' اس نے گہرا سانس خارج کیا۔

''آپ جاب کیوں نہیں کرلیتیں؟ آپ کی تو عدت بھی ختم ہوگئی ہے اب۔'' انجمن نے زور دیا۔

''جنید ابھی چار ماہ کا بھی نہیں ہوا۔ وہ میرے بغیر کیسے رہے گا۔'' ارجمند بولی۔

''ارے آپی آپ ارادہ تو کیجیے۔ جنید کو امی سنبھال لیا کریں گی۔'' انجمن نے آپی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب تو وہ مجھ سے بھی خاصا مانوس ہوگیا ہے۔''

ارجمند نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ چھوٹی بہن کی باتیں اسے واقعی حوصلہ افزا لگیں، سو اس نے ماضی کی اذیت ناک یادوں سے جان چھڑا کر حال اور مستقبل سے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

قدرت کو ابھی اس کا یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اسی ہفتے جنید کو بخار ہوگیا۔ معائنہ کرانے پر ڈاکٹرز نے اسپتال میں داخلے کا مشورہ دیا۔ امی اور ارجمند بھاگی بھاگی اسپتال پہنچیں مگر وہاں داخلے سے پہلے فیس جمع کروانا ضروری تھا۔ چنانچہ امی کی ایک دور کی کزن سے بھاگم بھاگ دس ہزار روپے لیے اور بچے کو داخل کروایا۔

دو دن بعد ٹیسٹ اور دیگر اخراجات کے سلسلے میں مزید پیسوں کی ضرورت پڑی۔ سو ایک دفعہ پھر امی نے اپنی کزن کی منت سماجت کی۔ یہ تلخ گھونٹ، انہیں اس لیے پینا پڑا کہ ابو کی پنشن آنے میں ابھی چند روز باقی تھے اور پھر مہینے کے آخری دن...... یوٹیلٹی بلز بھی جمع کروانے تھے۔ ایک سے ایک نیا خرچ منہ کھولے کھڑا تھا۔

ان دنوں ارجمند کی بے قراری عروج پر تھی۔ اللہ سے رو رو کر بیٹے کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی تھی۔ اسے تو کھانے پینے سے بھی رغبت نہ رہی تھی۔ جتنا وہ اپنے بیٹے کے لیے روتی تھی، اتنا شاید ہی زندگی میں کسی اور کے لیے روئی ہو لیکن اس کے آنسو بیٹے کی زندگی نہ بچا سکے اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چل بسا۔ لگتا تھا قدرت کو ایک کے بعد ایک اس کا اور اس کے خاندان کا امتحان منظور تھا۔ ابو کی اچانک وفات، اس کی شادی جو زندگی میں ایک نیا موڑ لے کر آئی لیکن آخر کار اسے تنہا کر گئی۔ اس تنہائی میں اس نے اپنے مُنّے سے بیٹے کو سہارا بنا لیا مگر یہ سہارا بھی چھن گیا۔

تھوڑے ہی عرصے میں پے در پے ایسے واقعات پیش آئے کہ اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔

رفیق انکل ملنے آئے تھے۔ اب وہ اس کے سسر نہ رہے تھے مگر والد کے دوست کا رشتہ تو بہر حال موجود تھا۔ جب انہیں پوتے کی وفات کا پتا چلا تو یقین ہی نہ آیا۔ حالات اتنی تیزی سے بدلے، جیسے اچانک کوئی طوفان آیا اور خس و خاشاک کی مانند سب کچھ بہا لے گیا۔ وہ بیٹھے ان ہی باتوں پر افسوس کرتے رہے کہ ارجمند کو بیٹی کہنے کا حق ادا نہ کرسکے۔

''کوئی بات نہیں انکل...... اللہ آپ کو اس کا اجر عطا کرے جو آپ نے ہمارے لیے کیا۔ ہر چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی۔ مشیت ایزدی پر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔'' ارجمند نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ رفیق انکل خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اس میں کتنا حوصلہ اور صبر آگیا تھا۔ وقت کے ساتھ پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت ہوگئے۔

☆......☆

گھر کے اخراجات بڑھتے گئے۔ مہنگائی جو اس قدر ہو رہی تھی۔ ابو کی پنشن اب ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ ایسے میں ارجمند کے ملازمت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ امی گھر پر کپڑے سی لیا کرتی تھیں۔ انجمن نے ایف اے کرنے کے فوراً بعد ایک کال سینٹر جوائن کرلیا۔ جہاں سے اسے ایک معقول تنخواہ ملنے لگی۔ ارجمند کا کوئی معقول جاب کرنا ضروری تھا کیونکہ ایک تو قرض کی ادائیگی جلد از جلد کرنا تھی جو امی کی کزن سے لیا تھا۔ دوسرے وہ انجمن کو ہر ممکنہ حد تک سہولت دینا ضروری سمجھتی تھی۔

''ارجمند...... بیٹا، کیا سوچ رہی ہو؟'' امی پاس آ بیٹھیں۔

''امی! میں نے ملازمت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے باہر نکلنا ہی ہوگا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کب کام آئے گی۔''

''میں تو خود ہی کہنے والی تھی تم سے۔ ہیں تو ہم

تین لیکن پھر بھی 15 ہزار کی تمہارے ابو کی پنشن کم پڑ جاتی ہے۔ مہنگائی کے حساب سے تو ہر مہینے ہمیں تقریباً 25 ہزار چاہئیں۔'' امی بولیں۔

''پرسوں اتوار ہے امی۔ اخباروں میں بڑے اشتہارات آتے ہیں ملازمت کے۔ دعا کریں کہ میرے لیے کوئی مناسب جاب نکل آئے۔'' ارجمند نے کہا۔

''آمین۔'' امی نے دعا دیتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔

☆......☆

تین ہفتے گزر چکے تھے۔ اخبارات میں ملازمت کے اشتہارات دیکھتے ہوئے ہر کوئی مخصوص تجربہ اور قابلیت مانگتا تھا۔ ایک دو جگہوں پر استقبالیہ اور سیکریٹری کی ملازمت کے لیے فون کیا تو اولین شرط خوب صورتی، خوش لباسی اور خوش گفتاری بتائی گئی۔ خوب صورت اور خوش گفتار تو وہ تھی ہی اور خوش لباسی بھی کوئی مسئلہ نہ تھی کیونکہ وہ کپڑے بہت اچھے سینا جانتی تھی مگر پھر بھی کوئی معقول جاب کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔

☆......☆

اگلے اتوار کے اخبار میں اسسٹنٹ سائیکالوجسٹ کی ایک جاب دیکھ کر اس نے فوراً نمبر ملایا۔

''السلام علیکم، میں ارجمند بول رہی ہوں۔ سر میں نے ایڈ دیکھا ہے آپ کا، اسسٹنٹ سائیکالوجسٹ کے لیے۔''

''کیا کیا ہوا ہے آپ نے؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''سر، میں نے سائیکالوجی میں ایم ایس سی کی ہے۔ اس کے علاوہ جونیئر سائیکالوجسٹ کے طور پر کام کا تجربہ بھی ہے۔''

''ہوں گڈ، او کے۔ آپ اپنے بائیوڈیٹا کے ساتھ کل شام چار بجے آجائیے گا۔ اشتہار میں ایڈریس بھی دیا ہوا ہے۔''

''جی سر، میں آجاؤں گی۔ تھینک یو اللہ حافظ۔''

اس نے فون رکھ کر جوش سے مکا ہوا میں لہرایا۔

''ارے آپی! بڑی خوش نظر آرہی ہیں۔ کیا بات ہے؟'' اسی وقت انجمن چائے کی ٹرے ہاتھ میں لیے آگئی۔

''ادھر بیٹھو، بتاتی ہوں۔'' اس نے بازو پکڑ کر انجمن کو کھینچا۔

اس کے اس جوش میں پیالیوں سے چائے چھلک گئی۔ اس نے جلدی سے انجمن کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میز پر رکھی اور اسے بیٹھنے کے سے انداز میں کرسی پر بٹھا کر بولی۔ ''اخبار میں اسسٹنٹ سائیکالوجسٹ کی جاب آئی ہے۔ میں نے ابھی فون کیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کل 4 بجے انٹرویو کے لیے آجائیں۔''

''ویری گڈ، پھر تو بہت مبارک ہو۔ اللہ کرے آپ سلیکٹ ہو جائیں۔'' انجمن بھی خوش ہو گئی۔

''آمین۔'' اس نے خوشی سے کہا۔ دونوں بہنیں چائے پینے کے ساتھ ساتھ آنے والے وقت کے لیے پلاننگ کرنے لگیں۔

☆......☆

اگلے ہی روز ارجمند متعلقہ پتے پر پہنچ گئی۔ آفس بوائے نے اسے انتظار کا کہہ کر دفتر میں بٹھا دیا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ارجمند فوراً اٹھ کھڑی ہوئی لیکن نظریں ملیں تو دونوں لمحہ بھر کے لیے منجمد ہو گئے۔ اندر آنے والا کوئی اور نہیں، شہزاد تھا!!

اس کا یونیورسٹی فیلو جو اس کا دوست، ہمدرد اور غمگسار بھی تھا لیکن حالات نے دو دوستوں کو جدا کر دیا۔ درمیانی دو سالہ مدت میں اس نے زندگی کے کیسے کیسے روپ دیکھ لیے تھے اور آج ماضی ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے تھا۔

''ارے......! ارجمند......تم......!'' شہزاد کو گویا یقین ہی نہ آیا۔ ''واٹ آ سرپرائز۔'' اس نے حیرت کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، جسے قدرے جھجکتے ہوئے ارجمند نے تھام لیا۔

''لیکن آفس بوائے تو بتا رہا تھا کہ ایک خاتون انٹرویو کے لیے آئی ہیں؟'' اس نے ارجمند کے کچھ بولنے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''جی میں انٹرویو کی غرض سے ہی آئی ہوں لیکن......'' وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

''لیکن یہاں آکر مابدولت سے ملاقات ہو گئی۔ بالکل غیر متوقع طور پر۔'' اس نے مابدولت کا لفظ ادا کرتے ہوئے ایک ادا سے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اس کے اس انداز پر ارجمند دھیمے سے مسکرا دی۔ اسے یونیورسٹی میں ساتھ گزرا ہوا وقت یاد آگیا، جب وہ اس طرح ہنسی مذاق اور اپنی خوش طبعی سے ارجمند کا دل بہلاتا تھا پھر ایکدم وہ چونکی۔

''یہ میرا بائیوڈیٹا ہے۔'' اس نے فائل شہزاد کی طرف بڑھائی۔

''تمہارا پورا بائیوڈیٹا مجھے معلوم ہے۔'' اس نے فائل ایک طرف رکھ دی۔ ''یہ بتاؤ تمہارے کلینک کا کیا ہوا اور شادی کے بعد زندگی کیسی گزر رہی ہے؟''

''میری علیحدگی ہو چکی ہے۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''او......آئی ایم سوری۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''تو......آج کل کہاں رہ رہی ہو؟''

''امی کے پاس۔ چھوٹی بہن ہوتی ہے ساتھ۔ گھر کے حالات بہت مشکل ہیں آج کل۔ اسی لیے جاب کی تلاش میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تلاش مجھے آپ سے ملا دے گی۔''

غزل

مٹی کی گواہی خوں سے بڑھ کر
آئی ہے عجب گھڑی وفا پر

ہر عشق گواہ ڈھونڈتا ہے
جیسے کہ نہیں یقین خود پر

پتھر بھی بہت حسیں ہیں لیکن
مٹی سے ہی بن سکیں گے کچھ گھر

اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

کس خاک کی کوکھ سے جنم لیں
آئے ہیں جو اپنے بیج کھو کر

پروین شاکر

"مجھے افسوس ہوا ہے تمہارے حالات سن کر۔ بس ٹھیک ہے کل سے جوائن کرلو۔ تنخواہ تمہاری مرضی کی اور پک اینڈ ڈراپ بھی ہوگا اور کچھ، اگر تم چاہو؟" شہزاد نے کہا۔

"نہیں نہیں..... بہت شکریہ۔ بلکہ یہ بھی بہت زیادہ ہے۔" وہ انکاری سے بولی۔

"سم آن..... وی آر فرینڈز یار۔ اب کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتا اور خبردار یہ تھینک یو ویک یو مجھے پسند نہیں ہے، او کے؟" اس نے گویا ڈانٹا۔

"اچھا، آپ تو ڈانٹنے بھی لگے ہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"اور مجھے یہ آپ واپ بھی بالکل پسند نہیں۔" وہ خفا ہوا۔

"لیکن آپ میرے باس ہیں۔"

"پھر آپ..... اب میں ناراض ہو جاؤں گا اور مجھے منانا مشکل ہو جائے گا تمہارے لیے۔" اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھا۔

"تم بالکل نہیں بدلے شہزاد، بالکل نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی۔

"اور تم اچھی خاصی بدلحاظ ہوگئی ہو۔"

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے جناب کا۔ چائے تک تو پوچھی نہیں ہے آپ نے؟"

"او گاڈ، آئم ریئلی سوری۔" وہ فوراً انٹرکام کی جانب بڑھا، پھر رک گیا۔ "نہیں بلکہ ہم باہر کیوں نہ چلیں۔ اتنے عرصے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے اگر تم برا نہ مانو تو آج کی شام مجھے دے دو۔" اسے یقین تھا، ارجمند انکار نہیں کرے گی اور وہ واقعی رضامند ہوگئی۔

"چلیے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔" ارجمند چہک کر بولی۔

"کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔" شہزاد نے کالر جھاڑتے ہوئے اس کا جملہ اچک لیا اور ارجمند نے اسے خفگی سے گھورا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

ریسٹورنٹ میں، ارجمند نے مختصراً اپنے حالات شہزاد کے گوش گزار کردیے۔ اس نے بھی بتایا کہ وہ چند ہی دن پہلے ایم فل مکمل کر کے وطن لوٹا تھا۔ آخری سیمسٹر بریک کے دوران بھی اس نے لاہور کا چکر لگا کر جلدی جلدی آفس کا بندوبست کرلیا تھا لیکن انہی دنوں اس کے والدین کار کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین سانحہ تھا۔ آخری سیمسٹر اس نے بہت مشکل سے مکمل کیا۔ صرف ایک چیز تھی جس نے اسے اپنا سفر جاری رکھنے پر آمادہ رکھا اور وہ تھی اس کے والدین کی خواہش۔

"ارجمند مجھے دکھ اس چیز کا ہے کہ آج وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ یہ سب دیکھنے کے لیے جو میں نے صرف ان کی خاطر کیا ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"شہزاد..... بے شک وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اس پر یقیناً وہ خوش ہوں گے اور ایک بات اور..... خود کو تنہا کبھی مت سمجھنا۔ ایک دوست، ایک غمگسار کی حیثیت سے میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔" ارجمند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر اسے یقین دلایا۔ وہی یقین جو اس کی شادی کے موقع پر شہزاد نے اسے دلایا تھا۔

"تھینک یو ارجمند..... تھینک یو ویری مچ۔ تم سے مل کر میرے دل کا بوجھ بہت کم ہوگیا ہے اور مجھے اپنے کلینک کے لیے بھی اسسٹنٹ کی نہیں بلکہ پارٹنر کی ضرورت ہے۔

And I realy feel proud to love a partener like you.

"مجھے بھی اب وہ سب ممکن نظر آنے لگا ہے جو میں پہلے نہیں کرسکتی۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"ہم دونوں ایک دوجے کا سہارا بن کر وہ کچھ کرسکتے ہیں جو شاید تنہا نہیں کرسکتے تھے۔" شہزاد نے کہا۔

دونوں خاصی دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ ان کا مستقبل اب ایک دوسرے سے وابستہ تھا۔ چونچ لڑ چکے تھے۔ اچانک ارجمند کو خیال آیا۔

"ارے اتنا وقت گزر گیا۔ پلیز شہزاد مجھے گھر ڈراپ کرو۔ امی پریشان ہو جائیں گی۔" ارجمند فکرمند نظر آنے لگی۔

"تھوڑی دیر اور بیٹھو نا۔ دو سال بعد تو تم سے ملاقات ہوئی ہے۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔

"کل سے روزانہ ملاقات ہوا کرے گی۔ لیک؟ اٹھو، جلدی۔" ارجمند نے اصرار کیا۔

"اچھا بابا۔" شہزاد بادل نخواستہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ گیا۔

☆.....☆

شہزاد نے گاڑی ارجمند کے گھر کے دروازے پر روکی۔

"او کے پھر See you tommorow۔" ارجمند گاڑی سے اترنے لگی۔

"سنو۔" شہزاد نے پکارا۔ "جاب پسند آئی تمہیں؟"

"کیوں نہیں۔ یہ جاب انشاء اللہ میرے کیریئر کا وہ پارہ آغاز ثابت ہوگی۔"

"اور باس کیسا لگا؟" شہزاد نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔

"باس..... باس بھی ٹھیک ہی ہے۔ ویسے انٹرویو بہت اچھا لیتے ہیں آپ۔" اس نے اوپر سے نیچے تک شہزاد کو دیکھا۔ اس کے پہلے جملے پر تو وہ حیران ہوا مگر دوسرے لمحے مسکرا دیا۔

"او کے..... اللہ حافظ۔" وہ مسکراتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔

"Take Care۔ صبح تمہیں ڈرائیور پک کرلے گا۔" وہ ہانک لگا کر بولا۔

ارجمند نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گیٹ سے اندر چلی گئی۔ وہ چند لمحے کھویا سا باندر دروازے کو تکتا رہا۔ پھر گاڑی موڑ کر لے گیا۔

ارجمند نے داخل ہوتے ہی شور مچایا۔ "اے امی، انجمن کہاں ہیں سب؟"

"ادھر ہی ہیں ہم آپ کہاں رہ گئی تھیں۔ بڑی دیر کردی؟" انجمن نے کمپیوٹر سے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹا کیسا رہا انٹرویو؟" امی نے بھی پوچھا۔

"امی انٹرویو کیا۔ میری تو سلیکشن ہوگئی ہے۔ اتفاق سے وہ میرے ہی ایک سینئر نکل آئے۔ 25 ہزار تنخواہ اور پک اینڈ ڈراپ بھی Yahoo۔" اس نے بڑی جوش سے بتایا۔

"ہائے، سچ آپی!!" انجمن حیران بھی تھی اور خوش بھی بہت تھی۔

"سچ، میرا کیریئر بن جائے گا۔" وہ بہت خوش تھی۔

"شکر ہے مالک کا..... اس طرح بہت سہولت ہو جائے گی اور ہاں شکرانے کے نفل ضرور پڑھنا۔" انہوں نے ارجمند کو لپٹا کر پیار کیا۔

"جی امی۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

بہت عرصے بعد آج ان کے چہروں پر خوشی اور چمک آئی تھی۔

☆.....☆

رات کو جب امی نماز پڑھ رہی تھیں تو وہ انجمن کے پاس آبیٹھی۔ دراصل وہ اسے شہزاد کے بارے میں بتانا چاہتی تھی اور یہ باتیں وہ امی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔

''تجھے پتا ہے، میرا باس کون ہے؟'' اس نے انکشاف کرنا چاہا۔

''آپ بتا رہی تھیں کہ آپ کے سینئر ہیں۔'' انجمن نے ڈائجسٹ سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

''نہیں، دراصل وہ میرا کلاس فیلو ہے۔''

''چلیے یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ پھر تو وہ آپ کو بخوبی جانتے ہوں گے اور آپ کے لیے کام کرنا بھی زیادہ آسان ہوگا۔'' انجمن نے اظہار خیال کیا۔

''اوہو...... چپ کر کے میری سن نا۔'' اسے یہ مداخلت ناگوار گزر رہی تھی۔ ''اس نے مجھے ملازمت نہیں بلکہ پارٹنر شپ دی ہے، لیکن سرمایہ سارا اس کا ہوگا، ہم دونوں میں جونیئر سینئر نہیں ہوگا اور پک اینڈ ڈراپ کے علاوہ لنچ بھی فری۔ صرف میرا کیریئر ہی نہیں بنے گا بلکہ مجھے ایک بہت اچھا دوست بھی مل گیا ہے۔'' آخری جملہ اس نے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔ یعنی ایک تیر سے تین چار شکار۔ واہ، آپی آپ تو بڑی لکی ہیں۔'' اس نے رشک آمیز انداز میں کہا۔

''ہاں اور تمہیں پتا ہے۔ اس کے ملنے کے بعد مجھے لگتا ہے......'' وہ کھوئی کھوئی سی، بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''کیا لگتا ہے آپ کو؟'' انجمن نے پوچھا۔

''میری زندگی میں ایک ہمدرد اور غمگسار کی جو کمی تھی اتنے عرصے سے، شہزاد اس کمی کو ضرور پورا کردے گا۔'' وہ پھر کھو گئی۔

''آپی!'' انجمن نے حیرت اور بے یقینی سے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ ''صرف ایک ملاقات نے آپ کو اتنا بدل دیا۔ آج شام سے پہلے تو آپ بالکل ٹھیک تھیں۔''

''چل ہٹ...... شریر کہیں کی۔'' وہ انجمن کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا کر مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور وہ حیرت سے آپی کو جاتا دیکھتی رہی پھر خود بھی مسکرا دی۔

☆......☆

اگلے روز ڈیوٹی پر جاتے ہوئے ارجمند یوں پرجوش تھی گویا پکنک پر جارہی ہو۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا اور دھانی رنگ کی شلوار قمیص اسے بہت سوٹ کررہی تھی۔

''یو آر لکنگ گریٹ ٹوڈے۔ مریض تو تمہارا چہرہ دیکھ کر ہی آدھے صحت یاب ہوجائیں گے۔'' شہزاد نے دیکھتے ہی تعریف کی۔

''تھینکس...... تم پر بھی یہ رنگ بہت سوٹ کررہا ہے۔'' وہ بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

''ریلی از مائی فیورٹ کلر......''

''تھینکس! اچھاہاں...... میں نے ایک انٹیریئر ڈیزائنر سے بات کی ہے۔ آفس کی ڈیزائننگ کے لیے۔'' شہزاد بولا۔

''کم آن شہزاد۔ یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دو۔''

''ارے ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔ تم اگر اپنے لیے اتنے خوب صورت رنگ و انداز کا انتخاب کرسکتی ہو تو آفس کے لیے کیوں نہیں۔

I think so, you can be a very good interior designer as well.

اس طرح وہ اور دلچسپی سے شہزاد کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔

دفتر کی مصروفیات حسب معمول جاری تھیں شہزاد اور ارجمند ایک دوجے کے ہم قدم اپنے

پروفیشن اور کیریئر کو سیٹل کرنے میں بزی تھے۔ تین ماہ میں ارجمند نا صرف پیشہ وارانہ بلکہ نجی زندگی میں بھی خاصی مطمئن ہو چکی تھی۔ گھر کے مالی معاملات بالکل بدل گئے تھے۔ انجمن کا بی اے میں داخلہ ہو چکا تھا۔ گھر کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر تھی۔

ارجمند کو ایک سائیکو تھراپسٹ کی حیثیت سے اپنی منزل واضح نظر آرہی تھی۔ شہزاد ایک پارٹنر اور اچھے دوست کے طور پر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ شادی اور طلاق میں جو دو اذیت ناک سال اس نے گزارے کاش وہ لمحات اس کی زندگی میں آئے نہ ہوتے۔

اب بہت حد تک اس خوفناک خواب کو وہ بھول چکی تھی۔ البتہ اپنے ننھے سے بیٹے کو بھلانا اس کے لیے ناممکن نہ تھا۔ آج بھی اچانک ہی کام کرتے کرتے جنید کی یاد آگئی۔ نامعلوم وہ کب تک کھوئی رہتی۔ اگر شہزاد اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی نہ بجاتا۔

''کہاں گم ہو؟'' وہ بولا۔

''جنید یاد آرہا ہے۔ میں نے بتایا تھا نا۔ میں سب کچھ بھول سکتی ہوں مگر اپنے بیٹے کو نہیں۔ اس کے جانے کا دکھ بہت زیادہ ہے۔'' وہ اداس ہوگئی۔

''ظاہر ہے ماں اور اولاد کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ جسے خود اپنے وجود سے تخلیق کیا ہو۔ اس کی جدائی بے حد شاق گزرتی ہے۔'' شہزاد بولا۔

ارجمند نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

''اس کی بیماری کے دن میری زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات تھا۔ بے بسی کے عالم میں بھاگ دوڑ، قرض کے لیے ہاتھ پھیلانا۔ رو رو کر دعائیں مانگنا لیکن وہ پھر بھی نہ بچ سکا۔ پھر میں سوچتی ہوں۔ اچھا ہی ہوا جو وہ چلا گیا۔'' ارجمند نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''بڑا ہو کر مجھ سے اپنے باپ کا پوچھتا تو کیا بتاتی؟'' ضبط کے باوجود آنسو اس کے گالوں پر پھسل گئے۔

شہزاد نے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تمہارا درد سمجھ سکتا ہوں اگر تمہیں بیٹے کا دکھ ہے تو مجھے والدین کے چلے جانے کا۔'' وہ بھی اداس ہوگیا۔ ''غم سے مبرا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے ارجمند۔ ہم سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی درد، کوئی نہ کوئی احساسِ محرومی ضرور ہوتا ہے لیکن یہی درد، یہی احساسِ محرومی ہمیں ایک دوسرے کے قریب بھی لے آتا ہے..... ہوں.....؟'' اس نے ہولے سے ارجمند کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنا، کیا سمجھانا چاہتا تھا؟

کتنے رنگ و انداز ہیں اس محبت کے۔ کہیں آنسو، کہیں مسرت۔ کہیں فاصلہ، کہیں قربت، کہیں بے کیفی و بے قراری، کہیں سرور اور سرشاری۔ کہیں عمر بھر کی تلاش اور کہیں منزل خود آپہنچے بغیر سفر کے۔''

غم کو غمگسار میسر آجائے تو احساس کا انداز بہت سرعت سے بدلتا ہے۔ ارجمند کا دل کسی اور تال پر دھڑکنے لگا۔ اس کا سر خود بخود شہزاد کے شانے پر ٹھہر گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ برسوں سے اس شانے کی تلاش میں تھی، جس پر سر ٹکا کر اسے ایک عجب راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس طمانیت کی کیفیت کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لیے ارجمند نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے پورے وجود میں ایک بے نام کیف و سرور کی لہر دوڑ گئی۔ زندگی میں جو لمحہ پہلی بار آیا تھا، وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے اندر جذب کرلینا چاہتی تھی۔

یہ تو دو دلوں اور دو روحوں کا ملاپ تھا۔ جس نے اس کی سانسوں کو شہزاد کے ہم آہنگ کردیا تھا۔

ارجمند کو شہزاد کا دل اپنے وجود میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

ادھر شہزاد کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ارجمند نہیں۔ زندگی اس کی باہوں میں سمٹ آئی ہو۔ اس زندگی کو وہ اب کسی قیمت پر خود سے جدا کرنے کو تیار نہ تھا۔

ہم خوشیوں کی تلاش میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں مگر اس تلاش میں زیادہ تر غموں سے ہی واسطہ پڑتا ہے لیکن اگر دو غمزدہ دل یکجا ہو جائیں تو درد خوشیوں میں بدل جاتے ہیں۔ شہزاد کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت بھی اس وقت اس کی پناہ میں بازوؤں کے حصار میں تھی۔

☆.....☆

ارجمند، جھوت پر ٹہنی میں چاند کو تک رہی تھی، پلکیں جھپکائے بغیر وہ جانے کس کا چہرہ چاند میں تلاش کر رہی تھی۔ انجمن اوپر آئی تو اسے کھویا ہوا دیکھ کر حیران ہوگئی۔

"آپی کہاں کھوئی ہوئی ہیں؟" وہ اچانک سامنے آکر مسکرائی۔

"انجمن، شہزاد کہتا ہے کہ غم اور احساس محرومی سے کوئی میرا نہیں لیکن یہی غم اور احساس محرومی دو دلوں کو ایک دوجے کے قریب لے آتا ہے۔" وہ بدستور چاند کو تک رہی تھی۔

"اچھا تو پھر..... آپ نے کیا کہا؟" انجمن نے بغور اسے دیکھا۔

"کہنی کیا..... میں تو ابھی تک اس کے الفاظ کے تانے بانے میں ہی الجھی ہوئی ہوں۔" ارجمند کسی غیر مرئی نکتے کو سمجھتے ہوئے بولی۔

"آپی..... آپ کو شہزاد بھائی کیسے لگتے ہیں؟" انجمن نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"اچھا ہے۔ بہت Caring پازیٹو ہے....."

ابھی اس کا جملہ نامکمل ہی تھا۔

"آپی آپی..... آپ شہزاد بھائی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" وہ فرش پر پنجوں کے بل ارجمند کی کرسی کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیا؟" انجمن کی اس اچانک اور غیر متوقع تجویز پر وہ بوکھلا گئی۔

"جس کا چہرہ آپ چاند میں تلاش کر رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کہیں زمین پر ہو۔ آپ کے قریب، آپ کا منتظر۔" انجمن نے اپنی آپی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور وہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس رات اسے آخری پہر تک نیند نہ آئی۔ کبھی شہزاد کے الفاظ یاد آتے۔ تو کبھی انجمن کی باتیں۔ اس نے اٹھ کر بائی پیا اور پھر تکیے پر سر رکھ دیا۔ نیند کسی پل نہ آ رہی تھی۔ تین بج رہے تھے پھر بے چینی سے کروٹ بدل لی۔ نائٹ لیمپ آن تھا۔

"آپی، نیند نہیں آ رہی؟" انجمن کی آواز پر وہ چونک کر مڑی۔

"ارے انجمن، تم تو سو رہی تھیں؟" اس نے کہا۔

"کہاں سو رہی تھی۔ آپ کی اس بے تابی اور بے خوابی نے مجھے بھی جگا دیا ہے۔" ارجمند نے اس بے باکانہ جواب پر اسے گھورا۔ "میرا مطلب ہے کہ ایک بندہ بار بار کروٹیں بدلے تو برابر والے کی نیند تو خراب ہوگی ہی نا۔" اس نے ارجمند کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے پہلے جملے کی وضاحت کر دی۔

"سو جاؤ۔" ارجمند نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ انجمن نے قریب آکر اسی کے تکیے پر سر رکھ دیا۔ پھر کچھ توقف کے بعد اس نے سرگوشی کی۔

"شہزاد بھائی یاد آ رہے ہیں؟"

"تم سوتی ہو یا میں ایک چھپڑ ماروں؟" ارجمند نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈانٹا۔

"ٹھیک ہے۔ مت بتائیں، میں بھی نہیں بولتی آپ سے۔" وہ باقاعدہ ناراض ہو کر اپنے تکیے کی طرف بڑھی۔

"سن..... ناراض تو نہ ہو۔" ارجمند نے اسے فوراً کندھے سے پکڑ کر روکا۔ "مائی سوئیٹ سوئیٹ ڈارلنگ سسٹر، جب آپ اتنا ہی مجھے جان گئی ہیں تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"دیکھا میں نے کہا تھا نا، دل ہو گیا ہے تیرا دیوانہ۔ اب کوئی چٹا نہیں۔" وہ تان لگا کر گانے لگی۔

"شرم کر تھوڑی سی۔ رات کے تین بج رہے ہیں۔ برابر والے کمرے سے امی اٹھ جائیں گی۔" ارجمند نے گھرکا۔

"ایک نہ ایک دن تو امی کو پتا چلنا ہی ہے جناب۔ ویسے اگر ان نہ مانیں۔ تو پھر کیا ہوگا آپی؟" انجمن نے مسکین صورت بنا کر اسے دیکھا۔

"اللہ نہ کرے۔" ارجمند نے بے اختیار کہا۔ انجمن نے اس کی حالت پر قہقہہ لگایا۔

"چلیے سو جایئے۔ صبح آپ کو آفس بھی جانا ہے۔" اس نے ارجمند کو بڑے دلار سے چادر اوڑھا دی۔

ارجمند نے بھی مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆

اگلے روز جب وہ دونوں ملے تو نگاہوں کے زاویے بدلے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ کی قربت انہیں اس مقام پر لے آئی تھی، جہاں زبان کی جگہ نظر ہمکلام ہوتی ہے اور خاموشی بھی گفتگو بن جاتی ہے۔ دونوں نے کھانے کے دوران بھی کوئی خاص بات نہ کی۔ چائے سے فارغ ہو کر بظاہر تو وہ کام کر رہی تھی مگر ذہن کہیں اور تھا۔

"آج لگتا ہے۔ تمہارا دل نہیں لگ رہا کام میں؟ ہوں۔" شہزاد نے اس کی غیر حاضر دماغی کا نوٹس لیا۔ وہ اس کی چیئر کے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں..... وہ....." اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ شاید سر میں درد تھا۔ چہرے پر بھی تھکن تھی۔ شہزاد نے اس کے چہرے پر آجانے والے بال اپنے ہاتھ سے سنوارے۔ وہ نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے رات کو نیند نہیں آئی اچھی طرح..... تمہیں فون کرنے لگا تھا۔ پھر سوچا تمہاری نیند خراب ہو گی۔" وہ بتانے لگا۔

"تو لے لیتے نا فون۔" وہ بے تابی سے کہنے لگی۔

"میں بھی ٹھرتک جاگتی رہی ہوں۔ مجھے بھی نیند نہیں آئی۔" پھر خاموش ہو کر اپنے بال سمیٹنے لگی۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

"تم کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میں تھراپی دے دوں؟" اس نے پوچھا۔ ارجمند نے اثبات میں ہولے سے سر ہلایا۔

"Just give me ur hand"

شہزاد نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ارجمند نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ شہزاد کے ہاتھ میں دے دیا۔ شہزاد کے محبت بھرے لمس اور چاہت بھری نظر نے ارجمند کی رگوں میں ایک خمار دوڑا دیا۔ شہزاد کا دل بھی آنکھوں میں امڈ آیا۔ اس نے ہولے سے ارجمند کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

وہ بڑی محویت سے ارجمند کی آنکھوں، پلکوں، ابروؤں، رخساروں اور سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو ارجمند بھی اس خمار انگیز کیفیت میں ڈوبی رہی۔ پھر ذرا ہوش آیا تو اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

"او..... ہیلو..... ہوش میں آجایئے اب

جناب...... تھراپی دینے والے تھے آپ مجھے...... یاد ہے کچھ؟''

''اتنی دیر سے اور کیا کر رہا ہوں میں؟'' وہ کھویا کھویا سا بولا۔ پھر ارجمند کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل پر رکھ دیا۔

''محبت اور چاہت سے بڑھ کر کوئی تھراپی نہیں ہے دنیا میں جانِ شہزاد۔''

''جانِ شہزاد؟'' ارجمند نے حیرت سے دہرایا۔ ''مائی گاڈ...... کہاں سے سنے ہیں تم نے یہ رومانٹک ڈائیلاگز......؟''

''یہ ڈائیلاگز نہیں۔ میرے دل کی آواز ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

شہزاد کی دھڑکنیں ارجمند کی پوروں میں اتر رہی تھیں۔ چند لمحے تو وہ حیرت و استعجاب سے اسے دیکھتی رہی پھر گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

''اتنا ٹوٹ کر کسی کو نہیں چاہتے کہ پھر لمحہ بھر کی جدائی بھی برداشت نہ ہو سکے۔'' وہ کسی نامعلوم خدشے کے تحت بولی۔

''محبت میں خلوص ہو تو کوئی دو دلوں کو جدا نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔'' اس کا پُر یقین لہجہ ارجمند کی دھڑکنوں کو بے چین کرنے لگا۔

آج بھی ارجمند نے تمام قصہ انجمن کے گوش گزار کیا۔

''تم اس کی باتیں سنتیں ناں تو کبھی یقین نہ کرتیں کہ وہ ایک سائیکو تھراپسٹ ہے۔ وہ تو بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح مجھ سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ مجھے تو اس کی دیوانگی پر تعجب ہے۔''

''گویا...... دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔'' انجمن نے اپنی آپی کی حالت کا لطف اٹھایا۔

''تم تو مزے لے رہی ہے اور میرا سکون و قرار لٹ گیا ہے۔'' وہ بہت بے چین تھی۔

''ویسے...... آپی...... سائیکو تھراپسٹ تو اس وقت آپ بھی نہیں لگ رہیں۔'' وہ برابر چھیڑنے پر تلی تھی۔

ارجمند نے اسے غصے سے گھورا۔

''اچھا جناب! اگر ایسی ہی آپ کی بے قراری اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے تو ''ان'' سے صاف الفاظ میں شادی کی بات کریں اور ان سے کہیں کہ رشتہ بھیجیں۔'' اس نے مزے سے حل بتایا۔

''مگر اس کے تو والدین فوت ہو چکے ہیں اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔'' ارجمند بولی۔

''تو پھر خود ہی آ جائیں۔ امی سے آپ کا ہاتھ مانگنے۔'' انجمن نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیا۔

''امی مان جائیں گی ناں؟'' وہ بہت فکر مند تھی۔

''یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپی ڈارلنگ۔'' اس نے اپنا بازو ارجمند کی گردن میں حمائل کر دیا۔

''اب خوش؟''

''تھینک یو انجمن...... تم نے یہ مشکل آسان کر دی۔'' اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔

اس وقت اسے انجمن کا ساتھ کسی نعمت سے کم نہ لگا۔

☆......☆

ارجمند بہت دیر سے شادی کے بارے میں بات کرنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہی تھی۔ اس کی غیر حاضر دماغی چہرے سے عیاں تھی۔ دفتر کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا۔ شہزاد ای میلز چیک کر رہا تھا۔ وہ اس کی کرسی کے عقب میں کھڑکی میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔

''شہزاد...... تم شادی کب کرو گے؟'' ارجمند نے بلا تمہید دھیمے لہجے میں پوچھا۔

یہ سن کر شہزاد اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔

''تمہاری نظر میں ہے کوئی لڑکی؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کیسی لڑکی چاہیے تمہیں؟'' اس نے شہزاد کی طرف رخ موڑا۔

''تم جیسی۔'' شہزاد نے براہِ راست ارجمند کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''بالکل تم جیسی۔'' اس نے اپنی انگلیوں سے ارجمند کے بال سنوارے۔

''اچھا...... اور اگر مجھ جیسی لڑکی نہ ملی...... تو؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''وہ مجھے مل چکی ہے۔'' شہزاد نے بڑے یقین سے کہا۔ ''میری نظر کے سامنے، میرے دل کے قریب۔''

شہزاد کی نگاہوں اور سانسوں کی آنچ سے اسے یکدم بڑی تپش کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر نظر باہر کی طرف پھیر لی۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے بمشکل کہا۔

''تم میرے گھر آؤ نا کسی دن۔''

''سہرا باندھ کے؟'' شہزاد نے سرگوشی کی۔

''تمہیں شرم تو نہیں آتی؟'' اس نے خفگی سے گھورا۔

''سہرا باندھنے میں کیسی شرم؟'' وہ بھی مسلسل تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''شہزاد۔'' ارجمند کو غصہ بھی آ رہا تھا اور شرم بھی۔ اس نے پلٹ کر جانے کے لیے قدم بڑھایا تو شہزاد نے بازو تھام لیا۔

''ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔'' وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''پہلے ہاں کہو۔''

''تم ہر بات زبان سے کیوں سننا چاہتے ہو۔ تمہیں اقرار میری آنکھوں میں نظر نہیں آتا؟'' اس نے بھی براہِ راست شہزاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

اور واقعی ارجمند کی خاموش مگر متکلم نگاہوں نے شہزاد سے سب کچھ کہہ ڈالا...... محبت، وارفتگی، دیوانگی، خواہش، طلب...... سب کچھ۔

''تھینک یو ارجمند...... آج تم نے مجھے مکمل کر دیا ہے۔ I`m realy tankful to you.'' وہ مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے وارفتگی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

☆......☆

شادی کے بعد شہزاد، امی اور انجمن کو بھی اپنے گھر لے آیا۔ ارجمند تو ہمیشہ کے لیے اس کی ہو ہی گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک شفیق ماں اور ایک پیاری سی شریر سی چھوٹی بہن بھی اس کی فیملی کا حصہ بن گئی تھیں جس کے بعد وہ اپنے گھر کو مکمل پاتا تھا۔ امی کو بھی بیٹا اور انجمن کو بھائی مل گیا تھا۔ اب زندگی میں کسی شے کی کمی نہ تھی۔

شبِ عروسی کے موقع پر وہ سامنے بیٹھا، بڑی محویت سے ارجمند کو تک رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''سوچتا ہوں یہ خواب ہے یا حقیقت؟'' وہ بدستور تکتے ہوئے بولا۔

''اگر خواب ہو تو؟'' ارجمند بولی۔

وہ سامنے سے اٹھ کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ ''چلو تو پھر اس خواب کو حقیقت کے روپ میں ڈھال دیں۔'' ''ہوں......؟'' وہ بڑے رومانٹک موڈ میں تھا۔

''تم سائیکا ٹرسٹ تو بالکل بھی نہیں لگتے، شہزاد۔''

''اچھا، تو کیا لگتا ہوں......؟'' اس نے دھیمی سی سرگوشی کی۔

''پاگل۔'' ارجمند نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

''تمہارے عشق میں۔'' شہزاد نے ارجمند کو ٹہوکا دیا اور پھر وہ دونوں بے اختیار ہنس دیے۔

زندگی واقعی مکمل ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی مقدر میں خوشیاں اس طرح بھی آتی ہیں کہ ہر شے اپنے ساتھ مسکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

نکہت اعظمی

ہر اشک، اک ستارہ

زندگی کے حقیقی رنگوں سے سجے منی ناول کی بیسویں قسط

یہ کہانی ایسے کرداروں کے گرد بُنی گئی ہے جس میں عارفہ اس کہانی کا بنیادی کردار ہے، جس کی سب بہنیں شادی شدہ ہیں لیکن عارفہ کی شادی میں دیر ہو رہی ہے اور اس کی عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے اسی لیے ثاقب کا رشتہ فوری طور پر قبول کرلیا جاتا ہے۔ سسرال میں عارفہ کی دو نندیں شادی شدہ ہیں جب کہ سب سے بڑی نند آپا اور سسر گھر میں موجود ہیں۔ آپا بیگم نے زندگی گھر کے لیے وقف کردی ہے۔ عارفہ ان کے اکلوتے بھائی کی بیوی ہے۔ پڑھی لکھی سمجھدار ہونے کی وجہ سے آپا بیگم کی راجدھانی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اب آپا بیگم حیلے بہانوں سے بھائی کو قابو میں رکھنے کے درپے ہیں جو پہلے ہی سے ان کے پریشر میں ہے جب کہ عارفہ کے بھائی اور بڑی بہن بھی ملک سے باہر اپنی اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ عارفہ کے ماموں بھی اس کہانی میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور

علی کا کردار خاصا نمایاں ہے۔ اچانک عارفہ کے والدین ایک حادثے کا شکار ہو کر معذور ہو جاتے ہیں۔ اب عارفہ پر میکے اور سسرال کی دوہری ذمہ داری آجاتی ہے۔ آپا بیگم کسی طور پر بھی اس کی یہ چاکری پسند نہیں کرتیں مگر عارفہ مجبور ہے۔ ثاقب اس کا ساتھ دیتا ہے لیکن وہ بھی اس کی اس ڈیوٹی سے عاجز آجاتا ہے۔ عارفہ امید سے ہے۔ اس خبر کو سن کر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ دوسری طرف عارفہ کی ممانی علی کے رشتے کے لیے پریشان ہیں اور آئے دن کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا کیے اپنے میاں کے ساتھ نوک جھونک جاری رکھتی ہیں۔ اس ناول کا ایک کردار صابر صاحب کا گھرانہ بھی ہے جو کہ ورکنگ مدر کے مسائل کو بیان کرتا ہے، عمیر حسن اس ناول کا ایک اہم کردار ہے جو گھر سے اچانک غائب ہوگیا ہے۔ عارفہ اور ثاقب کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس گھرانے کے دکھ بھی بہت اہمیت اختیار کرتے جارہے ہیں جہاں مسز صابر عمیر کے گھر سے جانے کے بعد ہر روز پچھتاوؤں کا شکار ہیں، دوسری طرف ثاقب اور عارفہ کی زندگی میں خوشی کم اور اضطراب بڑھتے جارہے ہیں۔ صابر صاحب اپنے طور پر عمیر کو تلاش کر رہے ہیں اور اپنے رویے پر شرمندہ بھی ہیں۔ عارفہ کی زندگی سسرال اور میکے کے گرد ہی گھوم رہی ہے۔ ماموں اور ممانی جان کے گھر بھی علی کے رشتے کی تکرار ہے۔ مسز صابر اپنی الجھنوں کا شکار ہیں کہ ان سے اپنے کام میں غفلت ہو جاتی ہے۔ ان کی میڈم ان کی غلطی پر انہیں تنبیہ کرتی ہیں کہ غلطی دوبارہ ہوئی تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ مسز صابر افسردہ ہیں۔ ایسے میں ان کا ماتحت لڑکا کاشف ان کو حوصلہ دیتا ہے

اور انہیں ایک برگزیدہ شخصیت سے ملواتا ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد جیسے مسز صابر کی زندگی میں ایک صبر سا در آتا ہے۔ عارفہ میکے میں تھی کہ ماں کو واش روم سے لاتے ہوئے پیر پھسل گیا جس سے اس کی زندگی میں آنے والی خوشی کا چراغ بجھ گیا۔ ثاقب نے بہت حوصلے سے حالات کا سامنا کیا تھا۔ ماموں جان نے چچی رقیہ جوان کے چچا کی دوسری بیوی تھیں، کے بیٹے اصغر اور بہو شازیہ کو بہن کی تیمارداری کے لیے ان کے ہاں مستقل دن رات رہنے کے لیے جب پیشکش کی تو وہ انکار نہ کر سکے اور صفیہ کے ہاں آ گئے۔ ان کے آنے سے عارفہ کو یک گونہ سکون میسر آ گیا تھا۔ عارفہ دوسری مرتبہ امید سے تھی۔ روٹین چیک اپ کے لیے وہ ڈاکٹر بلقیس ہمدانی کے کلینک پر بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ اس کی ملاقات اپنے کالج کی کلاس فیلو سمیرا سے ہو گئی۔ دوسری طرف مسز صابر پر زندگی نے ایک مرتبہ پھر ستم توڑ دیا تھا۔ صابر صاحب کو زبردست ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اسپتال میں بہت جلد وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ان کے انتقال پر مسز صابر کے بچھڑے ہوئے میکے والے ان سے آن ملے۔ صابر صاحب کے بعد مسز صابر بیٹیوں کے لیے بہت فکر مند ہیں۔ آنے والے رشتوں کے لیے چھان بین کے فرائض ان کا داماد زبیر بیٹوں کی طرح انجام دے رہا ہے۔ عارفہ کی ملاقات سمیرا سے ہوئی تو مدحت کے شوہر ظفر کی حقیقت عارفہ کے سامنے کھل گئی۔ سمیرا، ظفر کی دوسری بیوی ہے۔ عارفہ مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔ جب وہ ظفر کی اصلیت سب کے سامنے عیاں کر دے مگر اس کے خلاف ظفر پہلے ہی جال تیار کر چکا ہے۔ ظفر اپنی مکارانہ روش کے تحت عارفہ کو ثاقب کی زندگی سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ عارفہ غصے میں ہمیشہ کے لیے واپس اپنے والدین کے پاس آ گئی۔ اسے امید تھی کہ ثاقب غصہ اترنے کے بعد اسے لینے ضرور آئے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ ماموں جان کی مہرین کے لیے امریکہ پلٹ حمزہ کا رشتہ آیا تو ممانی جان نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُدھر ثمرین بھی آصف سے بات کر کے عارف کے لیے مہرین کے رشتے کی بات گھر والوں تک پہنچا کر انہیں راضی کر چکی تھی۔ مسز صابر کی میڈم ان کی بیٹی صبا کے لیے اپنے کزن کا رشتہ لے کر آئیں جسے قبول کر لیا گیا اور صبا، ثاقب کی دوسری بیوی بن کر آپا کے پاس آ گئی۔ اِدھر عارفہ کے والد احمد صاحب کو بیماری کے بجائے عارفہ کی فکر مار گئی۔ ان کے انتقال پر سارے بہن بھائی جمع ہو چکے تھے۔ احمد صاحب کے انتقال پر جب سب بہن بھائی جمع ہوئے تو اپیا کی چرب زبانی اور بے اعتباری نے عارفہ سے شازیہ اور اصغر کا سہارا بھی چھین لیا۔ وہ بھرے پرے گھر میں بیمار ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھی۔ آپا نے صبا کو اپنے اشاروں پر نچانے کی کوششیں شروع کر دیں مگر اس بار ان کا کامیاب ہونا بڑا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ظفر نے عارفہ کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد پھر سے آپا بیگم کی راجدھانی میں قصے سے قدم جمانا شروع کر دیے تھے۔ ثمرین کی حمزہ سے شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ آصف کو یہ سب عجیب لگا تھا، اس نے مہرین سے عارف کے متعلق استفسار کیا تو وہ کنی کترانے لگی جس پر اسے طیش آ گیا۔ عارفہ کی زندگی میں حمیدہ خالہ کی صورت ایک فرشتہ اس کی مدد کو آ پہنچا تھا۔ عارفہ نے اسپتال میں ایک بیٹی کو جنم دیا۔ حمیدہ خالہ کے کہنے پر اس نے ثاقب کو فون کیا تو صبا نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ دوسری طرف آصف نے غصے میں ثمرین کو میکے بھیج دیا۔ گھر میں جیسے قیامت ہی آ گئی۔ اس کے پاس ہر بات کا جواب صرف آنسو تھے۔ علی، آصف کو سمجھانے کے لیے جب ثمرین کے سسرال پہنچا تو گھر میں یہ بات کھلی۔ آصف کی والدہ نے علی سے معذرت کی اور خود جا کر اپنی بہو کو گھر لے کر لانے کا یقین دلا کر علی کو رخصت کر دیا۔ ماموں جان کے سامنے ساری بات عیاں ہو چکی تھی۔ اب وہ کسی انتہائی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔ عارفہ، خالہ حمیدہ کے سہارے ماں اور بیٹی کے ساتھ جیسے نئی زندگی جینے لگی تھی۔ ثاقب کی نئی دلہن صبا نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ اسی طرح ظفر، صبا کو بھی دسترس میں لانے کے منصوبوں میں نئے سرے سے جُت جاتا ہے۔ مہرین، عارف کی دلہن بن کر ثمرین کے سسرال پہنچ گئی ہے۔ دونوں بہنیں ایک چھت تلے ہیں۔ مہرین نے کھرے کھوٹے کی پرکھ کروا کر عارف کے فیصلے کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ اس کی سسرال میں عزت اور بڑھ گئی ہے۔ علی کو جب پتا چلا کہ عارفہ کی زندگی برباد ہونے میں اس کا نام بھی شامل رہا ہے تو وہ پشیمان ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں باپ سے مشورہ کرتا ہے۔ ظفر آپا کی مکمل شہ پر صبا کو ہاتھ نہ آنے پر پرانا ڈرامہ پھر سے دہرانے لگا ہے مگر اس بار صبا کی صورت اس کا حریف بہت ہوشیار ہے۔ مسز صابر، کاشف میں جیسے عمیر کو ڈھونڈنے لگی ہیں۔ ظفر اور صبا کے ٹاکرے میں اس بار ظفر کو منہ کی کھانی پڑی۔ آپا کی ساری کوششیں بے کار ہو گئیں اور ثاقب صبا کو لے کر الگ ہو گیا۔ عارف امریکہ جانے کی تیاریوں میں مگن ہے۔ مہرین کی محبتوں نے اسے زندگی کی حقیقی خوشیاں دے دی ہیں۔ مسز صابر کاشف کی والدہ کی بیماری میں اس کا ہر طرح سے ساتھ دے رہی ہیں۔ اُدھر علی ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔ وہ عارفہ سے شادی پر سنجیدہ ہے۔ باپ سے ذکر کرتا ہے، وہ مان جاتے ہیں مگر جب یہ خبر ممانی جان تک پہنچتی ہے تو...... ثمرین کا بہن سے جلاپا عروج پر پہنچ چکا ہے۔ وہ جٹھانی ہو کر دیورانی کے نام کی ہر کسی کو مالا جپتے نہیں دیکھ سکتی۔ ثاقب کو کینیڈا کا ویزا مل گیا، وہ اور صبا بچوں کے ساتھ کینیڈا اشفٹ ہو گئے۔ مسز صابر خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ علی، عارفہ کو پرپوز کر چکا ہے لیکن عارفہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔ کاشف کی ماں مالکِ حقیقی سے جا ملی تھیں۔ وہ اور اکیلا ہو گیا تھا۔ مسز صابر اس کے دکھ سے دل سے رنجور تھیں مگر...... بے بسی سی بے بسی تھی۔ عارف امریکہ جانے والا ہے۔ مہرین اداس ہے مگر اچانک صفیہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ممانی جان نے مہرین کو اسپتال جانے سے سختی سے منع کر دیا۔ عارفہ ماں کے ساتھ تھی اور بالآخر وہ زندگی کی جنگ ہار گئیں۔ سارے بہن بھائی پاکستان آ گئے۔ ماں کے بعد انہیں عارفہ اور اس کے مستقبل کی فکریں دامن گیر ہیں۔ ایسے میں یاسر عارفہ کو غم کے بھنور سے نکال کر اسپیشل چائلڈ بچوں کے لیے اسکول کی بچپن کی آرزو کو حتمی شکل دے دیتا ہے۔ ماموں جان اور علی اس کے ہمقدم ہیں۔ عارفہ اپنا غم بھولنے لگی ہے۔ عارف امریکہ چلا گیا۔ مہرین اسے فون پر علی اور عارفہ کے بارے میں بتاتی ہے۔ ثمرین سن لیتی ہے۔ وہ من و عن ماں سے کہہ دیتی ہے جس پر ممانی جان ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہیں اور یوں معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ علی، عارفہ کے علاوہ کسی سے شادی نہ کرنے کا اعلان کر دیتا ہے۔ اُدھر صبا کینیڈا میں اپنے پیار جہانزیب کو دیکھ لیتی ہے اور......

اب آپ آگے پڑھیے:

"آج تو کھانے پر خاص اہتمام ہونا چاہیے۔ آج تو ہماری بیٹی آئی ہے۔" ماموں جان کے لہجے میں اتنی محبت تھی کہ مہرین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"پاپا آپ کی یہی باتیں تو مجھے ہر وقت یاد آتی تھیں اور میں انہیں یاد کر کے چپکے چپکے روتی تھی۔" وہ لاڈ سے بولی۔

"چپکے چپکے کیوں بلند آواز سے روتیں تاکہ ہمارے داماد صاحب کو پتا چلتا کہ ہماری بیٹی اپنے باپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔" ماموں جان نے مسکرا کر کہا۔

"انہیں احساس ہے۔ میں جب بھی اداس ہوتی تھی وہ فوراً فون ملا دیتے تھے اور صرف یہی نہیں، گھر کا سارا کام بھی خود ہی کرنے لگتے بلکہ مجھے گھمانے پھرانے بھی لے جاتے، اسی لیے جب میرا کام کرنے کو دل نہیں چاہتا میں آپ لوگوں کو یاد کر کے افسردہ شکل بنا لیتی۔" مہرین خوشگوار لہجے میں بتا رہی تھی اور اس کے ایک ایک انداز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"ویسے تمہارا میاں اچھا شریف آدمی ہے بلکہ اچھا خاصا ہینڈسم بھی ہے جب کہ تم تو نکٹی چپٹی سی ہو۔" علی بھی لاؤنج میں آ گیا تھا اور اسے چھیڑنے لگا۔

"زیادہ نہ بولو، ورنہ تمہاری بیوی ایسی لاؤں گی کہ اندھیرے میں نظر ہی نہیں آئے گی۔"

"کیا امریکہ میں کسی نیگرو خاندان میں میرے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔" وہ بھی خاصے اچھے موڈ میں تھا۔

"بھائی کان کھول کر سن لو، اب میں تمہاری ایک بات بھی نہیں سنوں گی۔ اب تمہیں شادی کرنی ہو گی۔" مہرین نے موقع غنیمت جان کر یہ ذکر چھیڑ دیا۔

وہ جب آئی تھی، مسلسل اسی موقع کی تلاش میں تھی۔

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ مجھے تو بچپن ہی سے شادی کا شوق ہے لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں۔" علی کو اس طرح ہلکے پھلکے خوشگوار انداز میں باتیں کرتے دیکھ کر مہرین کو لگا جیسے درمیان کا وقت کہیں تحلیل ہو گیا اور وہ کئی سالوں پیچھے چلی گئی۔

"ٹھیک ہے ای پھر ہم اس جمعے کو رشتہ لے کر جائیں گے اور اگلے جمعہ کو نکاح ہو گا۔" مہرین نے اپنی بات کہہ کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''اس کا مطلب ہے لڑکی تمہارے اردگرد کہیں موجود ہے۔'' علی قدرے سنجیدہ ہوگیا۔

''ہاں لڑکی بہت اچھی ہے۔ عارف کی کزن ہے۔ بہت خوب صورت اور سلیقہ مند ہے۔'' مہرین بھی ایکدم سنجیدہ ہوگئی۔

''ہاں اور کیا، اب میرے اندر بھی طاقت نہیں رہی۔ مجھ سے بھی اب یہ گھرداری کے بکھیڑے نہیں سمیٹے جاتے۔'' ممانی جان تو نہ جانے کب سے اس موقع کے انتظار میں تھیں۔

''مہرین اگر تم یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہو تو تم بھی سن لو۔ میں شادی نہیں کروں گا۔'' علی کا موڈ ایکدم بدل گیا اور وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا لاؤنج سے باہر چلا گیا۔

''بھائی......'' وہ اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکی۔

وہ حیرت سے گنگ ہوگئی۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ بڑی سے بڑی بات بھی، پر وہ کبھی اس طرح سنجیدہ نہیں ہوتا تھا لیکن پچھلے چند سالوں میں اس میں کتنی تبدیلی آگئی تھی۔

''پاپا...... بھائی کو...... کیا...... ہوگیا ہے؟'' وہ شرمندہ ہوکر بولی۔

ماحول مکدر سا ہوگیا تھا۔ وہ بات چھیڑ کر کھسیانی ہوگئی۔ ماموں جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں بعد وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''دیکھ لیا تم نے۔ بس یہی حالت ہے۔ اِدھر شادی کا نام لو، اُدھر دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میں تو اب ڈر کے مارے اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتی۔ میں نے بھی صبر کرلیا ہے کہ میرا نصیب ہی ایسا ہے۔ ایک ہی بیٹا ہے لیکن لگتا ہے کہ اس کی خوشی دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلی جاؤں گی۔'' ممانی جان دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

''مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ بھائی کے مزاج میں اتنی تبدیلی کیسے آگئی۔ میں نے تو پہلی دفعہ بھائی کو اتنے غصے میں دیکھا ہے۔'' مہرین علی کے رویے پر حیران تھی۔

''پتا نہیں عارفہ نے کیا جادو کردیا ہے۔ پہلے صفیہ اور احمد کی بیماری کا بہانہ تھا۔ اب سارا وقت ان کے اسکولوں کی نذر ہوگیا ہے۔ دونوں باپ بیٹے کو اسی کی فکر رہتی ہے اور اس کے چلتر دیکھو، ہر بات میں ان دونوں کو شامل کیا ہوا ہے۔ کوئی کام ان دونوں کے بغیر نہیں ہوسکتا۔'' ممانی جان کی تیوریوں کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔

''امی خیر یہ تو نیکی کے کام ہیں اور آپ کو پتا ہے۔ پاپا اور علی ہمیشہ سے ان کاموں میں آگے آگے رہتے ہیں بلکہ اب تو عارف بھی مدر فاؤنڈیشن کے ممبر بن گئے ہیں۔'' مہرین نے بھی مسکرا کے کہا۔

''خدا کے لیے تم اپنے آپ پر رحم کرو۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ عارفہ میں ایسی کیا خوبی ہے کہ جس کو دیکھو اس کے گن گا رہا ہے۔'' ممانی جان کے دل کا کینہ ان کے لبوں پر آگیا۔

''امی عارفہ باجی تو شروع سے ایسی ہیں۔ جب شادی نہیں ہوئی تھی تب بھی سارا خاندان ان کی تعریف کرتا تھا۔'' مہرین نے کشادہ دلی سے اعتراف کیا۔

''یہی تو سوچتی ہوں کہ ایسے گنوں والی لڑکی شوہر کے گھر میں کیوں نہ رہ سکی۔'' ممانی جان کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جو مہرین کو اچھا نہیں لگا۔

1300 سال تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہنے والا جزیرہ ''ایسٹر''

5 اپریل 1722 کو ایسٹر کے مذہبی تہوار کے دن، مشہور ولندیزی جہاز راں اور سیاح ''جیکب روگی دین'' (Jacob Roggeveen) نے اس جزیرے پر قدم رکھا تھا۔ جیکب روگی وین مہذب دنیا کا پہلا یورپی فرد تھا جس نے تقریباً تیرہ صدیوں تک باقی دنیا سے لاعلم رہنے والے اس آباد جزیرے کو دریافت کیا اور گم نامی میں چھپے ہوئے نادر اور انوکھے موآئی مجسموں کو شہرتِ دوام بخشی۔ اگرچہ ایسٹر کی مناسبت سے جزیرے کا نام ایسٹر آئی لینڈ مشہور ہوگیا ہے، تاہم جزیرے کو تیسری صدی عیسوی میں آباد کرنے والے ابتدائی آبادکار نسلی گروہ ''راپانیو'' (Rapa Nui) کے تاریخی نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ لاکھوں سال کے آتش فشانی کے عمل سے تقریباً تکونی شکل میں تشکیل پانے والے اس جزیرے کو مقامی مقامی افراد Te Pito O Te Henua یعنی ''زمین کی ناف'' (Navel of the world) بھی کہتے ہیں۔ جبکہ یہاں موجود چٹانوں سے تراشے ہوئے بلند بالا مجسموں کے لیے مقامی افراد اپنی مادری زبان کے لفظ ''موآئی'' کا استعمال کرتے ہیں جس کے معنی مجسمہ، بت یا مورتی کے ہیں۔

''امی آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔'' مہرین کو ماں کا انداز اچھا نہیں لگا۔

''تم کیا جانو میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ جب میں علی کی عمر کے لڑکوں کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش و خرم دیکھتی ہوں۔'' ممانی جان نے روتے ہوئے کہا۔

''امی اس میں تھوڑی سی غلطی آپ کی بھی ہے۔ آپ نے وقت پر بھائی کی شادی کردی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔'' مہرین نے انہیں آئینہ دکھایا۔

اب ویسے بھی تو ہر شخص ہی ان کو یہ الزام دے رہا تھا۔

''ہاں اب تم بھی مجھے ہی الزام دو۔'' ممانی جان نے باقاعدہ سسکیوں سے رونا شروع کردیا۔

''میں آپ کو الزام نہیں دے رہی لیکن آپ جانتی ہیں بھائی بچپن سے ہی اتنے ضدی ہیں۔ وہ کبھی اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ آپ کو ان کی بات ماننی ہی پڑے گی۔'' مہرین نے کہا۔

''میں مان بھی جاؤں تو کوئی فائدہ نہیں، عارفہ خود نہیں مانے گی۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے بہانہ بنایا ہے کہ اسے ثاقب نے طلاق نہیں دی۔'' ممانی نے یقین سے کہا۔

''ہاں ظاہر ہے ورنہ یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں تھا اگر عارفہ باجی کی مرضی ہوتی تو وہ خلع لے سکتی تھیں۔'' مہرین کے دل میں ہمیشہ سے عارفہ کی محبت تھی۔

''میں نے سنا ہے۔ کچھ عرصے پہلے ثاقب پاکستان آیا تھا۔ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے۔'' ممانی جان نے بڑے رازدارانہ انداز میں اسے یہ خبر سنائی۔

''ہاں جب میں پاکستان آئی تھی۔ میں نے ایئرپورٹ پر ثاقب بھائی کو دیکھا تھا مگر وہ اس وقت اندر لاؤنج کی طرف جا رہے تھے۔'' مہرین نے بھی بتایا۔

''شاید عارفہ کو اس کے آنے کی خبر نہیں تھی۔ ورنہ وہ ضرور ذکر کرتی۔'' ممانی جان نے بتایا۔

''دنیا اتنی بڑی ہے جو ایک بار چلا جائے، وہ کب ملتا ہے۔ ویسے یہ ثاقب بھائی نے زیادتی کی اگر وہ طلاق دے دیتے تو عارفہ باجی دوسری شادی کرسکتی تھیں۔'' مہرین ہمیشہ سے عارفہ کو بے حد پسند کرتی تھی اور اسے

عارفہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر بہت افسوس تھا۔

"توبہ کرو۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ طاہرہ کا بھی جب فون آتا ہے وہ بھی یہی کہتی ہے کہ اچھا ہے بٹا قب نے طلاق نہیں دی۔ عارفہ کے ماتھے پر طلاق کا دھبہ تو نہیں لگا اور پھر عارفہ نے کون سا دوسری شادی کرنی تھی۔ خدا نے اسے بچی دی ہے۔ وہ اس کے سہارے زندگی گزار سکتی ہے۔"

"خیر طاہرہ باجی کی تو باتیں نہ کریں۔ وہ بے حد خود غرض ہیں۔ انہوں نے تو کبھی اپنے ماں باپ کا خیال نہیں کیا۔"

"تم کچھ بھی کہو، وہ اپنا گھر تو بسائے بیٹھی ہے اور عارفہ نے تو ماں باپ کی خاطر اپنا گھر برباد کرلیا۔" ممانی جان نے پھر طنز کیا تو مہرین نے خاموشی اختیار کرلی۔

ممانی جان وہی کہہ رہی تھیں جو ساری دنیا کہتی تھی۔

☆.....☆

چھٹی کے دن عام طور پر پارلر میں روز سے زیادہ رش ہوتا تھا۔ وہ بھی صبح سے کام کر کر کے تھک چکی تھی لیکن ابھی بھی دو خواتین اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ وہ چند لمحے آرام کر کے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟ میں نے تو آپ سے اسٹیپ کٹنگ کے لیے کہا تھا اور آپ نے میرے بال اتنے زیادہ کاٹ دیے۔" وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی کہ کسٹمر کی غصے سے بھنائی ہوئی آواز پر چونک گئی۔

"اوہ!! واقعی!" وہ گھبرا گئی۔ اس سے غلطی ہوگئی تھی۔

یہ کوئی نئی کسٹمر تھی۔ سانولے رنگ کی خاصی بدصورت درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔

"آئی ایم سوری میں ٹھیک کردیتی ہوں۔" وفا نے لجاجت سے کہا۔

"اب کیا ٹھیک کریں گی۔ میرے بالوں کا تو ستیاناس ہوگیا۔" وہ غصے سے اور زیادہ چلانے لگیں۔

"پلیز آپ میری بات تو سنیں۔ میں ٹھیک کردیتی ہوں۔" اس نے پھر بڑی منت سے اپنی بات کو دہرایا۔

"بکواس بند کرو۔ تم کیا ٹھیک کرو گی۔ تمہاری اوقات کہاں ہیں۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔ نہ جانے کیسی اناڑی لڑکیوں کو رکھ لیا ہے۔" ان کا غصہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

وہ غصہ کرنے میں حق بجانب تھیں۔ ان خاتون کو اپنے بھائی کی بارات لے کر جانا تھا اور ان کی شکل عجیب مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ایک ہزار روپے کا فیشل کرانے کے بعد بھی ان پر کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا۔ ان کا شور وغل سن کر اور بھی اپنے آفس سے باہر آگئیں اور ساری بات سن کر اسی پر برس پڑیں۔

"میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں۔ تم اپنا کام توجہ سے نہیں کر رہی ہو۔ مجھ سے اور بھی کسٹمرز شکایت کر چکی ہیں۔" ان کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔

"میم آئی.....ایم.....سوری....." مارے خفت کے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"تمہارے سوری کہنے سے میرے بال تو ٹھیک نہیں ہوسکتے۔" وہ خاتون پھر چلائیں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ کے بالوں کو کوئی اور خوب صورت سا اسٹائل دے دیں جو آپ کے چہرے پر زیادہ سوٹ کرے۔" اس نے وفا کو تہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

غاروں والا شہر

روسی ریاست جارجیا، میں ایک ایسا قدیم شہر موجود ہے جس کے مکین زیر زمین تراشے گئے پتھریلے غاروں یا گپھاؤں میں رہتے تھے۔ یہ غار آج بھی موجود ہیں، مگر یہ کافی شکستہ ہوچکے ہیں۔ زمانے کے سرد وگرم نے ان رہائش گاہوں کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہے مگر جارجیا کی حکومت نے، ان کی مرمت بھی کی اور تزئین و آرائش بھی کی، کیونکہ یہ ان کی ثقافت کا ورثہ ہے اور دنیا بھر کے سیاح، ان غاروں کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ پتھریلے مکانات والے، اس قدیم شہر کا نام Uplistsikhe ہے جس کا مقامی زبان میں مطلب ہے: "دیوتاؤں کا قلعہ" گویا یہاں کی روایات کے مطابق، کبھی ان مکانوں میں دیوتا رہتے تھے تاکہ آسمانی دیوتا دنیا کے لوگوں کے ہنگامے اور شور وغل سے بچ کر یہاں سکون سے رہیں۔ یہ قدیم طلسماتی شہر شرقی جارجیا میں واقع ہے۔

پارلر میں ایک ہنگامہ سچ گیا تھا۔ وہ لڑکیاں جو وفا کے کام اور اس کی خوب صورتی سے جلتی تھیں۔ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔ سب تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے تھے اور وفا کی حالت یہ تھی گویا اس کے جسم میں جان نہ ہو۔

"پلیز آپ لوگ اس طرح نہ کریں۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اس بچی سے غلطی ہوگئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ سب کے سامنے اس کو اس طرح شرمندہ کریں۔" ایک چالیس بیالیس سال کی بے حد ڈیسنٹ سی خاتون نے آگے بڑھ کر وفا کی حمایت کی۔

وفا نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ ان کے لیے مکمل اجنبی نہیں تھیں۔ وہ کسی بریگیڈیئر کی بیوی تھیں۔ کچھ دنوں پہلے ہی ان کے شوہر کی پوسٹنگ کراچی میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک آدھ دفعہ پارلر آچکی تھیں اور اتفاق سے وفا ہی نے ان کے بالوں کی کٹنگ کی تھی اور آئی بروز بنائی تھیں۔

ان کی مداخلت پر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی شخصیت کا اثر ہی کچھ ایسا تھا۔

"مگر آپ یہ تو بتائیے میں کیا کروں؟" بیوٹی پارلر کی مالکن نے الٹا ان سے سوال کیا۔

"آپ درست کہہ رہی ہیں۔ اس بچی سے غلطی ہوئی ہے اور اب یہی اس غلطی کو ٹھیک کرے گی۔ یہ بچی بہت ذہین ہے اور مجھے یقین ہے یہ اپنی غلطی کو کسی نہ کسی طور سے درست کرلے گی۔ آؤ بیٹا! میں بھی تمہیں گائیڈ کروں گی۔" انہوں نے بہت پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

ان کی محبت اور حوصلہ افزائی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسے لوگ کتنی بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ جو آگے بڑھ کر گرتوں کو سہارا دیتے ہیں۔ کسی کو ذلت سے بچالیتے ہیں، کسی مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ دنیا، ایسے ہی لوگوں کے دم سے روشن ہے۔

"تھینک یو۔" وفا نے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

وہ پھر سے بڑی توجہ کے ساتھ دوبارہ ان خاتون کے بال سیٹ کرنے لگی۔ اس دوران وہ مہربان خاتون اس کے سامنے بیٹھ کر اسے مشورے دے رہی تھیں اور ان کی کسی بات پر وہ دھیمے سے مسکرائی تو وہ ایکدم چونک گئیں۔

"یہ چہرہ تو بہت دیکھا بھالا لگ رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔"

''یہ چہرہ تو بہت دیکھا بھالا لگ رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔'' یہ خیال بار بار انہیں تنگ کر رہا تھا۔

☆......☆

عارف کے پوسٹنگ آرڈر آ گئے تھے اور اسے فوری طور پر ملتان جانا تھا۔ جون کا مہینہ تھا اور اتنی گرمی میں ملتان کا تصور ہی مہرین کے ہوش اڑائے دے رہا تھا۔ ابھی تو دونوں بچے کراچی کی آب و ہوا کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ آئے دن دونوں میں سے کوئی نہ کوئی بیمار ہو جاتا، بڑی بیٹی مناہل تو پیدائشی طور پر ہی کمزور تھی اور جب سے پاکستان آئی تھی۔ مستقل ہی بیمار تھی کبھی اس کا پیٹ خراب ہو جاتا اور کبھی بخار ہو جاتا۔ چھوٹا بیٹا تیمور بھی پاکستان آ کر خاصا چڑچڑا اور ضدی ہو گیا تھا۔ اس سے یہاں کی گرمی اور مچھر بالکل برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں ضد کرتا۔ پھر گھر میں اس کے اور ثمرین کے درمیان ان کہی سی سرد جنگ جاری تھی۔ ثمرین بلاوجہ مہرین کی ہر بات سے چڑنے لگی تھی۔ وہ ساس کا خیال رکھتی تو اسے برا لگتا۔ گھر کے کام کرتی تو اسے غصہ آتا، وہ اس کے بچوں کے لیے چیزیں لاتی تو اس کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔

''لگتا نہیں کہ تم دونوں سگی بہنیں ہو، تمہارے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' آصف اس کی شکایتوں پر اسی کو موردِ الزام ٹھہراتے تو وہ اور زیادہ سلگ جاتی۔

''ہاں بہت فرق ہے۔ مجھے اس کی طرح ساس نندوں کی چاپلوسی کرنا نہیں آتی۔'' ثمرین اس بات پر شرمندہ ہونے کے بجائے چڑ گئی۔

''اس میں چاپلوسی کی کیا بات ہے؟ یہ تو تعریف کی بات ہے کہ اس نے اپنی زبان کی شیرینی اور اچھے برتاؤ سے سارے گھر کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔'' آصف ہمیشہ سے صاف گو تھے۔ وہ دوٹوک اور کھری بات کہنے کے عادی بھی تھے۔

''ظاہر ہے وہ امریکہ سے آئی ہے، سب کے لیے بیگ بھر بھر کے تحفے لائی ہے۔ اسی لیے تو سب اسی کے گن گا رہے ہیں۔'' اس نے بیزاری اور حسد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی کسی کے تحفوں کا بھوکا نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان کا اخلاق ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔'' آصف کو ثمرین کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔

''مجھے تو اس کا برتاؤ ایسا کوئی خاص نظر نہیں آتا۔'' ثمرین نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

''غور کرو۔ وہ امی کی کتنی خدمت کرتی ہے۔ عائزہ اور فائزہ کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ کس طرح سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔'' آصف نے مزید اس کی تعریف کی۔

''وہ چار دن کے لیے آئی ہے تو سب کو اس کی خدمتیں نظر آ رہی ہیں۔ میں سالوں سے کام کر رہی ہوں تو کسی کو نہ میرا کام دکھائی دیتا ہے اور نہ میری خدمتیں۔'' ثمرین کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔

''تمہارے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم کام کرتی ہو مگر تمہارا منہ بنا رہتا ہے۔ جب کہ وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔''

آصف کے اس طرح تعریف کرنے پر وہ اور زیادہ چڑ جاتی، میکے میں بھی سب اسے ہی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ علی تو پہلے ہی اسے زیادہ چاہتا تھا۔ اب امی بھی ہر بات میں مہرین سے مشورہ کرتی تھیں۔

'پتا نہیں اس کے پاس کیسا جادو ہے جو ہر کوئی اس کا دم بھرتا ہے۔' اس وقت بھی وہ روٹی پکا کر نکلی تھی اور مہرین کو ساس کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے سوچا۔

مہرین کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد اس کی ساس کسی کام سے کچن میں آئیں تو کچن کی حالت دیکھ کر وہ بری طرح تپ گئیں۔ چولہے پر آٹے کی خشکی بکھری ہوئی تھی۔ آٹے کا تسلہ بغیر دُھلا ہوا سنک میں رکھا تھا۔ وہ بہت نفاست پسند خاتون تھیں۔ گھر یا کچن میں ذرا سی گندگی اور بے ترتیبی ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ خاموشی سے کچن صاف کرنے لگیں کہ مہرین تیمور کا دودھ بنانے کچن میں آ گئی۔

''امی، آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اسے معلوم تھا صبح سے ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا اور وہ سر کے درد سے بے حال لیٹی تھیں۔

''اتنے دن ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک ثمرین کو کام کا سلیقہ نہیں آیا۔ جب بھی کھانا پکائے گی، کبھی کچن صاف نہیں کرے گی جب کہ جانتی ہے کہ مجھ سے کچن میں ذرا بھی گندگی برداشت نہیں ہوتی۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

مہرین نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے برتن لے لیے۔ ''آپ جائیں آرام کریں، میں کچن سمیٹ دیتی ہوں۔'' مہرین نے آہستگی سے انہیں روکتے ہوئے کچن کی صفائی شروع کر دی۔

''تم کیا کیا کرو گی؟ جب سے آئی ہو، گھر کا سارا کام تم نے ہی سنبھال لیا ہے۔ سارے دن میں ایک وقت وہ صرف روٹی یا سالن پکاتی ہے تو کچن کا ایسا حشر کرتی ہے کہ قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دونوں بہنوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟'' وہ جتنا ثمرین سے بدظن تھیں، اتنا ہی اس سے خوش تھیں۔

''ثمرین کی ہمیشہ سے یہی عادت ہے، امی بھی اس کی اسی بات پر بہت ناراض ہوتی تھیں۔'' اس نے ساس کا غصہ کم کرنے کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''نہ جانے اسے کب سلیقہ آئے گا۔ مجھے تو عارف کے جانے سے زیادہ تمہارے جانے کا سوچ کر ہول اٹھتا ہے کہ اب میں کیا کروں گی۔ اتنے دنوں بعد مجھے اتنا آرام ملا ہے جتنا زندگی میں کبھی نہ ملا اور اب تو مجھ میں کام کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ ذرا سا ہی کام کروں تو تھک جاتی ہوں۔'' وہ اسے دیکھ کر محبت سے بولیں۔

''امی! آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ عارف بھی یہی کہہ رہے تھے کہ ہم امی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔'' مہرین نے محسوس کیا کہ وہ خاصی کمزور بھی ہو گئی ہیں۔

''خدا! تم دونوں کو شاد و آباد رکھے۔'' وہ اسے دعائیں دیتی ہوئی کچن سے نکلیں۔

لاؤنج میں سامنے صوفے پر لیٹی ہوئی ثمرین نے منہ پھیر لیا۔ اس نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں اسے جلانے کے لیے جان بوجھ کر اداکاری کر رہی ہیں۔ واقعی جب دلوں پر حسد کا پردہ پڑ جائے تو ہر رشتہ ہی دھندلا جاتا ہے۔

☆......☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ حمیدہ خالہ سوتے سوتے چونک کر اٹھ گئیں۔ انہیں فضا میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آواز عارفہ کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ وہ عام طور پر اپنے کمرے کا دروازہ لاک نہیں کرتی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے کمرے

میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ انہوں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہ سامنے ہی جائے نماز پر سجدے کی حالت میں تھی اور اس کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کمرے کی مدھم روشنی میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی پاکیزہ سی چمک تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا رواں تھا اور اس کے لبوں پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ لا الہ الا اللہ وہ مسلسل اس پاک کلمے کو دہرا رہی تھی۔ ساری فضا پر ایک فسوں طاری تھا اور ہر شے جیسے اس کلمے کا ورد کر رہی تھی۔ ان کے اندر کپکپی سی پیدا ہونے لگی۔ وہ اسی طرح دبے پاؤں اپنے کمرے میں واپس آ گئیں۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھتی ہے لیکن اس کیف اور جذب کے عالم میں انہوں نے آج پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا اور اس کیفیت میں اسے دیکھ کر انہیں اس پر رشک آ رہا تھا۔

☆......☆

"آج تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ اتنا زبردست میک اپ کیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی۔" مسز طارق نے آئینے میں خود کو دیکھ کر بے اختیار وفا کو گلے سے لگا لیا جو گزشتہ ایک گھنٹے سے ان کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ آپ ہیں ہی اتنی پیاری آپ تو بغیر میک اپ کے بھی اچھی لگتی ہیں۔" وفا نے اپنی تعریف پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مسکراتی رہا کرو۔ جب تم مسکراتی ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے......" وہ پھر کہیں کھو گئیں۔

اب تو اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ وفا سے باتیں کرتے کرتے کسی سوچ میں گم ہو جاتی تھیں۔

"میں بچپن میں بہت ہنستی تھی لیکن اب تو میرا مسکرانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" وفا اداسی سے بولی۔

آج وہ صبح سے بہت دکھی ہو رہی تھی۔ امی نے رات کو شاید عمیر کو خواب میں دیکھ لیا تھا۔ وہ صبح سے مسلسل اسی کی باتیں کر رہی تھیں۔ دو دن پہلے اس کی سالگرہ بھی تھی۔ مسز صابر نے وفا سے کہہ کر کیک بھی منگوایا تھا اور موم بتیاں بھی، انہیں بڑی شدت سے اس کی ابتدائی سالوں کی سالگرہیں یاد آ رہی تھیں۔ جب صابر صاحب بہت دھوم دھام سے اس کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ وہ بتا رہی تھیں۔ "میں نے عمیر کی پہلی سالگرہ پر شیروانی سلوائی تھی اور گولڈن شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں وہ بالکل شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ اتنا سرخ و سفید تھا کہ دیکھنے والے اسے پٹھان سمجھتے تھے، میں تو ہر روز اس کی نظر اتارتی تھی۔" وہ بتا رہی تھیں اور وفا کا دل جیسے کٹا جا رہا تھا۔ وہ انہیں اس طرح غم زدہ چھوڑ کر آنا بھی نہیں چاہ رہی تھی لیکن اسے پارلر آنا بھی ضروری تھا۔ آج کل شادیوں کا سیزن تھا۔ روزانہ ایک دو دلہنیں ضرور آتی تھیں اور اب تو دلہن کے ساتھ اس کی ماں، بہنیں، کزنز، سب ہی پارلر سے تیار ہوتی تھیں۔

مسز طارق کے بھی بھانجے کی شادی تھی۔ وہ اپنے بالوں کی کٹنگ، آئی بروز، ویکسنگ اور میک اپ وفا ہی سے کرواتی تھیں۔ ان چند دنوں میں وہ وفا کو بہت زیادہ پسند کرنے لگی تھیں اور دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ وہ کبھی کبھار مذاق میں کہتیں۔ "تم اتنی پیاری ہو کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں تمہیں اپنی بھابی بنا لیتی۔"

ان کے اس جملے پر وہ اداسی سے مسکرا دیتی۔ "انہیں میری اصلیت کا علم نہیں اگر انہیں پتا چل جائے کہ میں نے اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے کتنے برے آدمی سے شادی کی تھی اور اپنے والدین کو کتنا دکھ پہنچایا تھا تو یہ مجھ سے کتنی نفرت کرنے لگیں گی۔ یہ تو سمجھتی ہیں کہ میں بہت نیک اور معصوم لڑکی ہوں انہیں کیا پتا کہ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں۔ میں تو وہ ہوں جس نے اپنی دنیا بھی خراب کی اور عاقبت بھی۔"

"تم کہاں کھو گئیں واپس آ جاؤ۔" مسز طارق نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اس کی خوبصورت براؤن آنکھوں کی سرخی میں نمی گھل رہی تھی۔

"نہیں...... کہیں نہیں......" وہ آنسوؤں کو چھپانے کے لیے آئینے کے سامنے رکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔

"کیا بات ہے، تم اپنا غم مجھ سے شیئر نہیں کرو گی۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اتنی اپنائیت سے پوچھا کہ وہ ضبط نہ کر سکی۔

"پرسوں میرے چھوٹے بھائی کی سالگرہ تھی۔ وہ بچپن میں گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔"

"چہ...... چہ...... یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔ وہ کتنا بڑا تھا۔" انہیں یہ پوچھتے ہوئے بھی عجیب سا درد محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ اس وقت تیرہ سال اور چھ مہینے کا تھا۔ امی ہر روز اس کا صدقہ اتارتی تھیں۔"

"تمہاری امی تو اسے بہت یاد کرتی ہوں گی۔" انہوں نے کہہ تو دیا لیکن انہیں اپنا یہ سوال بے حد فضول لگا۔

"وہ تو اس کے جانے کے بعد جیسے اس دنیا ہی میں نہیں رہیں۔ کبھی کبھی تو ایسی عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں کہ خوف محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ ان کے سامنے بیٹھا ہے اور اب تو جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں، ان کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی جا رہی ہے اور اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی عمر کا کوئی لڑکا کسی ہوٹل یا ورکشاپ میں کام کرتا نظر آئے تو گھر آ کر سارا دن روتی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو IJS نائٹ اسکول بھی جوائن کیا ہے، جہاں ایسے ہی بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔" وفا کا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ ان کے اپنائیت بھرے لہجے نے اسے بے اختیار کر دیا تھا۔

"خدا ان کو صبر دے۔ میں کسی دن تمہارے گھر ضرور آؤں گی اور تمہاری امی سے بھی ملوں گی۔"

"جی ضرور...... میں آپ کو عمیر کی تصویریں دکھاؤں گی۔ میرا بھائی بہت پیارا ہے۔ اب تو جوان ہو گیا ہوگا۔ اگر ہمارے پاس ہوتا تو ہمیں کتنا سہارا ہوتا۔ پھر شاید وہ مجھے نوکری بھی نہ کرنے دیتا۔ وہ بہت حساس تھا۔" بہت دنوں بعد وفا نے کسی سے اس طرح اپنے دل کی باتیں کی تھیں اور وہ بھی شاید اس لیے کہ ان میں اسے عجیب سی اپنائیت اور محبت محسوس ہوتی تھی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں...... یہ تمہارا انعام ہے۔" مسز طارق نے کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے کے بعد پانچ سو کا نوٹ اسے تھمانا چاہا تو اسے اپنا آپ بہت چھوٹا محسوس ہوا۔

"نہیں...... میم...... پلیز...... آپ سے میرا...... محبت کا رشتہ ہے۔ اس میں اس کاغذ کے ٹکڑے کو شامل نہ کیجیے۔ مجھے بہت دکھ ہوگا۔" اسے اتنی تکلیف ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ارے...... ارے...... ایسے نہ کرو۔ اس طرح نہ روؤ، آئی ایم سوری، ریئلی ویری سوری...... پلیز...... میرا

یہ مطلب نہیں تھا۔تم تو میری چھوٹی سی پیاری بہن ہو۔کیا بڑی بہن چھوٹی بہن کو تحفہ نہیں دے سکتی۔'' وہ اسے پیار سے چمکارنے لگیں تو وہ بھی روتے روتے ایکدم مسکرادی۔

''جب تم مسکراتی ہو تو تمہارے گالوں پر کتنے خوب صورت ڈمپل پڑتے ہیں بالکل اسی طرح.....'' ان کے اندر کی بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔''

وہ پارلر سے باہر آئیں تو ان کے شوہر ان کا انتظار کررہے تھے۔

''جی آپ کون؟'' وہ گاڑی کے قریب آئیں تو طارق نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا بہت خوفناک لگ رہی ہوں؟''

''ہمیشہ سے تھوڑی کم۔'' وہ پھر مسکرائے۔

''اس کا مطلب ہے اچھی لگ رہی ہوں۔''

''واقعی لگتا ہے اس دفعہ ڈسٹنگ پینٹنگ کسی ماہر نے کی ہے۔''

''اسی لڑکی نے کی ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔''

''اگر تم اجازت دو تو میں بھی اپنے لیے اس کی خدمات حاصل کرلوں۔'' وہ شوخی سے مسکرائے۔

''آپ کچھ بھی کروالیں، آپ کا اب کچھ نہیں بگڑ سکتا۔'' انہوں نے بھی اپنے اندر کی تپش کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''اب ایسے بھی نہ کہیے اگر آپ اجازت دیں تو کل ہی شہنائیاں بجوا دیتے ہیں۔آپ کی ذمہ داریاں بھی کم ہوجائیں گی اور بچوں کے لیے بھی جونیئر مما آجائیں گی۔ بریگیڈیئر طارق کی یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ ہر وقت خوش وخرم رہتے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

''دو دن سے فراز کا فون نہیں آیا۔'' انہوں نے شوہر کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا جو پی ایم اے (PMA) میں فوجی ٹریننگ لے رہا تھا۔

''آپ کو تو پتا ہے آج کل اس کے امتحان ہورہے ہیں اور امتحانوں کے زمانے میں ہمارے صاحبزادے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے ہیں۔''

''اللہ اسے کامیاب کرے۔'' انہوں نے دل سے دعا دی۔

☆.....☆

دو دن I.C.U. میں رہنے کے بعد وہ کل ہی وارڈ میں شفٹ ہوئی تھیں اور ان دو دنوں میں وہ برسوں کی بیمار نظر آرہی تھیں۔اسپتال میں ان کی تیمارداری کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مدر فاؤنڈیشن کے سارے ممبرز، نائٹ اسکول کے سارے اسٹوڈنٹس، حیا، اس کا شوہر، ان کی والدہ، بھائی، بھابیاں، یہ تمیں سب ہی صبح سے شام تک اسپتال کے چکر لگا رہے تھے۔ عارفہ بھی دن میں ایک بار ضرور ان سے ملنے آتی تھی، سب ہی حیران تھے کہ انہیں کیا ہوگیا ہے۔ان کے لبوں پر ایک چپ تھی اور آنکھوں میں بے پناہ ویرانی.....

وفا کو کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ پارلر سے واپس آئی تو ان کو عجیب حالت میں دیکھا، وہ صوفے پر بے ہوش پڑی تھیں۔ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہورہے تھے۔ اس نے فوراً حیا کو فون کیا۔ حیا اور زبیر اسی وقت آگئے تھے پھر زبیر نے فوراً ایمبولینس کا انتظام کیا اور اسی وقت وہ سب انہیں اسپتال لے کر آگئے۔

ڈاکٹرز کا خیال تھا، انہیں کوئی شدید قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ وفا کو کچھ شک تو تھا لیکن ابھی تو ان سے کوئی بھی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ انہیں اس حالت میں دیکھ کر اپنی سدھ بدھ بھلا بیٹھی تھی۔اس کی ساری دنیا ماں کے وجود میں سمٹ آئی تھی۔ وہ دو دن سے ماں کے گرد پروانے کی طرح چکر لگا رہی تھی۔ نہ اس نے ڈھنگ سے کچھ کھایا تھا اور نہ ہی وہ سوئی تھی۔ سب ہی اسے سمجھا کر تھک گئے تھے لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسپتال سے گھر نہیں گئی۔

''وفا، مسز صابر اب کافی بہتر ہیں۔تم گھر جاکر آرام کرلو۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔'' عارفہ شام کو انہیں دیکھنے آئی تو وفا کو ان کی پائنتی کے پاس بیٹھا دیکھ کر اسے سمجھانے لگی۔

''عارفہ باجی! میں نے امی کو بہت دکھ دیے ہیں۔ میں نے امی کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔اب میں اپنی ہر زیادتی کی تلافی کروں گی۔اب میں ایک لمحے کے لیے بھی امی کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگی۔

''تو تم ان کی خدمت کے لیے اپنے اندر طاقت تو پیدا کرو۔اس طرح رہو گی تو خود بیمار ہوجاؤ گی۔'' عارفہ نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں بہت ڈھیٹ ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو بہت ستایا ہے۔ بہت رلایا ہے۔ مجھ جیسی اولاد کو تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔'' وہ عارفہ کے محبت بھرے لمس سے بے قابو ہوکر اور زیادہ رونے لگی۔

''بری بات!! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ انسان کی بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرلے اور پھر دوبارہ وہی غلطیاں نہ کرے۔''

''بعض غلطیاں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے دہرانے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک غلطی ساری زندگی کے لیے سزا بن جاتی ہے۔ میری غلطی کی وجہ سے میرے ماں باپ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ میرے دکھ نے میرے باپ کو وقت سے پہلے بوڑھا کردیا اور اب میری ماں.....'' وہ کہتے کہتے پھر رونے لگی۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ مسز صابر تمہیں کتنا چاہتی ہیں۔ وہ تو ہر وقت یہی کہتی ہیں کہ اگر وفا نہ ہوتی تو شاید میں زندہ نہ رہتی۔ وفا تو میرا سہارا ہے۔ میری ڈھارس ہے۔'' عارفہ جانتی تھی کہ پچھتاوؤں کے تپتے ہوئے راہوں پر محبت اور ہمدردی کے الفاظ کس طرح مرہم کی طرح ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔

''واقعی امی..... یہ کہتی ہیں.....'' اس نے بے یقینی سے عارفہ کو دیکھا۔

''تم ماں نہیں بنی، اس لیے جانتی ہی نہیں کہ ماں کیا ہوتی ہے؟'' عارفہ نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں ماں نہیں بنی لیکن میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے اور اپنی ماں کو دیکھ کر خدا کی محبت کا یقین آیا ہے۔ میری ماں سے اچھی ماں دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس کے اندر کی محبت اس کے لہجے میں امڈنے لگی۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب تم اپنی ماں کو خوش دیکھنا چاہتی ہو تو ان کے جاگنے سے پہلے فریش ہوکر آجاؤ۔ وہ تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوجائیں گی۔'' عارفہ نے اسے سمجھا بجھا کر گھر بھجوا دیا اور خود ان کے قریب بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔

☆......☆

مہرین ساس کو دلیہ دے کر، دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی تو امی کا فون آ گیا۔ وہ ثمرین کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ اس کے ہیلو کہتے ہی انہوں نے بھڑاس نکالنا شروع کر دی۔

''کیا بتاؤں؟ اتنے سال شادی کو ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک عقل اسے نہیں آئی۔ اب پھر آصف سے جھگڑا کر کے آ گئی ہے۔'' وہ آواز سے خاصی پریشان لگ رہی تھیں۔

''اب کیا ہو گیا ہے۔ اب تو عائزہ اور فائزہ بھی نہیں آتیں۔'' مہرین نے تلخی سے پوچھا۔

یہ سچ تھا کہ ساس کے اس کے ساتھ ملتان آنے کے بعد سے عائزہ اور فائزہ بہت کم ہی میکے جاتی تھیں۔

''اب آصف سے شکایت ہے کہ بہت خاموش رہنے لگے ہیں۔ پہلے کی طرح ہنستے بولتے نہیں۔'' امی بھی کچھ کچھ بےزار لگ رہی تھیں۔

''امی آپ اسے سمجھائیں۔ آصف بھائی کو اتنا پریشان نہ کرے کہ وہ گھر آنا ہی چھوڑ دیں۔'' مہرین نے سچ بولنا ضروری سمجھا کہ مزید دیر نہ ہو جائے۔

''اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اس دفعہ تو علی نے بھی بہت باتیں سنائی ہیں۔ تمہارے باپ بھی بہت غصہ ہو رہے تھے۔ لگتا ہے اسے بھی ضد ہو گئی ہے۔'' امی اب بےحد پریشان ہو رہی تھیں۔

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے، پتا نہیں کیا چاہتی ہے؟''

''بیٹا، تم عارف سے بات کرو کہ آصف سے بات کرے تا کہ وہ اسے آ کر لے جائے۔'' امی جان نے بڑی لجاجت سے کہا تو اسے ان پر رحم آنے کے بجائے غصہ آ گیا۔

''امی، آپ کی ڈھیل نے ہی یہ دن دکھایا ہے۔ شروع شروع میں جب وہ آ کر سسرال والوں کی برائیاں کرتی تھی تو آپ ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ سمجھتی رہی کہ وہ جو کہہ رہی ہے صحیح کہہ رہی ہے جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سارے لوگ اتنے اچھے اور سلجھے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر آصف بھائی تو بہت ہی خیال رکھنے والے اور سمجھدار ہیں۔'' مہرین نے بھی جیٹھ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''میں مانتی ہوں، میری غلطی تھی۔ اب تم بتاؤ، کیا کروں۔ اسے گھر سے تو نہیں نکال سکتی۔''

''میں عارف سے بات کروں گی لیکن مجھے معلوم ہے قصور ثمرین کا ہی ہو گا۔ آصف بھائی کی شرافت ہے کہ وہ اتنے صبر سے اس کی فضول باتوں کو برداشت کرتے ہیں۔'' ثمرین کا بلاوجہ معاملات کو طول دینے کا اندازہ اب مہرین کو بھی تھا۔

''خیر یہ تو نہ کہو، آصف بڑے میٹھے اور گھنے ہیں۔ وہ جس طرح اسے جلاتے ہیں تم نہیں سمجھ سکتیں۔'' امی اب بھی ثمرین کی طرف داری کر رہی تھیں۔

''امی پلیز، ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ ثمرین کو سمجھائیں۔ میں عارف سے کہتی ہوں، وہ آصف بھائی سے بات کریں گے۔'' مہرین نے اسی صلح جو انداز میں امی سے کہا۔

☆......☆

''تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری وجہ سے امی کی کیا حالت ہو گئی ہے لیکن تمہیں کیا؟ تمہیں تو صرف اپنی خوشیوں سے غرض ہے۔'' صبا کو ماں کی بیماری کا پتا چل گیا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس نے گھر فون کیا۔

گھر میں اس وقت وفا تھی۔ وہ ماں کے کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں لینے آئی تھی، اس کی آواز سنتے ہی وہ سلام دعا کے بغیر ہی اس پر برس پڑی۔

''میں نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ اتنا ناراض ہو رہی ہیں، جس سے بات کرو، جسے فون کرو وہ باتیں سنانے بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا اس پر غصہ ہونے لگی۔

''تم نے کچھ نہیں کیا؟ تمہیں شرم نہیں آئی کہ شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر دوسرا نکاح کر لیا۔''

''نکاح ہی تو کیا ہے۔ کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ کیا مجھے یہ حق نہیں تھا؟'' اس نے وفا سے سوال کیا۔

''تم کیسی عورت ہو۔ حد سے زیادہ خود غرض۔ شوہر کے بارے میں نہ سہی لیکن اپنے بچوں کے بارے میں تو سوچ لیتیں۔'' وفا کی آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔

''جہاں زیب مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ مجھے کسی کا خیال نہیں آتا۔'' وہ بےحد خوش تھی۔

''تم نے ایک محبت کی خاطر، ساری محبتیں بھلا دیں۔''

''مجھے کون سی محبتیں ملی تھیں جو بھلاتی، میں نے اپنے گھر میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے اور نفرتیں ہی دیکھی تھیں۔'' صبا نے تلخی سے جواب دیا۔

''یہ تو نہ کہو، ثاقب بھائی تو تم سے بہت محبت کرتے تھے۔''

''خدا کے لیے اس شخص کا نام بھی نہ لیجیے گا۔ جتنی نفرت مجھے اس شخص سے ہے، شاید کسی سے نہ ہو۔''

''خدا کا خوف کرو۔'' وفا اس کے جملے پر کانپ کر رہ گئی۔

''ان باتوں کو چھوڑیں۔ آپ مجھے امی کے بارے میں بتائیں کہ وہ کیسی ہیں؟''

''وہ زندہ ہیں حالانکہ تم نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ زندہ نہ رہیں۔'' وفا نے چبا چبا کر یہ فقرہ ادا کیا۔

''ویسے آپ کو یہ سب کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ بھول گئیں کہ آپ کی وجہ سے بھی گھر میں کتنے دن سوگ رہا تھا اور امی کتنا روئی تھیں اور پاپا کتنے دن بیمار رہے تھے۔'' صبا نے بدلحاظی کی حد کر دی تھی۔

''تو تم نے دیکھ تو لیا تھا کہ میں نے اس غلطی کا کیا خمیازہ بھگتا اور آج تک بھگت رہی ہوں۔ آج تک میں امی کے سامنے نظر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی۔ آج بھی پاپا کی قبر پر جاتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ واپس نہ آؤں اور وہیں کسی قبر میں دفن ہو جاؤں۔'' وہ صبا کا طعنہ سن کر اپنے حواس کھو بیٹھی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''سوری...... مجھے معاف کر دیں۔ بس اتنا بتا دیں امی کیسی ہیں۔'' وہ وفا کے اس طرح رونے پر شرمندہ ہو گئی۔

''امی اب بہتر ہیں لیکن کچھ بول نہیں رہیں۔ چپ چاپ سب کو دیکھتی رہتی ہیں۔'' وفا نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا کر جواب دیا۔

''جہاں زیب کہہ رہا تھا اگر میں امی کو دیکھنے پاکستان جانا چاہوں تو وہ مجھے فوراً بھجوا دے گا۔'' صبا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''صبا پلیز۔ ابھی تم ایسا سوچنا بھی مت، وہ شدید قسم کے شاک میں ہیں اگر تمہیں دیکھ لیا تو کہیں......'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔

دوسری طرف سے صبا کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ایک درخواست ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔
''کہو۔'' وفا نے بھی خود کو سنبھالا۔
''ہو سکے تو مجھے امی کی خیریت کی اطلاع دیتی رہا کرنا اور جب امی ٹھیک ہو جائیں تو انہیں بتا دینا کہ میں بہت خوش ہوں۔ جہاں زیب بہت اچھا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔'' صبا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور وفا فون رکھ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔
'کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کسی کو سب کچھ مل جاتا ہے اور کوئی خالی ہاتھ رہ جاتا ہے، وہ خالی گھر اور خالی کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ 'کیا میں ہمیشہ خالی ہاتھ رہوں گی؟'

☆......☆

وفا نے چکن کارن سوپ ٹفن کے ایک ڈبے میں ڈالا اور دوسرے ڈبے میں دلیے کی کھچڑی رکھی۔ چھوٹی سے کٹوری میں پودینے اور املی کی چٹنی رکھی، اسپتال کا کھانا کھا کھا کر مسز صابر اکتا گئی تھیں۔ بلکہ رات کو انہوں نے دو نوالے بھی بڑی مشکل سے کھائے تھے۔ اب ان کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اچھی خاصی بات چیت بھی کرنے لگی تھیں۔
''امی، میں صبح آپ کے لیے دلیے کی کھچڑی اور چکن کارن سوپ بنا کر لاؤں گی۔'' اس نے ان کے کھانا نہ کھانے پر ان سے وعدہ کیا تھا۔
''تم تو صبح سے شام تک اسپتال میں رہتی ہو۔ حیا سے کہنا وہ بنا کر لے آئے گی۔'' انہوں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔
''لگتا ہے، آپ کو میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں۔ جب ہی آپ بہانہ کر رہی ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔
''تم تو سب سے زیادہ مزے کا کھانا پکاتی ہو۔ ویسے صبا بھی......'' وہ صبا کا نام لیتے لیتے چپ ہو گئیں۔
''حیا آئے گی تو اسے بتاؤں گی کہ امی کہہ رہی تھیں کہ حیا کو کھانا پکانا نہیں آتا۔'' اس نے صبا کی طرف سے ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔
''ثاقب کا فون آئے تو پوچھنا ہادی اور مہدی کیسے ہیں؟'' انہوں نے بڑے نارمل انداز میں دونوں بچوں کا ذکر کیا۔
''آپ کی بیماری کے دوران ثاقب بھائی نے کئی دفعہ فون کیا تھا۔ وہ بچوں کو لے کر غالباً پاکستان آنے والے ہیں۔'' وفا نے بتایا اسے ماں کو اس طرح باتیں کرتا دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔
صبح ہوتے ہی وہ گھر آ گئی۔ گھر کی جلدی جلدی صفائی کی اور پھر کھانا لے کر اسپتال روانہ ہو گئی۔ اسپتال پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی عارفہ، علی اور ماموں جان امی کو دیکھنے آ گئے تھے۔
''آج تو آپ بڑی فریش لگ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ کو جلد ہی اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔'' عارفہ بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''آنٹی بس اب جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ ہمارا سارا اسکول آپ کے بغیر اداس ہے۔'' علی نے ان کی دل جوئی کرنے کے خیال سے کہا۔
''ابھی کسی نئے بچے کا ایڈمیشن ہوا ہے؟'' انہوں نے بڑی آس سے پوچھا۔

''ہاں اس دفعہ تو خاصے ایڈمیشن ہوئے ہیں۔ اب تو آپ کا کام اور بڑھ جائے گا۔''
''تم نے سارے بچوں کا انٹرویو تو لیا ہوگا۔'' علی کا دل دکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا، وہ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔
''اچھا یہ بتایئے، آپ کی اس فریش نیس کا راز کیا ہے؟'' اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔
''میری بیٹی کی خدمت۔'' انہوں نے محبت سے وفا کی طرف دیکھ کر کہا۔
''واقعی اس بچی نے بڑی خدمت کی ہے۔'' ماموں جان کا لہجہ شفقت سے بھرپور تھا۔
''اس میں تو کوئی شک نہیں۔ اگر وفا اس طرح ماں کی خدمت نہ کرتی تو مسز صابر اتنے جلدی صحت یاب نہیں ہو سکتی تھیں۔'' عارفہ نے بھی ماموں جان کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''لوگ اسی لیے تو بیٹیوں کی تمنا کرتے ہیں کہ بیٹیاں ہی ماں باپ کو سکھ پہنچاتی ہیں۔'' ماموں جان کے اس جملے پر وفا کے چہرے پر ملال کا سایہ لہرا گیا۔
''ویسے پاپا یہ زیادتی ہے۔''
''کیوں بھئی؟''
''صرف بیٹیاں ہی نہیں، بیٹے بھی ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں اگر خود نہیں کر سکتے تو شادیاں کرتے ہیں تاکہ ان کی بیویاں ان کے ماں باپ کی خوب خدمتیں کریں۔'' علی نے باپ کی طرف دیکھ کر شرارت سے کہا۔
''اور پھر وہ ایسی خدمت کرتی ہیں کہ ماں باپ بستر سے اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ ان کو قبر تک پہنچا کر دم لیتی ہیں۔'' ماموں نے فوراً ٹکڑا لگایا۔
''ویسے پاپا آپ مانیں نہ مانیں لیکن میں آپ کی کتنی خدمت کرتا ہوں۔ آپ کے پاؤں دباتا ہوں، آپ کے سر کی مالش کرتا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ آپ کے سر پر مالش......کرنا......'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔
''ہاں میں جانتا ہوں چاند جیسی چندیا پر تیل جذب کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، جب ہی تم نے آج تک یہ مشکل کام کیا ہی نہیں۔'' ماموں جان نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو علی نے کھل کر قہقہہ لگایا۔
ان لوگوں کی نوک جھونک سے سارا ماحول مسکرا اٹھا تھا۔ وفا بھی دھیمے سے مسکرانے لگی۔
''اف خدایا، اس لڑکی کی مسکراہٹ کتنی دلکش ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس کی مسکراہٹ کے لیے تشبیہہ سوچنے لگا۔
'خیر کوئی بات نہیں، راستے میں عارفہ سے پوچھ لوں گا۔ عارفہ کو تو آرٹ بڑی دلچسپی ہے۔ ایک تو یہ عارفہ بھی بڑی جادوگرنی ہے ابھی سے میرے دل و دماغ کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ پتا نہیں، میرا کیا حشر ہوگا۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔''

☆......☆

مسز صابر کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اسپتال کا بل جمع کرانے کے لیے کچھ مزید پیسوں کی ضرورت تھی اس وقت تک بینک بند ہو چکے تھے۔ وفا کو یاد آیا، گھر میں کچھ پیسے رکھے ہیں، وہ گھر آ گئی جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو گھر کا سناٹا دیکھ کر اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہنے لگا۔ وہ پیسے لے کر گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ کال بیل بجی، اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کے پارلر کی اونر میڈم ماہین اور مسز طارق کھڑی تھیں۔

"مجھے ماہین نے بتایا کہ تمہاری والدہ کی طبیعت خراب ہے۔" مسز طارق نے رسمی سلام دعا کے بعد مسز صابر کی خیریت دریافت کی۔

"اب تو امی خاصی بہتر ہیں۔ آج انہیں ڈسچارج کر دیا گیا ہے لیکن وہ اب بہت خاموش ہو گئی ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ انسان کو کوئی شدید صدمہ پہنچے تو وہ کچھ عرصے کے لیے اسی طرح گم سم ہو جاتا ہے۔" مسز طارق نے اسے سمجھایا۔

"میری امی تو بہت مضبوط اور صبر و تحمل والی ہیں۔ وہ تو جب سے میرا بھائی گھر سے چلا گیا ہے۔ جب سے ایسی ہو گئی ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہیں۔ ورنہ تو....." وفا کی بات کرتے کرتے آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"واقعی یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے وہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی میر کی تصویر کو بغور دیکھنے لگیں۔

"یہ اسی کی تصویر ہے۔ جب وہ گھر سے گیا تھا اس سے چھ ماہ پہلے امی ابا نے اس کی سالگرہ منائی تھی، دیکھیں کتنا پیارا لگ رہا ہے۔" وفا نے تصویر اتار کر مسز طارق کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا بھائی بہت پیارا ہے، خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔" انہوں نے بھیگے بھیگے لہجے میں دعا دی تو وفا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

"اچھا بیٹا! اب ہم چلتے ہیں، انشاء اللہ! جب تمہاری امی گھر آئیں گی تو ہم تمہاری امی سے ضرور ملنے آئیں گے۔" مسز طارق نے جاتے جاتے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

انہیں نہ جانے کیوں اس سے اتنی محبت اور اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اسے کیوں اتنی دیکھی دیکھی سے لگتی تھی۔ آج انہیں سمجھ میں آیا تھا۔ آج اس کے گھر میں آ کر ان پر ایک بہت اہم راز کا انکشاف ہوا تھا۔ ان کا دل بے شمار اندیشوں سے لرز رہا تھا۔ دل میں نہ جانے کہیں یہ پھانس سی چبھ رہی تھی۔ کاش وہ اس سے نہ ملی ہوتیں اور ملی تھیں تو اس کے گھر نہ آئی ہوتیں۔" اور کیسا عجیب اتفاق تھا کہ انہیں مسز صابر کو دیکھنے اسپتال جانا تھا لیکن جب میڈم ماہین نے وارڈ نمبر پوچھنے کے لیے فون کیا تو پتا چلا کہ انہیں ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔

☆.....☆

"یہ کس کی تصویر ہے؟" عارفہ نے لاؤنج میں دیوار پر لگی صبا اور ثاقب کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مسز صابر کے گھر شفٹ ہونے کے بعد، وہ ان کی عیادت کے لیے پہلی دفعہ ان کے گھر آئی تھی۔

"یہ میری چھوٹی بہن اور اس کے شوہر ہیں۔"

"یہ لوگ میرا مطلب ہے..... کہ....." وہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی اور کہہ نہیں پا رہی تھی۔

"یہ لوگ کینیڈا میں رہتے ہیں....." وفا نے اس کی بات کو مکمل کیا۔

"کینیڈا میں کس جگہ، وہاں ہمارے بھی کافی رشتے دار ہیں؟" اسے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ اب شاید اسے ثاقب کا پتا مل جائے۔

"ٹورنٹو میں....." وفا نے جواب دیا۔

"تم مجھے ان کا Contact No دے سکتی ہو، اصل میں چند ماہ پہلے میری بہن دبئی سے وہاں شفٹ ہوئی ہے، وہاں اس کی زیادہ جان پہچان نہیں، وہ بہت بور ہو رہی ہے اگر ان لوگوں سے رابطہ ہو جائے....." عارفہ نے

ثاقب کا نمبر حاصل کرنے کے لیے بات بنائی۔

"وہ..... اصل میں بات یہ ہے کہ....." وفا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"کیا تمہاری بہن کی لو میرج (Love Marriage) تھی۔" وفا کے ہچکچانے پر اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

"نہیں..... نہیں..... شادی تو ہم لوگوں نے ہی کی تھی لیکن....." وہ پھر اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

"لیکن کیا؟" عارفہ کو تجسس پیدا ہوا۔

"اس نے وہاں جا کر اپنے شوہر سے طلاق لے لی اور..... دوسری شادی..... کر لی۔" وفا نے دل کڑا کر کے، وہ سچائی بیان کر دی۔ جسے بیان کرنے کے لیے اسے ناقابل بیان اذیت سے گزرنا پڑا۔

"اوہ!!" عارفہ نے گہری سانس لی۔

"آپ امی کے سامنے یہ ذکر نہ کیجیے گا، ان کی طبیعت کی خرابی کی یہی وجہ ہے۔ وہ تو اب اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتیں۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس کا شوہر اچھا نہیں تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ثاقب بھائی تو بہت اچھے انسان ہیں، انہوں نے اسے شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا آئی کہ اتنے اچھے شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی۔" وفا کو یہ سب بتاتے ہوئے کوفت ہو رہی تھی۔

"تو تم لوگوں کا اب اس کے شوہر سے کوئی رابطہ نہیں رہا.....؟" عارفہ کو مایوسی ہوئی۔

"ہاں سامنے کوئی رابطہ نہیں لیکن ثاقب بھائی کا تو فون آتا ہے بلکہ جب امی اسپتال میں تھیں، تب بھی ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے، انہوں نے فون کیا تھا۔ وہ بہت شریف انسان ہیں۔"

"کیا تم مجھے ان کا نمبر دے سکتی ہو تا کہ میں اپنی بہن کو دے دوں۔" عارفہ نے بالآخر اس سے ثاقب کا نمبر مانگ ہی لیا۔

"ہاں..... ہاں..... ضرور.....!!" وفا نے فوراً ہی اسے ثاقب کا نمبر لکھوا دیا، جسے اس نے اپنے سیل فون پر محفوظ کر لیا۔

وہ تھوڑی دیر مسز صابر کے پاس بیٹھی، ان کا ہاتھ تھام کر ان کو آنے والے خوب صورت دنوں کی امید دلاتی رہی۔

"آپ مایوس نہ ہوں، مایوسی کفر ہے۔ خدا کی رحمت پر بھروسہ کیجیے۔ انسان نہیں جانتا، اگلا لمحہ کون سی خوشی کو اپنے کاندھوں پر سوار کر کے آپ کے گھر پر دستک دینے کے لیے آ رہا ہے۔" وہ بہت خوش تھی اور چاہ رہی تھی سب کے دکھوں کو دور کر کے خوشیوں کی نوید سنا دے۔

مسز صابر کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ وہ ایمان کو چھوڑ کر آئی تھی اور تھوڑی دیر پہلے ہی حمیدہ خالہ کا فون آیا تھا کہ وہ اسے یاد کر رہی ہے۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مین روڈ پر آ گئی۔

"اگر ثاقب سے رابطہ ہو جائے اور وہ اسے طلاق دے دے تو..... تو..... آگے..... کے سارے راستے

آسان ہو جائیں گے۔"

اسے یہ سوچ کر ہی بے حد خوشی اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ علی کی بے غرض اور بے لوث محبت نے بالآخر اس کے دل کو اس کی محبت سے روشن کر ہی دیا تھا اور پھر اب تو ماموں جان بھی علی کے ہم نوا ہو گئے تھے۔ ممانی جان کی مزاحمت بھی کسی حد تک دم توڑ چکی تھی۔

☆......☆

انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ شام تھی یا رات کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور اب تو انہیں ہر طرف تاریکی ہاتھ پھیلائے، اپنے سامنے بڑھتی ہوئی نظر آتی۔ بیماری کی وجہ سے وہ اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ انہیں بستر سے اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وفا نے ایک کل وقتی دس بارہ سال کی بچی کو ملازم رکھ لیا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں ان کا خیال رکھتی۔

"اسما!!" انہوں نے بچی کو پکارنے کی کوشش کی لیکن ان کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ان کا دم گھٹنے لگا، انہیں سینے پر بہت زیادہ بوجھ محسوس ہونے لگا۔ شاید ان کا آخری وقت قریب آ گیا تھا۔ وہ بولنا چاہ رہی تھیں لیکن بول نہیں سکتی تھیں۔ اٹھنا چاہ رہی تھیں لیکن اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں جیسے شل ہو گئے تھے۔ وہ جیسے تاریکی کے سمندر میں گرتی جا رہی تھیں کہ ایکدم سے جیسے تاریکی کے سارے پردے ہٹ گئے، انہیں عمیر کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"امی! امی!" وہ ان کے قریب سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"عمیر......ر......" وہ اس کا پورا نام بھی نہ لے سکیں۔

"امی، عمیر آ گیا ہے!!" انہیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی وفا کی آواز سنائی دی۔

"امی! امی!" عمیر رو رہا تھا۔ وہ اس کے آنسو اپنے ہاتھوں پر گرتے محسوس کر رہی تھیں۔

"امی آنکھیں کھولیں...... عمیر آ گیا ہے۔" وفا کی آواز پھر سنائی دی۔

"جھوٹ نہیں بولو۔ عمیر نہیں آ سکتا۔ عمیر...... نہیں...... آ سکتا...... میں اس دنیا میں اس سے نہیں مل سکتی.. میں جا رہی ہوں...... میں اب وہاں اس سے ملوں گی۔"

"امی آنکھیں کھولیں، عمیر واپس آ گیا ہے۔" وفا نے انہیں جھنجھوڑ کر کہا۔

"یہ...... عمیر...... تو...... نہیں ہے۔" انہوں نے آنکھیں کھول کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ایک بے حد خوب صورت سجیلا نوجوان ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"بخدا یہ آپ کا بیٹا ہے۔ اللہ نے اسے ہمارے گھر بھیج دیا تھا۔" بریگیڈیئر طارق اور ان کی مسز ان کے قریب رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مسز طارق ان کا ہاتھ تھام کر دھیرے دھیرے کہنے لگیں۔

"عمیر، آپ کے پاس تھا تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میرے بیٹے کو آپ نے اپنے پاس کیوں رکھ لیا تھا؟" وہ ہوش و حواس کی دنیا میں آئیں تو ان کا پورا وجود آنسو بن گیا۔

"بہن! آپ اپنے بیٹے سے مل لیں۔ یہ ساری باتیں بعد میں ہوں گی۔" بریگیڈیئر طارق نے انہیں حوصلہ دیا۔

"امی آپ پہلے یہ دودھ پی لیجیے۔ پھر آرام سے عمیر سے مل لیجیے گا۔"

وفا دودھ میں اوولٹین ڈال کر لے آئی۔ وہ ان کا دھیان بٹانا چاہ رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ وہ ایکدم جذباتی ہو کر کسی شاک کا شکار نہ ہو جائیں۔

"کیا یہ واقعی عمیر ہے۔" انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"امی یہ عمیر ہے۔ آپ اسے نہیں پہچانیں۔ امی اس کی آنکھ کے قریب چوٹ کا نشان ابھی بھی ہے۔ جب بچپن میں ایک بچے نے اسے پتھر مارا تھا۔ آپ کو یاد نہیں، اس کا کتنا خون بہا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا شکر کریں آپ کے بچے کی آنکھ بچ گئی۔"

وفا کے کہنے پر انہوں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر جیسے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگیں۔

"عمیر!...... عمیر!...... میرے لعل......! میری جان...... میرے چاند، تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو باپ سے ناراض ہو گیا تھا۔ تجھے نہیں معلوم تھا، تیری ماں تیرے بغیر مر جائے گی۔ تو نے مجھے مار ڈالا۔ تو نہیں جانتا کہ میں تیرے بغیر کیسے مرتی رہی ہوں۔" انہیں یقین آیا تو وہ بے تابی سے اس سے لپٹ گئیں۔ وہ بار بار اسے چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ بار بار اسے چوم رہی تھیں اور چند لمحوں بعد، جیسے وہ نیم بے ہوش ہو گئیں۔

"امی...... پلیز...... اس طرح نہ کریں......" وفا گھبرا گئی۔

"امی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" عمیر ایکدم رونے لگا۔

"بیٹا گھبراؤ نہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوا۔ انہیں تھوڑی دیر سکون سے لیٹا رہنے دو۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" بریگیڈیئر طارق نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔

"بابا امی ٹھیک ہیں نا؟" عمیر ان کے کاندھے سے لگ کر سسک اٹھا۔

"ہم لوگ دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ بیٹا آپ انہیں نیند کی دوا دے دیں۔" بریگیڈیئر طارق، عمیر کا ہاتھ تھام کر کمرے سے نکلنے لگے تو انہوں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں۔

"عمیر میرے پاس بیٹھے رہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تو میں زندہ ہوئی ہوں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو، اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جانا۔" وہ پھر رونے لگیں۔

"امی حوصلہ کریں۔ میں آپ کے پاس ہوں۔ اب میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گا۔ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" عمیر ان کا ہاتھ تھامے انہیں یقین دلا رہا تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا، کب مسز طارق کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ایسا تو ہونا ہی تھا اور اسی لمحے سے بچنے کے لیے تو فیصلہ کرتے کرتے انہیں اتنے دن گزر گئے۔ وہ وہیں لان میں بینچ پر بیٹھ گئیں اور سامنے لگی ہوئی عمیر کی تصویر کو بغور دیکھنے لگیں۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ اس پل صراط سے گزرنا آسان نہیں ہوگا۔" بریگیڈیئر طارق کی آواز قریب ہی سنائی دی۔

انہوں نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لیے اور بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "میں بہت خوش ہوں اور میں نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے، میرا یہ فیصلہ میری زندگی کی ساری غلطیوں کا کفارہ ہوگا۔"

☆......☆

اس منی ناول کی آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ پڑھیے۔

رنگِ فسانہ

کاشی چوہان

نمبر تین سو تیرہ

اِس مسئلے سے دادی بہت پریشان تھیں۔ یہ فیصلہ دادی کے لیے بھی سوہانِ روح بن گیا تھا۔ اُن کی پوتیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ دادی کے دن کا چین اور رات کی نیند سب حرام ہو چکا تھا۔

قسمت سے جڑے اعداد اور زندگی سے الجھی ایک خاص تحریر، افسانے کی صورت

شرجیل ڈرائیو کرتے ہوئے شہر سے باہر کافی دور تک آ گیا تھا۔ تیز دھوپ میں سپر ہائی وے چوٹ کھائی ہوئی سیاہ ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔ شرجیل کی بے چین نظریں سڑک کی دائیں جانب مرکوز تھیں۔ آخر اسے وہ سنگِ میل نظر آ ہی گیا جس کے ساتھ اسے اپنی کار کچے میں اتارنی تھی۔ وہ یہاں شاکری درویش کی تلاش میں آیا تھا۔ سڑک سے کچے میں کار اتارتے ہوئے وہ ایک لمحے کو گھبرایا۔ دور دور تک سنگلاخ چٹانیں، کیکر اور ویران ویران سے کیکٹس پھیلے ہوئے، یقیناً ناہموار رستے پر نوکیلے پتھروں کے علاوہ کانٹے بھی بکھرے ہوئے ہوں گے۔ ٹائر کسی بھی وقت پنکچر ہو سکتا تھا۔ یہاں تو دور دور تک کسی آدم آزاد کی خوشبو تک نہ تھی لیکن اسے ہر حال میں شاکری درویش سے ملنا تھا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ شہر سے پندرہ کلومیٹر باہر سنگِ میل کے ساتھ دائیں طرف کچے میں چلتے چلے جاؤ، شاکری درویش کہیں نہ کہیں خود ہی آ ملے گا۔ اگر شاکری درویش نہ ملے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ وہ کام نہیں ہو سکتا جس کے لیے شاکری درویش سے ملنے والا جا رہا تھا۔ مناسب یہی ہے آدمی شام ڈھلنے سے پہلے پہلے ہی سپر ہائی وے پر واپس لوٹ آئے۔ شرجیل نے ایک لمحے کو آنکھیں موندیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک چاند سا چہرہ لمحے بھر کو کوند گیا۔ پھر تو گویا اس نے تمام نصیحتیں فراموش کر دیں اور کار کچے میں اتار دی۔ اسے یقین تھا شاکری درویش اسے ضرور ملے گا اور وہ ضرور من کی مراد پا لے گا۔

شرجیل کو بڑا عجیب مسئلہ درپیش تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ شکل و صورت سے انتہائی وجیہہ اور دل بھی ایسا حساس جیسے پانی سے بنا ہوا ہو۔ مسئلہ شرجیل کی شادی کا تھا۔ شرجیل کے دو چچا ایک تایا اور تین پھوپیاں تھیں۔ شرجیل کی خوش قسمتی کہہ لیں یا اس کی بد قسمتی کہ اس کے ددھیال کے ہر گھر میں ایک عدد خوب صورت، خوش اطوار لڑکی موجود تھی۔ اس پر ستم یہ کہ ہر لڑکی شرجیل سے محبت کا دعویٰ رکھتی تھی۔ چھوٹے چچا کی نکہت بستر پر پڑ گئی تھی کہ شرجیل سے شادی نہ ہوئی

تو زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ نکہت ایم فل کر رہی تھی۔ میٹرک تک شرجیل کے ساتھ ایک ہی اسکول، ایک ہی کلاس میں پڑھ چکی تھی۔ اس نے بچپن ہی سے شرجیل کو من کا دیوتا مان لیا تھا۔ دوسری عینی تھی، بڑے چچا کی عینی، عینی نے ایم بی بی ایس کر لیا تھا۔ کچھ تو وہ بہت خوب صورت تھی اور اس پر طرہ یہ کہ بلا کی خوش لباس بھی تھی۔ ہر دوسرے دن عینی کے لیے رشتہ آ موجود ہوتا مگر یہ محترمہ بھی شرجیل کی شربتی آنکھوں اور خوبصورت انداز پر مرمٹی تھیں۔ صاف کہہ دیا تھا کہ شادی شرجیل سے نہ ہوئی تو کسی سے نہیں ہو گی۔ ڈاکٹری مصروفیات ''زندگی گزارنے کے لیے کافی ہیں۔

تایا ابو کی لختِ جگر شارقہ تھی۔ شہد اور دودھ میں گندھی رنگت، غزالی آنکھیں، خم دار گھنیری پلکیں،

محرابی پیشانی، ستواں ناک، گلاب سے عارض، دھڑکتی ہوئی سیاہ زلفیں کوئی نگاہِ غلط جو ایک بار پڑ جائے تو گویا پتھر کی ہو جائے۔ شارقہ چلتا پھرتا شہر طلسمات تھی۔ جہاں سے گزرتی لوگ پتھر کے ہو جاتے تھے۔ گویا وہ شہر کے ہر دیدہ ور کو مطلوب تھی لیکن اسے شرجیل مطلوب تھا۔ وہ اپنے تئیں خود کو شرجیل کا بلا شرکتِ غیرے مالک سمجھتی آئی تھی۔ اس نے کسی کو اپنا حریف سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس کا خیال تو اتنا ہی تھا کہ شرجیل اسے پانے کے لیے خوب ہاتھ پاؤں مارے گا اور وہ شروع شروع شرجیل کو کچھ ناز و نخرے دکھائے گی اور پھر مان جائے گی مگر یہاں تو بازی ہی پلٹ گئی تھی۔ شرجیل چار بھائیوں اور تین بہنوں کے اس خاندان میں اکلوتی نرینہ اولاد تھی۔ سب کی دو دو یا تین تین بیٹیاں تھیں۔ قسمت نے قرعہء فال احمد شیخ کے نام کھول دیا اور انہیں شرجیل کی صورت اولادِ نرینہ سے نوازا۔

اس مسئلے سے دادی بھی بہت پریشان تھیں۔ احمد شیخ نے شرجیل انہیں سونپ کر کہہ دیا تھا کہ جس بہن یا بھائی کی بیٹی سے رشتہ جوڑ دیں گی انہیں منظور ہے۔ ماں تھیں، ہر بچہ ایک سا تھا۔ کسی ایک کو بھی رد کرنے کی ہمت نہ تھی مگر شرجیل تو ان کی جان تھا بلائیں لیتی نہ تھکتیں۔ ایک سو گیارہ روپے روزانہ شرجیل پر وارتیں اور صدقہ کرتیں۔ ان کے گلشن میں پھول تو بہت تھے مگر یہ اکلوتا چراغ تھا۔ یہ فیصلہ دادی کے لیے بھی سوہانِ روح بن گیا تھا۔ کرتیں تو کیا کرتیں۔ ان کی پوتیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ دادی کا دن کا چین اور رات کی نیند سب حرام ہو چکا تھا۔

سمیرا بڑی پھوپو کی بیٹی تھی۔ دلکش نقوش اور بھرے بھرے وجود کی مالک سمیرا کی سب سے بڑی خوبی اس کی ذہانت تھی۔ یہی ذہانت اس کے ملیح چہرے پر خوب سجتی سنورتی بلکہ بہت سوں کو قتل کرو دیتی۔ سمیرا کی آنکھوں میں کچھ سفاکی، کچھ سوگواری سے بسیرا کیے ہوئے تھے۔ ممکن نہیں تھا کہ یہ آنکھیں کسی کو دیکھیں اور گھائل نہ کر جائیں ان لبوں سے کوئی بات نکلے اور مخاطب کو متاثر نہ کر جائے مگر شرجیل بہت مشکل ثابت ہوا تھا۔ شرجیل اس کا مطلوب و محبوب تھا تو رقابت میں بھی اس کے ساتھ، اس کی عزیز ترین بہنیں اور بہت پیاری سہیلیاں کھڑی تھیں۔ وہ کیا کرتی اور کیا نہ کرتی بس اتنا جانتی تھی کہ شرجیل نہ ملا تو مر جائے گی۔

منجھلی پھوپو کی بیٹی ندا تھی۔ بہت شوخ و چنچل، چٹ پٹی، دھان پان سی ندا۔ بولتی تو ماحول چہکنے لگتا۔ ایسی شوخ کہ گلشن کا کاروبار بلبل و کوئل سے نہیں اسی سے چلتا ہو۔ یہ بھی اسیرِ شرجیل تھی۔ ندا ہر وقت مسکراتی اور دوسروں کو مسکرانے پر مجبور کرتی، ایسا بے ساختہ قہقہہ لگاتی کہ فضا میں جلترنگ بج اٹھتے۔ عارض پر پڑنے والے گڑھے شوخی حسن کو دو آتشہ کر دیتے۔ موتیوں جیسے دانت نمایاں ہوتے تو نظروں کو خیرہ کر دیتے۔ یہ بھی شرجیل کا بن باس لیے بیٹھی تھی۔ چھوٹی پھوپو کی بیٹی طاہرہ تھی۔ طاہرہ بھی اسی خاندان کا پھول تھی جس خاندان میں خدا نے حسن تو بڑی فیاضی سے بخشا تھا۔ وہ بھی اپنی کزنز سے کسی طور کم نہیں تھی۔ طاہرہ بہت نرم دل کی مالک تھی۔ بات بے بات آنکھیں بھر آتی تھیں۔ دنیا جہان کا دکھ ننھی سی جان میں سمائے پھرتی۔ مختلف سماجی اداروں میں بطور رضا کار دوڑتی پھرتی۔ پاکٹ منی میں جو کچھ ملتا انہی کاموں کی نذر کر دیتی۔ وہ کسی کو دکھ نہیں دے سکتی تھی مگر بات شرجیل کی تھی۔ شرجیل جسے وہ بچپن سے اپنے خوابوں میں سجائے ہوئے، بسائے ہوئے تھی اس شرجیل کو چھیننے اس کی عزیز ترین بہنیں آ گئی تھیں۔ وہ تو ہمیشہ سے دوسروں کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑتی آئی تھی مگر شرجیل تھا ہی ایسا کہ اس سے چھوڑا نہیں جا رہا تھا۔

شرجیل اس ساری صورتِ حال سے بہت پریشان تھا۔ اس کی اپنی کزنز سے بہت اچھی دوستی، بلا کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ان کے گھروں کا ماحول تہذیب کا پروردہ تھا۔ یہاں لڑکیوں کو اظہارِ رائے کی مکمل اور بھرپور آزادی تھی۔ شرجیل آج تک اس بات سے بے خبر رہا تھا کہ وہ اپنی کزنز کا محبوب ہے۔ یہ انکشاف تو اس وقت ہوا جب اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔ ہر گھر اسے اپنی دامادی میں لینا چاہتا تھا۔ اس ماحول میں پُرلطف بات یہ تھی کہ سب ایک دوسرے کے حریف بھی تھے مگر ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والے بھی تھے۔ وہ شرجیل کو اپنا حق سمجھ کر دوسرے کے لیے چھوڑنے پر تیار بھی نہیں تھے تو ایک دوسرے کے مقابل آنے پر از حد پریشان بھی تھے۔

دادی نے آخر حل نکالا اور شرجیل پر سارا بوجھ ڈال دیا۔ شرجیل چپکے سے اپنی من پسند لڑکی کا نام لے دے، وہی شرجیل سے بیاہ دی جائے گی لیکن دادی نے یہ انتباہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا کہ شادی بہر حال ان چھ لڑکیوں ہی میں سے کسی ایک سے کرنی ہو گی، ان سے باہر تو تصور بھی ناممکن ہے۔

شرجیل اس مسئلے کے حل کے لیے شاکری درویش کے پاس آیا تھا۔ نوکیلے پتھروں پر اس کی کار سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ وہ سڑک سے کوئی دس کلومیٹر کچے میں آ چکا تھا۔ شاکری درویش تو کیا اسے اب تک چڑیا کا بچہ بھی نہیں ملا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر شرجیل کو ہولائے دے رہا تھا۔ کوئی کانٹا ٹائر میں گھس گیا اور کار ٹھس کی آواز کے ساتھ دائیں جانب بیٹھتی چلی گئی۔ وہ احتیاطاً دو فاضل ٹائر ساتھ لیتا آیا تھا۔ سخت گرمی میں ایئر کنڈیشنڈ کار سے نکلنا عذاب ہی تو تھا مگر نکلنا مجبوری تھی۔

آخر کار اس نے ٹائر تبدیل کر ہی لیا۔ پسینے میں شرابور ہانپتا ہوا شرجیل کہیں سے ناز و نعم کا پلا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ کوئی ہاتھ مضبوطی سے اس کی پشت پر جم گیا۔ شرجیل کی ہڈیوں کا گودا تک سنسنا گیا۔

''جا بچہ تیرا کام ہو گیا۔ تین سو تیرہ کو پکڑ لے۔ تین سو تیرہ۔ یہی تیری زندگی ہے۔ ساری کائنات تین سو تیرہ میں چھپی ہے۔ جا بچہ نکل جا تین سو تیرہ کو پکڑ لے۔''

''اوہ یہ...... یہ تو شاکری درویش ہی ہو سکتا ہے۔'' شرجیل تیزی سے مڑا مگر اس دوران وہ ملنگ ناچتا ہوا بہت دور جا چکا تھا۔ وہ تین سو تیرہ کی گردان لگائے جا رہا تھا۔ ''تین سو تیرہ، تین سو تیرہ، تین سو تیرا۔''

شرجیل نے ان کے پیچھے جانا چاہا مگر وہ بہت تیزی سے سیاہ نکتے میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ گویا اڑتے ہوئے جا رہے ہوں۔

شرجیل انتہائی مایوسی کی حالت میں وہاں سے لوٹا۔

☆......☆

تین سو تیرہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے دادی کو بتایا تو دادی جھٹ بولیں۔ ''بیٹا بڑا ہی مبارک عدد ہے تین سو تیرہ۔''

''مگر دادی میرے لیے کیسے مبارک ہے؟'' شرجیل جھنجھلا گیا تھا۔

''بیٹا صبر کرو اور غور کرو۔ بابا نے کیا کہنا چاہا ہے۔'' دادی نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''دادی میں غور کر کر کے تھک گیا ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔''

''اے بیٹا! بچیوں کے ناموں کے عدد نکلواؤ۔ کیا خبر کسی کا عدد تین سو تیرہ ہو۔''

''ارے ہاں دادی ماں یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔''

''بس بیٹا۔ ذرا سا جواز مجھے دے دو، میں کسی ایک کو لے آؤں اور دوسرے بچوں کو بہلا سکوں۔''

''دادی ماں میرا ایک دوست ماہر نجوم ہے اس سے پوچھتا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا وہ چہرے پر مسرت لیے وہاں سے چلا گیا۔

☆.....☆

''نہیں دادی کسی کے نام کا عدد تین سو تیرہ نہیں''

''میں نے سب سے کہہ دیا ہے جو شاکری درویش فیصلہ کریں گے، وہ سب کو قبول کرنا ہوگا۔''

''دادی کوئی ناراض نہ ہو جائے۔''

''ارے میرے چاند۔ سب مان گئے ہیں، بچیاں بھی مان گئی ہیں جو فیصلہ آئے گا، اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر مان لیں گی۔ کوئی بھی آپس کی ناراضگی نہیں چاہتا۔''

اس دوران شرجیل کا موبائل فون بج اٹھا۔ عینی کا فون تھا۔ شرجیل اس سے بات کر کے ہٹا ہی تھا کہ شارقہ کی کال آ گئی۔ پھر تو پے در پے ساری کزنز کی کالز آنی شروع ہو گئی۔ سب ہی اسے پانے کے لیے بے قرار تھیں۔ شرجیل ہوں ہاں، ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔ سمیرا نے فون بند کیا تو شرجیل موبائل آف کرنے لگا۔ دفعتاً طاہرہ کی کال آ گئی۔

''کیسی ہو طاہرہ؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور سناؤ۔''

''شرجیل میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔ سب کچھ کہنا ہے۔''

''تو کہہ دو سب کچھ۔''

''شرجیل تمہیں پانے کی آرزو بچپن سے میں نے پالی ہے مگر.....''

''مگر؟''

''مگر مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں خود غرض ہو رہی ہوں۔ اپنی خوشی کے لیے تمہیں، دادی کو، مما پاپا کو، سارے خاندان کو پریشان کر رہی ہوں۔ شرجیل اٹ از ویری بیڈ۔''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''شرجیل میں اپنی بہنوں کے حق میں تمہارے مطالبے سے دستبردار ہو رہی ہوں۔ میں نے سب کچھ کہہ دیا ہے شرجیل۔''

''ہوں۔''

شرجیل نے ہوں کیا ہی تھا کہ دوسری جانب طاہرہ کی زوردار ہچکیاں ابھریں اور فون بند ہو گیا۔

شرجیل کا دل تو گویا مٹھی میں آ گیا۔ سینے میں شدید درد سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ شرجیل کا دل چاہا کہ موبائل کو دیوار پہ کھینچ مارے۔

''طاہرہ ان سب سے مختلف ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین دیکھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے طاہرہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

''مجھے طاہرہ کو کال کرنی چاہیے۔ وہ رو رہی ہو گی۔ ایک دوست کی حیثیت سے اسے تسلی دینی چاہیے۔''

شرجیل نے طاہرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک دم سے بجلی کوند گئی۔ شاکری درویش کا جملہ ''تین سو تیرہ'' کو پکڑ لے گونج گیا۔

''ارے ارے یہ تین سو تیرہ تو طاہرہ ہی ہے۔''

شرجیل نے تمام کزنز کے موبائل فون نمبرز چیک کرنے شروع کر دیے۔ کسی کا کوڈ نمبر ''تین سو تیرہ'' نہیں تھا سوائے طاہرہ کے۔

طاہرہ کا کوڈ نمبر ''تین سو تیرہ'' ہی تھا۔ یہ ایک مشہور موبائل کمپنی کا کوڈ نمبر تھا۔

شرجیل دفعتاً خوشی سے ناچتا ہوا اٹھا اور دادی کی جانب دوڑ گیا۔

''دادی میری دادی، تین سو تیرہ مل گیا۔ یہ تین سو تیرہ طاہرہ ہے۔''

وہ دادی سے لپٹ گیا۔ دادی نے اسے چمکارا، خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بھی دل سے یہی چاہتی تھیں کہ طاہرہ شرجیل کی دلہن بنے۔

رنگ افسانہ

شمیم فضل خالق

زندگی کہانی نہیں

تم سمجھ نہیں رہی ہو شمی ..... عورتیں اور خصوصاً بیویاں، اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی کسی عورت کے ساتھ دوستی برداشت نہیں کر سکتیں۔ بس اسی لیے میں محتاط تھا، لیکن تم نے تو میرے سارے کیے کرائے پر.....

رشتوں کی سچائی سے جُڑا ایک خاص خیال، افسانے کی صورت

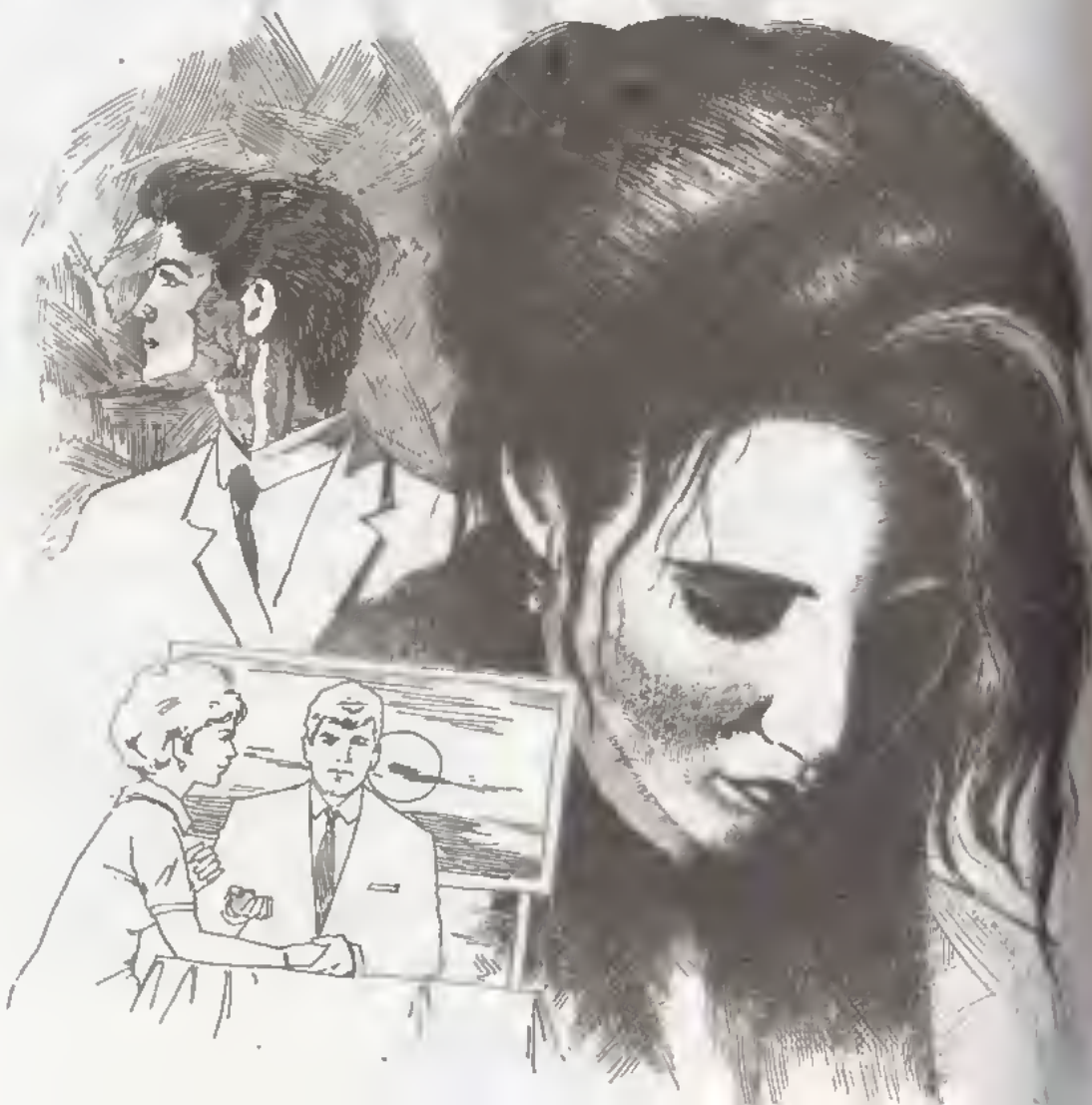

فارغ بیٹھنا ہمیشہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ بوریت میرے اندر تک اپنے پنجے پھیلا دیتی تھی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ آسمان پر بادلوں کا بسیرا تھا۔ دسمبر کا ٹھنڈا یخ مہینہ اس پر مستزاد کہ کتنے دنوں سے دھوپ بھی نہیں نکلی تھی۔ بادل اور ٹھٹھرتی سردی ہمیشہ ماحول پر ایک افسردہ سا تاثر پھیلا دیتے اور میری بوریت سوا ہو جاتی۔ بوریت کا یہ دورہ مجھ پر چھا جاتا تو میرا دل کچھ بھی کرنے کو نہ چاہتا۔ نہ میرا ٹی وی دیکھنے کو دل چاہتا، نہ کچھ کھانے پینے میں مزا آتا اور نہ ہی کسی دوست سے ملنے کے لیے دل کرتا۔ آج مما بھی گھر پر نہ تھیں۔ وہ اپنی کسی دوست کی پارٹی میں گئی ہوئی تھیں۔

میں نے بے دلی سے اپنا سیل فون اٹھایا اور اِدھر اُدھر انگلیاں مارنے لگا۔ اکثر تو اس قسم کے بوریت کے دورے میں، میں کسی دوست کو نہ فون کرتا، نہ کسی کا فون ریسیو کرتا لیکن جانے کیسے آج کوئی نمبر مل گیا تھا اور کسی لڑکی نے بے حد سریلی آواز میں ہیلو کہا۔ پہلے تو جی چاہا کہ فون کاٹ دوں لیکن پھر اس آواز کی نٹکھی میں کھو سا گیا اور جب اس نے دوبارہ ہیلو کہا تو مجھے اس انجانی لڑکی سے بات کرنے سے مزا آنے لگا۔

میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔ ”جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”آپ سے.....!“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”مجھ سے!!“ حیرت بھری آواز سنائی دی لیکن میں تو آپ کو نہیں جانتی۔“

”میں بھی آپ کو نہیں جانتا لیکن پھر بھی آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟ کیوں.....آپ ایسا کیا چاہتے ہیں؟“ آواز میں اور زیادہ حیرت در آئی۔“ میں نے صاف بات کرنے کی ٹھانی، سو سیل کو ایک کان سے ہٹا کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”دراصل مجھ پر بوریت کا بھوت سوار ہوا ہے۔ میں سخت بور ہو رہا ہوں۔ ایسے میں اتفاق سے آپ کا نمبر مل گیا۔ اسی لیے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔“

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ بولی۔ ”کیا آپ اکیلے رہتے ہیں۔ Mean I آپ کے گھر میں کوئی بہن بھائی.....مما پاپا.....نہیں ہیں؟“

”ایک مما ہیں۔ وہ بھی بڑی سوشل ہیں۔ آج بھی کسی پارٹی میں گئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرا مجرا پر اگر بھی ہوتا تو بھی بوریت کی یہ بیماری مجھ پر طاری رہتی۔“

وہ ہنس پڑی۔ بڑی خوب صورت ہنسی تھی اس کی، جیسے کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ مترنم اور شفاف سی ہنسی ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ ”نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ شاید پھر آپ اس بیماری کی زد میں کبھی نہ آتے۔“

اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔ ”یہ کیسے کہہ رہی ہیں آپ؟“

وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ”اس لیے کہ آپ کی جیسی بیماری مجھے بھی ہے اور اکثر بڑے زوروں سے یہ مجھ پر بھی حملہ آور ہوتی ہے۔“

میں چونکا ”یعنی کہ.....آپ بھی اکیلی ہیں..... آپ کے بھی بہن بھائی نہیں ہیں؟“

ایک اداس سی غم زدہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ہاں میرے صرف پاپا ہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن.....اپنے کاروبار کو وقت دینا بھی ان کی مجبوری ہے۔ اس وجہ سے میں اکثر اکیلی ہوتی ہوں اور آپ ہی کی طرح بور ہوتی ہوں۔“

میرے اندر بڑھنے والا بوریت کا دھواں جیسے اب دھیرے دھیرے نکلنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں میں مزا آنے لگا اور میں نہ جانے کیوں خود کو پرسکون سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس سے یوں گھل مل کر باتیں کر رہا تھا جیسے میں اسے مدتوں سے جانتا ہوں۔ وہ بھی کھل کر اپنے متعلق سب کچھ بتا رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ اس سے باتیں کرنے کے بعد جب میں نے اسے حافظ کہا تو مجھے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگنے لگا۔ میں نے کچن میں جا کر اپنے لیے کافی بنائی اور اپنے بیڈ روم میں آ کر ٹی وی لگا کر گنگنانے لگا۔

کپ ہاتھ میں لے کر گھونٹ گھونٹ کافی پیتے ہوئے میں اسی لڑکی یعنی شبینہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس دوران مما بھی آ گئیں۔

مجھے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر وہ خوش ہو کر بولیں۔ ”تھینکس گاڈ.....تم صحیح ہو.....“

”کیا مطلب؟؟“ میں ہنس کر بولا۔ ”کیا میں ہر روز غلط ہوتا ہوں۔“

”اور نہیں تو کیا۔“ مما مسکرا کے بولیں۔ ”تمہارا موڈ ہمیشہ بگڑا رہتا ہے۔ مجھے نینسی کی پارٹی میں بھی تمہاری فکر ستاتی رہی تھی۔“ وہ سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”آپ میری فکر نہ کریں مما۔ اپنی مصروفیات انجوائے کریں۔ میں اب بچہ تو نہیں ہوں۔“ میں نے ٹی وی پر نظریں جماتے ہوئے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”کیسے نہ کروں تمہاری فکر۔ تم میری اکلوتی اولاد ہو اور پھر تمہاری کوئی فکر کرنے والی ہے بھی تو نہیں۔ ویسے میں اب کوشش کر رہی ہوں کہ تمہاری کوئی فکر کرنے والی آ جائے تو میں بے فکر ہو ہی جاؤں گی۔“ مما کا لہجہ شرارتی ہو گیا تھا۔

میں ہنس دیا لیکن کچھ نہیں بولا۔ مما نے میرے جواب کا کچھ دیر انتظار کیا لیکن مجھے ٹی وی میں مگن دیکھا تو وہ سر جھٹک کر چلی گئیں اور میں ایک بار پھر سے شبینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ جس لڑکی کی آواز اتنی سریلی ہے وہ خود دیکھنے میں کیسی ہو گی۔ یقیناً حسین ہو گی بلکہ نہیں، وہ حسین تر ہو گی کیونکہ کسی بدصورت لڑکی کی آواز کبھی بھی اتنی سریلی نہیں ہوتی بلکہ اکثر بھدی ہوتی ہے۔

میں خود بھی خاصا ہینڈسم اور خوبرو جوان تھا۔ میں نے حال ہی میں ایم بی اے مکمل کر لیا تھا اور آج کل کسی اچھی جاب حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ سو جاب کی اتنی پروا بھی نہ تھی۔ اِدھر اُدھر کی جاب تو میں کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو آج کل فارغ تھا اور شاید اس لیے بوریت کے یہ دورے بھی سوا ہونے لگے تھے۔

☆.....☆

مما تو میری تعلیم کے دوران ہی میری شادی کر کے مجھے کھونٹے سے باندھ دینے کے درپے تھیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔ اس لیے کہ مجھے شادی پر تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن لڑکی میری پسند کی ہو گی۔ میری پہلی شرط یہ تھی۔

دوسری شرط یہ تھی کہ لڑکی بے حد حسین ہو۔ بالکل چاند کا ٹکڑا۔

تیسرے یہ کہ اس کا رنگ سفید ہو۔ میں صنفِ نازک میں سانولے رنگ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور یہ میں نے مما کو صاف بتا دیا تھا کہ چاہے لڑکی کے نین نقش کتنے ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں لیکن اگر اس کا رنگ سانولا ہو گا تو میں اسے ذہنی طور پر بالکل قبول نہیں کر پاؤں گا۔ اسی لیے مما بے چاری جانے کب سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں لیکن مطلوبہ لڑکی مل کر نہیں دے رہی تھی۔ خود میرے

دل کے ورق ابھی تک سادہ تھے۔ کوئی لڑکی مجھے آج تک متاثر نہیں کر سکی تھی۔

مما نے کتنی ہی لڑکیاں مجھے دکھائی تھیں لیکن میں ابھی کسی کو اوکے نہیں کر سکا تھا لیکن اب...... شبینہ سے بات کر کے میرے دل میں خوشگوار سی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

کیا خبر...... وہی میرے گھر کی اور میرے دل کی رانی بن جائے۔ میں نے فی الحال اسے تو نہیں دیکھا تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ ایک حسین لڑکی ہوگی۔ بالکل ایسی ہی جیسی میں چاہتا ہوں لیکن اس کا یہ نام...... مجھے اس کے نام پر خاصا اعتراض تھا۔ بھلا ایک اجلی اجلی صورت والی لڑکی کا نام شبینہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ بات ایک دن میں نے اسے کہہ بھی دی۔

میں شاید یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس دن کے بعد سے میری اور شبینہ کی ٹیلی فون پر گفتگو ہر روز ہونے لگی تھی۔

''مجھے تمہارے نام پر خاصا اعتراض ہے شبینہ اور اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں تمہیں شمی کہہ لیا کروں۔''

وہ اپنی مخصوص سی مترنم سی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''میرا کوئی ایک نام تو نہیں ہے سعد...... درجن بھر نام ہوں گے میرے...... اور اب تم اس میں ایک اور نام کا اضافہ کرنا چاہتے ہو...... یعنی شمی......''

میں حیران ہو کر بولا۔ ''درجن نام...... وہ کس خوشی میں......؟''

''کسی خوشی یا غم میں نہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔ بس پاپا نے اپنی پسند کے نام رکھے ہیں۔ پھپھو نے اپنی پسند کے، ماموں نے اپنی پسند کے اور انکل نے اپنی پسند کے لیکن خیر...... تم جس نام سے بھی پکارو۔ مجھے اچھا لگے گا۔''

میں موضوع بدل کر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

☆......☆

اس سے باتیں کرنا، مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا۔ میری بوریت ختم ہو جاتی تھی اور بات ختم ہونے کے بعد بھی میں سرشار سا رہتا اور آج کل تو میں شدت سے اس کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ دراصل مما نے میرے لیے کوئی لڑکی پسند کر لی تھی۔ وہ ان کی کسی دوست دردانہ آنٹی کی بھتیجی تھی۔ مما کو لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اسے دیکھ کر اوکے کردوں تاکہ مما پھر باقاعدہ طور پر میرا رشتہ مانگنے چلی جائیں۔ میں کچھ کنفیوژ بھی تھا۔ سوچ رہا تھا کہ شمی کو کسی طرح دیکھ لوں تو شاید پھر فیصلہ کرنا میرے لیے آسان ہو جائے لیکن مما مجھے گھسیٹ کر لڑکی دکھانے لے گئیں۔ لڑکی میں نے دور سے دیکھ لی۔ مسز آفندی کے ہاں خالصتاً زنانہ پارٹی چل رہی تھی۔ مما مجھے لے تو گئیں لیکن میں اتنی ساری آنٹیوں کو اکٹھے دیکھ کر بدک گیا اور ان کے درمیان جانے سے صاف انکار کر دیا۔

مما نے مجھے کسی نہ کسی طرح آخر وہ لڑکی دکھا دی۔ لڑکی کیا تھی۔ سمجھو، چاند زمین پر اتر آیا تھا۔ تیکھے نقش تو خوب صورت تھے ہی لیکن رنگت جیسے دمک رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے میدے میں گلابیاں گھل گئی ہوں۔ متناسب قد اور گھونگھریالے سنہرے بال...... لڑکی نہیں تھی ایک قیامت تھی جو دلوں پر بجلی گرانے لائق تھی میں متاثر ہونے کے باوجود بھی کنفیوز تھا۔

مما کو وہیں چھوڑ کر میں گھر آ گیا اور آتے ہی شمی کو فون ملا دیا۔

''کیا بات ہے۔ آج آپ نے بے وقت فون کیا...... جبکہ آج تو موسم بھی بوریت کا نہیں۔'' وہ اپنی مدھر آواز میں شرارتی انداز میں بولی۔

''شمی!'' میں اپنے دل کی مدھر دھڑکنوں کو کنٹرول میں کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دراصل میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں تو کہو نا۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''شمی۔'' میں قدرے جھجک کر بولا۔ ''وہ...... مما میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

''ارے! کیا سچ......؟''

میں نے تصور کی آنکھ سے اسے اچھلتے ہوئے دیکھا۔ میں خاموش رہا۔ اس میں بھلا اتنا ایکسائیٹڈ ہونے والی کیا بات تھی بلکہ میں تو چاہتا تھا کہ وہ یہ سن کر اداس ہوتی یا پھر شرما جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے سعد...... دیکھنا تم شادی کے بعد بالکل بھی بور نہیں ہو گے۔ تمہاری یہ بوریت والی بیماری ختم ہو جائے گی۔'' وہ پھر سے شرارتی انداز میں بولی۔ ''بلکہ پھر تو تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ہوگا۔''

مجھے اس کی باتیں اچھی تو نہیں لگ رہی تھیں لیکن اب اتنا خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ سو دھیمی آواز میں بولا۔ ''مما تو بہت پہلے میری شادی کرا دینا چاہتی تھیں لیکن......''

وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ ''لیکن کیا؟ کیا تم انٹرسٹڈ نہیں تھے شادی کرنے میں یا پھر تمہارا کوئی خاص قسم کا آئیڈیل تھا۔''

''نہیں!'' میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خاص نہیں۔ بس عام سا آئیڈیل تھا اور وہ یہ تھا کہ لڑکی کا رنگ گورا ہو۔''

وہ بے ساختہ ہنسی اور شرارت سے بولی۔ ''گویا تم اس شعر کی عملی تفسیر بنے ہو کہ ''گورے رنگ کا زمانہ۔ کبھی ہوگا نہ پرانا''

میں بھی ہنس پڑا اور بولا۔ ''ہاں یار...... بس میں نسوانیت میں گورے رنگ کو ہی پسند کرتا ہوں۔

غزل

لکھ اپنی ڈائری میں کبھی میرا نام بھی
ان رنگ رنگ لفظوں میں اک سادہ نام بھی

دن تھے کہ تیری کار کا نمبر بھی یاد تھا
اب ہیں کہ ہم کو بھول گیا اپنا نام بھی

گری تھی وہ مکان کا سب کچھ جھلس گیا
دل کا ورق بھی راکھ ہوا، اُس کا نام بھی

اس سے ہی زندگی ہے مرے خوں کے شہر میں
برفیلی خواہشوں میں ہے اک جلتا نام بھی

وہ بھوک تھی میں اپنے ہی اندر کو کھا گیا
ملتا نہیں ہے دور تلک میرا نام بھی

محمود شامؔ پوچھتے ہیں سب ''وہ'' کون ہے
تم ہی کہو کہ ہوتا ہے خوشبو کا نام بھی

محمود شامؔ

سانولی رنگت والے مرد تو چل جاتے ہیں لیکن خواتین.....کی رنگت سفید ہونی چاہیے۔"

"اوہ!" وہ چپ سی ہوگئی۔

میں نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ "شمی میں نے کبھی تم سے پوچھا نہیں کہ.....تمہاری رنگت کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے....." مجھے بات مکمل کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

وہ تھوڑی سی سنجیدہ ہوکر بولی۔ "سعد تمہیں اچھا تو نہیں لگے گا لیکن میں اچھی خاصی سانولی ہوں۔"

میرا سانس جیسے سینے میں اٹکنے لگا۔ میں نے گھبرا کر اپنا سیل فون ایک کان سے ہٹا کر دوسرے سے لگادیا۔

وہ دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ "میرا نام شبینہ بھی اس لیے رکھا گیا ہے کہ میں شب کی طرح تاریک ہوں۔ آئی مین میری رنگت خاصی سانولی ہے۔"

میں چپ کا چپ رہ گیا۔ بلکہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔ الفاظ جیسے ختم ہوگئے تھے۔

وہ بول رہی تھی "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے سعد، میں تو تمہاری بوریت دور کرنے کی ساتھی ہوں۔ تم شادی سفید رنگت والی سے ہی کرنا۔"

میں نے سوچا شمی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ میری دوست رہے گی۔ شادی تو کسی نہ کسی سے ہو ہی جائے گی لیکن.....شمی جیسی ٹیلی فونک دوستی تو ہر کسی سے ممکن نہیں۔ پھر بھی مجھے اس بات کا افسوس تو بہت ہوا۔ کیا تھا اگر شمی کی رنگت سفید ہوتی.....وہ گورے رنگ کی مالک ہوتی تو میں یقیناً اس سے ہی شادی کے بارے میں سوچتا۔

یہ بات میں نے اس سے کہہ بھی دی۔ "شمی اگر تمہاری رنگت سفید ہوتی تو میں یقیناً تم سے شادی کرتا۔ ہمارے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ ہماری زندگی بہت اچھی گزر جاتی۔"

وہ ہنستے ہنستے بولی۔ "تو کیا میں رنگ گورا کرنے والی کریمیں استعمال کرنا شروع کردوں؟"

میں اس کی مسترم ہنسی میں ڈوب کر رہ گیا۔ کاش! وہ اپنی ہنسی کی طرح خوب صورت بھی ہوتی۔ چلو نہ ہوتے اس کے نین نقش خوب صورت، کم سے کم وہ گوری تو ہوتی۔ میرے اندر ایک ٹھنڈی ٹھنڈی آہ دم توڑ گئی۔

ایک تو عجیب بات یہ تھی کہ نہ ہی میں نے شبینہ سے ملنے کی اور نہ ہی اسے دیکھنے کی کبھی خواہش کی تھی اور نہ ہی اس کی طرف سے ایسا کوئی تقاضا ہوا تھا اور اب تو اس کی حقیقت جاننے کے بعد مجھے اس سے ملنے کی چاہ بھی نہیں رہی تھی۔

☆.....☆

ہماری باتوں میں اکثر میری ہونے والی منگیتر کا بھی ذکر ہوتا۔ میں نے مما کو اس لڑکی، جس کا نام ربیعہ تھا، کے لیے ہاں کردی تھی۔

مما کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ میں خود بھی اتنی حسین لڑکی کے تصور سے ہی خوش تھا اور اپنی feelings شمی سے اکثر شیئر کرتا۔ وہ بڑی خوش دلی سے باتیں کرتی۔ مجھے خاصے مفید مشورے بھی دیتی تھی۔

اسی دوران مما نے مجھے خوش خبری سنائی کہ لڑکی کے والد نے ہاں کردی ہے۔ خوشیوں نے جیسے میرے سُونے دل پر دستک دے ڈالی۔

میں نے فوراً سے پیشتر شمی کو فون ملایا اور اسے خوش خبری سنادی۔ شمی نے بڑے زور و شور سے مبارک باد دی۔

وہ بھی بہت خوش ہوئی۔ "دیکھو شمی.....اب اور نہیں چلے گا۔ تمہیں میری منگنی میں.....شادی میں سب میں آنا پڑے گا۔" میں استحقاق بھرے لہجے

میں اس سے کہنے لگا۔

"لیکن سعد.....ہم نے مل کر کرنا بھی کیا ہے۔" وہ بڑے دھیمے لہجے میں بولی۔ "آمنے سامنے بیٹھ کر بھی ہم دونوں اسی قسم کی باتیں کریں گے۔ اچھے دوست جو ٹھہرے۔"

"تو کیا دوست آپس میں ملاقات نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی میں شریک نہیں ہوتے۔" میری آواز میں شکوہ تھا۔

"کیوں نہیں لیکن جیسا چلتا ہے ویسے چلنے دو مد۔ ہماری دوستی کی شروعات ٹیلی فون سے ہوئی ہے تو بس اسی طرح چلنے دو۔" وہ رسان سے بولی۔

میں بھی چپ ہوگیا اور موضوع بدل کر ربیعہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

☆.....☆

ہماری باتوں میں ربیعہ کا عمل دخل زیادہ ہونے لگا تھا۔ ایک رات میں ساری رات ربیعہ کو خواب میں دیکھتا رہا تھا۔ تھوڑی سی آنکھ لگتی تو وہ ذہن کی اسکرین پر اٹھتی بیٹھتی، چلتی پھرتی نظر آتی۔ میں نے صبح شمی سے بات کی تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"ارے.....ابھی سے.....ابھی تو وہ تمہاری زندگی میں آئی بھی نہیں ہے۔ ابھی سے تمہارے خواب اس کے تصور سے سج گئے ہیں۔"

میں ہنس کر ڈھٹائی سے بولا۔ "میری زندگی میں تو وہ شامل ہوگئی ہے۔ منگنی کا مطلب آدھی شادی ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ "یہ بتاؤ تم ربیعہ کو کس کلر کے ڈریس میں زیادہ پسند کرو گے۔"

"میں....." میں خواب ناک لہجے میں سوچتے ہوئے بولا۔ "پنک کلر میں، اس کی گوری رنگت دمکنے لگے گی، بالکل ستاروں کی طرح۔ اس کا حسن تجلیاں بکھیرے گا۔ اس کا لباس اسے حسین نہیں بنائے گا بلکہ وہ لباس کے حسن کا باعث بنے گی۔" میں بولتا چلا گیا۔

"ارے.....ارے....." وہ اپنی جھرنے کی آواز جیسی مسترم ہنسی کے ساتھ بولی۔

"تم تو اچھے خاصے شاعر بنتے جارہے ہو۔ ربیعہ کے پیار میں....." میں اسی جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

"نہیں شمی سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھو اگر یہی لباس ایک سانولے رنگت کی لڑکی کو پہنا دیا جائے تو نہ لباس خوب صورت لگے گا، نہ وہ لڑکی خوب صورت لگے گی۔ بس اس سے ثابت ہوگیا کہ لباس کو گولی مارو۔ کلرز کو گولی مارو۔ اصل خوب صورتی تو حسن میں ہے۔" شمی کی اچانک خاموشی پر مجھے احساس ہوا کہ یہاں سانولے رنگ کا ذکر کر کے میں نے شمی کی دلآزاری کی ہے کہ اس کا رنگ بھی سانولا ہے۔ مجھے افسوس ہونے لگا۔ اپنی خوشی اور جوش میں، میں خوامخواہ اودر ہونے لگا تھا۔

"شمی تم نے مائنڈ کیا؟" میں سہم کر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

وہ ہنس پڑی اور بے ساختہ بولی۔ "نہیں تو، کیا دنیا میں صرف میری رنگت سانولی ہے جو میں مائنڈ کروں گی۔ ارے ہزاروں، لاکھوں لڑکیاں سانولے رنگ کی ہیں۔ میں نے بالکل بھی تمہاری بات مائنڈ نہیں کی۔

کتنے کھلے اور شفاف دل کی تھی وہ۔ کاش میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرسکتا۔ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹنے لگا۔ کچھ دیر میں اس اداسی کے زیر اثر رہا لیکن جلد ہی ربیعہ کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور میں سب کچھ بھلا کر صرف اس کی باتیں کرنے لگا۔

☆.....☆

شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ مما چاہ رہی تھیں کہ میں ربیعہ سے ملوں، اس سے فون پر بات چیت کروں لیکن جانے کیوں میں اندر سے کچھ پرانے زمانے کا مرد تھا۔ اس لیے اپنی بیوی کو سہاگ رات کو ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ سو مما کی ایسی ہر بات کو میں نے ہنس کر ٹال دیا لیکن یہ سچ تھا کہ میں ربیعہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب میری زندگی میں بہار بن کر آتی ہے۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوگئی۔ مما نے اپنے دل کے سارے ارمان جی کھول کر پورے کیے۔

میں نے بڑی چاہ سے شمی کو انوائیٹ کیا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔

شکایت پر وہ بولی۔ ”سچ کہہ رہی ہوں سعد..... میں ضرور آجاتی لیکن میرے معدے میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ بس طبیعت اتنی سست تھی کہ کہیں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن تم یہ چھوڑو۔ یہ بتاؤ ربیعہ کو پا کر تمہیں کیسے لگ رہا ہے؟“

اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ مجھے اس کے نہ آنے کی وجہ سن کر غصہ تو آیا بھلا نہ آنے کی یہ کیا Logic تھی۔ دوا لے کر آسکتی تھی۔ چاہے کچھ دیر کے لیے آتی لیکن پھر ربیعہ کے ذکر نے میرے موڈ کو خوشگوار کر دیا۔

آج میری شادی کا تیسرا دن تھا۔ میری نظر میں میری سہاگ رات کسی فلم کے سین کی طرح آگئی۔ کیا منظر تھا جب ربیعہ زرق برق کپڑوں اور زیورات میں آسمان سے اتری کسی حور کی مانند لگ رہی تھی۔

میرے سجے ہوئے بیڈ روم میں اس کا بے پناہ حسن تجلیاں بکھیر رہا تھا۔ مجھے تو اس کے حسن نے پاگل سا کر دیا اور اس پر یہ غرور کہ اتنی حسین لڑکی میری بیوی تھی اور مجھے اس پر ہر طرح سے دسترس حاصل ہے۔

☆.....☆

شمی مجھ سے کریدکرید کر پوچھ رہی تھی لیکن میں کیا کہتا۔ باتیں تو انسان بہت ساری کر سکتا ہے لیکن اپنے جذبے زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ سو میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ ویسے بھی شادی کے بعد شمی سے یہ میری پہلی بات تھی۔ وہ بھی میں نے اپنے گھر سے باہر نکل کر ایک قریبی پارک میں آکر کی تھی۔ میں اپنی اس بے ضرر دوستی کو ربیعہ سے چھپانا چاہتا تھا کیونکہ میرا یہ خیال تھا کہ عورتیں اور خاص کر بیویاں، اس سلسلے میں بہت حساس ہوتی ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہیں۔ سو میں اپنی دوستی اور ازدواجی زندگی کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

میں اپنے بارے میں ربیعہ کو سب کچھ بتا چکا تھا لیکن شمی کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں شمی کو ربیعہ سے مکمل طور پر چھپانا چاہتا تھا اور اپنی زندگی میں کوئی بدمزگی، کوئی الجھن نہیں چاہتا تھا۔

ربیعہ اپنی ذات میں ایک مکمل شخصیت تھی اگر وہ حسین نہ بھی ہوتی تو بھی اسے دیگر خوبیوں کی بنا پر چاہا جاسکتا تھا۔ اس نے میری زندگی میں رنگ بھر دیے تھے۔ اس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے لی تھیں۔ مما اب مکمل طور پر اپنی سوشل لائف میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ وہ ربیعہ سے خوش بھی تھیں اور اس کی طرف سے مطمئن بھی تھیں میں خود بھی جو کچھ چاہتا تھا وہ سب ربیعہ میں موجود تھا۔ سو میں بہت خوش، بے حد آسودہ اور مطمئن تھا۔

میں شمی سے ربیعہ کی ڈھیر ساری تعریفیں کرتا۔ اب تو ربیعہ ہی ہماری گفتگو کا محور بن گئی تھی۔ بوریت کے دور تو شادی کے بعد ہی اُڑ چھو ہو گئے تھے۔ اب

مجھے کہاں بور ہونے کا ٹائم ملتا تھا۔

☆.....☆

مجھے ایک انٹرنیشنل کمپنی میں اچھی جاب بھی مل گئی تھی۔ آفس ٹائم کے بعد جو گھر میں وقت گزرتا، وہ سارے کا سارا ربیعہ کے زلفوں تلے گزرتا۔ میں گھر آتا تو ربیعہ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ وہ کہتی رہتی۔

”سعد..... پلیز..... دن میں یوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ مما کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔“

میں اس کا کوئی جواز خاطر میں نہ لاتا۔ اس کی محبت میں جیسے دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا اور جیسے سب کچھ بھول گیا تھا لیکن ہاں اگر نہیں بھولا تھا تو شمی کو..... میں اسے آفس سے ہر روز فون کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی فون کر لیتی تھی۔

موسم تبدیل ہوا تو کھانسی اور بخار نے مجھے بھی آن گھیرا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ میں بستر کا ہو کر رہ گیا۔ دو تین دن تو میں ایسا غافل رہا کہ آفس بھی نہیں گیا۔ میری بیماری نے ربیعہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ میری خدمت گزاری میں اس نے اپنا آپ بھی بھلا کر رکھ دیا تھا۔ مما بھی پریشان تھیں اور گھبرا کر کبھی ایک اور کبھی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لیتیں۔ چوتھے دن میری طبیعت تھوڑی سنبھل گئی تو مما اور ربیعہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ مما تو کسی آنٹی کی بیٹی کے ولیمے میں شرکت کرنے چلی گئیں جب کہ ربیعہ بدستور میرے ساتھ لگی رہی۔

کئی دن ہو گئے تھے، میری شمی سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا ربیعہ کمرے سے نکلے تو میں شمی سے بات کرلوں کہ اس کو یقیناً فکر ہوگی کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں لیکن ربیعہ کمرے میں چیزیں الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ میری بیماری سے

غزل

دل کے نگارخانہ سے باہر رکھا ہوا
اچھا نہیں ہے سانس کا بستر رکھا ہوا

بے آس ہو کے گر پڑا فوراً چراغِ حُسن
میں نے تھا عشق ہاتھ کے اوپر رکھا ہوا

مجھ کو بھگا کے نیند سے بولا کہ جلدی چل
ہے خواب ایک حبس کے اندر رکھا ہوا

خطرہ ہے جم نہ جائے کہیں ضبط کا غبار
ہے دل کو ہم نے اس لیے اندر رکھا ہوا

کب ہو گئے نگار میرے ہاتھ کیا خبر؟
پہلو میں اُس نے ہے کہیں خنجر رکھا ہوا

اِس احتیاط سے تمہیں چاہا کہ اے فلکؔ
اب تک زباں پہ چپ کا ہے پتھر رکھا ہوا

افتخار فلکؔ کاظمی

سارا بیڈ روم تلپٹ ہو گیا تھا۔ اب ربیعہ بیڈ کور تبدیل کر رہی تھی۔ دوائی کی خالی بوتلیں اور جانے کیا الم غلم سمیٹ کر کوڑا دان میں ڈال رہی تھی۔

میں فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو ربیعہ کھانا بنانے کچن میں چلی گئی۔

میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور شمی کو فون کیا۔

وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ”کہاں تھے تم سعد؟ جانتے ہو کتنے دنوں سے تم نے مجھ سے بات نہیں کی۔“

میں نے اسے اپنی بیماری کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تمہیں رنگ کی تھی لیکن فون ربیعہ نے اٹھایا۔“

”کیا!! میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اپنا سیل ایک کان سے ہٹا کر دوسرے سے لگاتے ہوئے میں نے بے چینی سے اس سے پوچھا۔ ”پھر؟ کیا بات ہوئی؟“

وہ جلدی سے بولی۔ ”کوئی خاص نہیں۔ بہت مختصر۔ اس نے پوچھا کہ میں کون بات کر رہی ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں شبینہ بات کر رہی ہوں۔ پھر تمہارا پوچھا تو معلوم ہوا کہ تم واش روم میں ہو۔ بس پھر میں نے فون بند کر دیا۔“

میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ قدرے خفگی سے میں نے کہا۔ ”شمی..... تم ربیعہ کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیتیں۔ کیا ضروری تھا کہ اس سے بات بھی کرو۔“

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”سعد..... میرے اور تمہارے بیچ ایسا کچھ نہیں، جسے چھپایا جا سکے۔ بلکہ مجھے تو انتظار تھا کہ تم کسی دن خود میری اس سے بات کراؤ گے۔“

میں الجھ کر بولا۔ ”تم سمجھ نہیں رہی ہو شمی..... عورتیں اور خصوصاً بیویاں، اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی کسی عورت سے دوستی برداشت نہیں کر سکتیں۔ بس اسی لیے میں محتاط تھا لیکن تم نے تو میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔“

میرا لہجہ خفگی بھرا تھا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا شمی پر۔ بھلا ربیعہ سے بات کرنے کی کیا تک تھی۔ شمی کو بھی شاید میری باتیں اچھی نہیں لگی تھیں، سو کچھ کہے سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

میں دل میں سہما ہوا تھا کہ جانے ربیعہ اس بات کو کس نظر سے لے گی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ربیعہ کو لازماً برا لگے گا کہ ایک خاتون سے میری دوستی ہے لیکن کتنا برا لگے گا۔ یہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

☆.....☆

آج سارا دن میں اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتا رہا تھا لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے میری خدمت کی۔ میرے لیے سوپ بنایا۔ دوائیاں دیں۔ یعنی سارے کام معمول کے مطابق کیے۔ مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی کہ شاید وہ یہ عام سی بات سچ مچ کو بھول گئی ہو لیکن رات کو جب اس نے سارے کام ختم کیے اور میرے بازو پر اپنا سر رکھ دیا تو ہولے سے بولی۔

”سعد..... یہ شبینہ کون ہے؟“

میرے اندر جھٹکے سے چلنے لگے۔ دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر میں دھیمی آواز میں بولا۔ ”دوست ہے میری۔“

”اچھا!!“ اس کی آواز میں حیرت تھی۔ ”آپ نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا مجھ سے۔“

میں سٹپٹا گیا لیکن جواب تو دینا تھا۔ سو بولا۔ ”بس..... کبھی موقع نہیں آیا۔“

وہ بولی۔ ”لیکن آپ تو اپنی سارے دوستوں کا تعارف مجھ سے کرا چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں چھپایا؟“

”نہیں..... چھپانے کی کیا بات تھی۔ بس یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ شاید میں بھول گیا ہوں گا۔“ میں نے اپنے لہجے میں لاپروائی سموتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا..... یہ بتائیے کہ وہ آپ کی کوئی کالج کی دوست ہے۔ کس قسم کی دوست ہے وہ آپ کی.....“ اس کے انداز میں بے چینی تھی۔

میں نے سوچا، جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے بندے کو سو قسم کے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی جھوٹ کھل جاتا ہے۔

میں ازدواجی زندگی کی شروعات میں اپنے آپ کو ایک جھوٹا آدمی کہلانے کا روادار ہرگز نہ تھا۔ سو میں نے اسے بلا کم و کاست ساری بات بتا دی۔

اس نے غور سے ساری کہانی سنی لیکن کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بس خاموشی سے کروٹ بدل کر سو گئی۔

میرے دل میں اتھل پتھل ہونے لگی۔ ربیعہ کا یہ انداز صاف ظاہر کر رہا تھا کہ میری باتوں سے اس کے دل کو ٹھیس لگی ہے یا شاید وہ اسے میری دروغ گوئی سمجھ رہی ہو۔ شاید اس کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ بات وہ نہیں جو میں اس وقت کہہ رہا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

ساری رات اسی سوچ بچار میں گزر گئی۔ میں اسے منانے میں پہل نہ کر سکا کہ روٹھنے والی بات کون سی تھی۔ میں اگر جھوٹ بولتا تو بھی گناہ گار ٹھہرتا اور اب جب سچ بولا تو بھی خطا کار ٹھہرا۔ میں سوچ کر دل ہی دل میں خود سے سوال جواب کرتا رہا۔

☆.....☆

ربیعہ ویسے تو اپنی ساری ذمہ داریاں پہلے کی طرح نبھا رہی تھی۔ کسی کو اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے بھی وہ سارے کام پہلے کی طرح کرتی رہی۔ مجھے ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہلے ہی کی طرح تیار ملتے۔ پالش کیے ہوئے جوتے، صاف ستھری جرابیں..... ہر روز صاف بنیان یعنی سب کچھ پہلے جیسا تھا لیکن وہ مجھ سے کچھ دور ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اَن دیکھا فاصلہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے اور اس کے بیچ ایک خلیج سی حائل ہو رہی ہو۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آ کر چپ کر کے..... ایک طرف سمٹ سمٹا کر سو جاتی۔ میرے جذبوں کی پذیرائی کرنی اس نے چھوڑ دی تھی۔ میں لاکھ کوشش کرتا کہ اس کے دل میں اگر کوئی میل ہے تو نکال دوں، کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کر دوں لیکن وہ شمی کا نام سنتے ہی تھے سے اکھڑ جاتی۔

”آپ وعدہ کریں۔ میرے سامنے اس کا نام نہیں لیں گے۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔“

میں چپ ہو جاتا لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں بہت پریشان تھا۔ ایک بہت ہی چھوٹی سی بات نے میری خوشی گہنا کر رکھ دی تھی۔ مجھے اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں لگنے لگی تھی۔ ربیعہ سے میری لو میرج نہیں تھی لیکن شادی کے بعد میں اسے اتنی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ اس سے دوری میری موت تھی لیکن دن بدن وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

☆.....☆

اپنی اس پریشانی کو میں نے شمی سے شیئر کیا۔

شمی آزردہ سی ہو کر بولی۔ ”سعد..... یہ سب میری وجہ سے ہوا نا.....؟ اگر میں اس دن ربیعہ سے بات نہ کرتی تو یہ سب نہ ہوتا۔“

میں بھی دل میں اسے شمی کا قصور مان رہا تھا لیکن جب بات کھل گئی اور میں نے ربیعہ سے ساری بات سچ سچ کہہ دی تو اسے میری بات کا یقین کر لینا چاہیے تھا۔

میں اداسی سے بولا۔ ”نہیں شمی..... قصور تو کسی کا بھی نہیں۔ شاید ہماری شادی شدہ زندگی کو نظر لگ گئی ہے۔ تب ہی تو ایک چھوٹی سی بات نے ربیعہ کے دل میں اتنی دراڑیں ڈال دی ہیں۔“

شمی نے ایک آہ بھری۔ ایک اچھی دوست ہونے کے ناتے وہ میرے لیے کافی پریشان تھی۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”ربیعہ کیا کہتی ہے؟“

میں پریشان سا ہو کر بولا۔ ”وہ نہ کچھ کہتی ہے۔ نہ سنتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اس بات پر بالکل بھی یقین نہیں آیا کہ میں نیتم سے ملا ہوں اور نہ ہی تمہاری کوئی تصویر..... کوئی فوٹو دیکھی ہے۔“

وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ”ہاں..... فی زمانہ اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔“

”ہاں اور اسی بات کو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم نے کبھی یہ ضرورت محسوس ہی نہیں کی کہ ایک دوسرے سے بالمشافہ ملاقات کریں۔ ہمارے لیے یہ ٹیلی فونک بات چیت ہی بہت ہے اور ہم اسی میں خوش تھے اور خوش ہیں۔“

شمی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ تم ٹینشن مت لو سعد۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم اگر بچے ہیں تو ہمیں ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ربیعہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“

میں نے بے دلی سے فون بند کر دیا۔

☆.....☆

میرے اور ربیعہ کے بیچ ایک سرد جنگ جاری تھی اور فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ مما میری طرف سے مطمئن ہو کر اپنی دنیا میں کھو گئی تھیں۔ ویسے بھی میں مما کو اپنی پرابلمز میں انوالو نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر یہ ایسی پرابلم تھی کہ گھر کے کیئنوں کو تو کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ربیعہ کی ساری ضد اور اکڑ تو بیڈ روم میں ہوتی تھی۔ مکمل طور پر مجھے نظر انداز کرنا میرے ساتھ بالکل ایسا برتاؤ کرنا، جیسے غیروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مجھے لگتا تھا، جیسے شادی کے ابتدائی دن ایک سنہرے خواب کی طرح تھے۔ ’کیا میرا جرم اتنا بڑا ہے‘ جسے ربیعہ معاف نہیں کر سکتی، میں اکثر سوچتا لیکن مجھے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہ ملتا۔ میری ذہنی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

☆.....☆

آفس میں آج میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر جانے کی بھی خواہش پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ آفس کی طرف سے اسلام آباد جانے کا آرڈر تھا لیکن جانے کیوں میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ جب دل کی بے چینی حد سے بڑھی تو واپس گھر جانے کی ہی ٹھانی۔ حالانکہ جب سے ربیعہ ناراض ہوئی تھی، گھر جانے میں بھی میری دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن گھر سے تو فرار ممکن نہ تھا۔ جیسا بھی تھا سکون گھر میں ہی میسر آتا تھا۔

آج میرے سر میں بھی خاصا درد تھا۔ سوچ سوچ کر سر درد سے پھٹنے لگا تھا کہ مرد تو جانے کیا کیا گل کھلاتے ہیں اور بیویاں برداشت کر لیتی ہیں جب کہ ربیعہ نے ایک بے ضرر سی ٹیلی فونک دوستی کو ہوا بنا لیا ہے۔

میں نے سوچا کہ آج ربیعہ سے دو ٹوک بات کروں گا اور اگر اس کا موڈ اس بات سے بہتر ہوتا ہے کہ میں شمی سے دوستی چھوڑ دوں تو میں اس کے سامنے شمی کو فون کر کے اس سے دوستی ختم کر لوں گا۔ حالانکہ ایک اچھی دوست سے محروم ہونے کا مجھے دکھ تو ہو گا لیکن ربیعہ کے لیے میں یہ بھی کر لوں گا۔ شاید

وہ یہی چاہتی ہو گی۔ میں نے پے در پے دو تین پین کلرز گولیاں کھالیں اور اپنے آفس سے باہر آ گیا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آج تو مما صبح سے گھر سے نکلی ہیں، انہیں بیوٹی پارلر جانا تھا۔ پھر کسی دوست کے گھر پارٹی تھی، وہاں جانا تھا۔ صبح ناشتا ہم دونوں نے اکٹھے کیا تھا پھر مما مختصراً اپنا پروگرام بتا کر جلبت میں نکل گئی تھیں۔

مما خود ہی کار ڈرائیو کرتی تھیں۔ اس لیے ان کے کہیں آنے جانے کا کوئی پرابلم نہ تھا۔ ان کی گاڑی بھی الگ تھی۔ میں نے سوچا چلو آج مما بھی گھر پر نہیں ہیں تو میں کھل کر ربیعہ سے بات کروں گا۔

☆.....☆

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے میں اندر گیا تو ٹھٹھک کر لاؤنج ہی میں رک گیا۔ بند کمرے سے ربیعہ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید کسی فرینڈ سے فون پر بات کر رہی تھی۔ باہر تک اس کی آواز صاف طور پر آ رہی تھی کہ اچانک اس کے منہ سے شبینہ کا نام سن کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔

میں نے حیرت سے سوچا۔ ربیعہ فون پر شمی کے متعلق کیا بات کر رہی ہے؟ تجسس نے مجھے مجبور کیا کہ میں چھپ کر اس کی باتیں سن لوں۔ حالانکہ اس قسم کی حرکت کو میں نے کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا لیکن میں نے سوچا کہ کیا پتا ربیعہ کی باتوں سے میرے ہاتھ اس کی اس درجہ نارمشکی کا کوئی نکتہ ہاتھ آ جائے۔

میں نے اسی لیے کان لگا کر اس کی باتیں سننے کی کوشش کی۔

”اب کیا بتاؤں نمیرہ..... مجھے سعد کو سزا تو دینی ہے اور یہ سزا کافی لمبی ہو گئی ہے کیوں کیا اس نے ایسا..... بندے کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر مجھ میں ایسی کیا خود غرضی دیکھی تھی موصوفہ نے۔ دوسری طرف کی آواز تو میں نہیں سن سکتا تھا لیکن ربیعہ کی باتیں بالکل صاف صاف میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہاں..... ہاں شبینہ بھی میں ہوں اور ربیعہ بھی..... لیکن سعد کے لیے تو دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں۔“

”کیا!!“ میرا دماغ گھومنے لگا۔

میں نے لپک کر دیوار کو تھام لیا۔ مجھے چکر آنے لگے۔ مجھے تو ربیعہ کی بات کی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ بھلا شمی اور ربیعہ ایک کیسے ہو سکتی ہیں۔

دوسری طرف ربیعہ بول رہی تھی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو نمیرہ لیکن مجھے تم جانتی ہو کہ میں کتنی نرم دل ہوں۔ سعد کی بوریت کی داستان نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس سے ٹیلی فونک دوستی کر لوں کیونکہ میں خود بھی ایسے کٹھن حالات سے گزری ہوں اور میں سمجھ سکتی ہوں کہ تنہائی بندے کو کس حد تک توڑ کر رکھ دیتی ہے۔“

پھر اس کی مدھم ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”تم سے تو میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی نمیرہ۔ تم جانتی ہو۔ میں سعد کی شمی بن گئی لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں نے یہ ٹیلی فونک دوستی صرف اور صرف ہمدردی میں کی تھی لیکن تم تو میرے خیالات سے ناواقف نہیں ہو کہ میں نے اپنی محبتیں اور چاہتیں صرف اس شخص کے لیے مخصوص کی تھیں، جو میرا شریک حیات بنتا۔“

قدرے توقف سے وہ بولی۔ ”مجھے غصہ اس بات پر آیا ہے نمیرہ کہ کیا صرف ایک انسان کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا جائے کہ اس کا رنگ گورا نہیں ہے۔ کتنی زیادتی ہے یہ پوری لڑکی برادری کے ساتھ ورنہ بقول سعد..... شمی میں تو اور کوئی خامی نہیں تھی۔ پھر اس نے شمی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی۔“ وہ بولتی رہی اور میں تو سانس بھی لے نہیں پا رہا تھا۔

"اف یہ کیا کھیل کھیلا گیا تھا اور میرے ساتھ....."

"نہیں میں سعد کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں چاہتی تھی اور اسے میں نے دھوکا دیا بھی نہیں۔ وہ تو خود ہی اس جال میں پھنس گیا اور پھنستا چلا گیا اور ویسے کھیل کھیل میں یہ بات لمبی ہوتی گئی۔ دیکھو نمیرہ اگر میں سعد کے ساتھ فون پر بات کرتی تھی تو میں جانتی تھی کہ وہ میرا شوہر ہے جب کہ وہ تو ایک غیر لڑکی سے، اپنی بیوی سے چھپ کر اسے اپنے دل کا حال سناتا تھا۔" وہ خود کو ہر الزام سے بری کر رہی تھی۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولی۔ "تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ ان دونوں کے بیچ دوستی کے علاوہ کوئی رشتہ تھا لیکن مجھ سے چھپ کر یہ دوستی قائم رکھنے کی کیا تک تھی؟ وہ مجھ سے خود کہہ دیتا تو یہ کنفیوژن پیدا ہی نہ ہوتی۔ میں وہیں، اس وقت اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دیتی۔ اصل حقیقت بتا کر..... لیکن موصوف مجھ سے چھپا رہے تھے۔ بس اب تو انہیں میری دی ہوئی سزا اتنی ہی ہوگی۔"

میرے اطراف جیسے دھما کے ہو رہے تھے لیکن آواز حلق میں پھنستی جا رہی تھی۔

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد وہ بولی۔ "نہیں بات یہ بھی نہیں کہ اس نے مجھ سے حقیقت کیوں چھپائی؟ شاید اس بات پر میں اسے سزا نہ دیتی لیکن اس نے عورت ذات کی جو توہین کی ہے، ایک سانولے رنگ کی لڑکی کو ریجیکٹ کر کے، اسی لیے میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔"

جانے اس طرف سے کیا کہا گیا مجھے تو سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں..... جب وہ میرے بارے میں شمی سے بات کرتا تو مجھے بہت مزا آتا۔ ویسے نمیرہ وہ سچ مچ مجھ سے بہت محبت کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی مجھے برا بھی لگ جاتا جب وہ شمی سے میرے لیے اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتا اور اب جب میں اس کھیل سے اکتا گئی تو اسے سزا دینے کی ٹھان لی۔"

میری تو وہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں..... کسی مریض کی طرح میں تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے دھندی چھا گئی تھی اگر میں کچھ دیر اور کھڑا رہتا تو پورے قد سے آن گرتا، سو گرتے پڑتے میں الٹے قدموں باہر آ گیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی مجھ میں نہ طاقت تھی نہ ہمت تھی۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ آخر کار میں ایک قریبی پارک کا بورڈ دیکھ کر وہیں گھس گیا۔

پارکنگ میں کار کھڑی کر کے میں بالکل کونے میں ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ پہلے تو کتنی دیر میں خالی الذہن ایک ہی نقطے پر مسلسل غور کرتا رہا تھا۔ ذہن کسی خالی سلیٹ کی مانند خالی تھا لیکن آہستہ آہستہ میں جیسے اس کیفیت سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر پہلے کی باتیں میرے ذہن میں کسی فلم کے سین کی طرح دوڑنے لگی تھیں۔ مجھے لگا، جیسے ربیعہ میرے قریب کھڑی ہو کر وہ سب باتیں کرنے لگی تھی۔ مجھے اب بھی سب کچھ سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ربیعہ اور شمی ایک ہو سکتی ہیں۔

اگر ربیعہ سچ مچ شمی ہے تو ربیعہ نے مجھے اپنا نام شبینہ کیوں بتایا تھا؟

میرے اندر بہت سارے سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔ پھر اچانک میرے اندر جھماکا سا ہوا۔ ایک دن شمی نے کہا تھا کہ اس کے لاتعداد نام ہیں جو اس کے تایا، پھپھو وغیرہ نے رکھے ہیں تو پھر اس کا اصلی نام ربیعہ ہوگا اور باقی نام جن رشتہ داروں نے رکھے ہیں، وہ ان ناموں سے اسے

بلاتے ہوں گے۔

اکثر خاندان میں کوئی بچہ یا بچی بہت لاڈلے ہوں تو اس کے ان گنت نام رکھے جاتے ہیں۔ خیر..... میں نے دل میں کہا کہ نام کو گولی مارو۔ اب اس مسئلے کو کیسے سلجھاؤں۔ اب تو شمی بھی نہیں تھی، جسے میں اپنی الجھن بتا سکتا۔

میں سوچ سوچ کر تھک گیا لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ربیعہ کو کیسے مناؤں؟ اور ایسا کیا کروں کہ میری سزا میں تخفیف ہو سکے۔

جب سوچ سوچ کر دماغ تھکنے لگا تو میں نے اچانک فیصلہ کیا کہ مجھے فی الحال گھر نہیں جانا چاہیے۔

مجھے یاد آیا کہ مجھے آفس کی طرف سے اسلام آباد بھیجا جا رہا تھا، جسے میں آج کل پر ٹال رہا تھا۔

آفس ٹائم ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں عجلت میں اٹھا اور آفس کی طرف روانہ ہو گیا اور سارے ضروری امور طے کر کے اسلام آباد چلا گیا۔

شام تک میں اسلام آباد میں تھا۔ میں نے گھر اطلاع کر کے کہہ دیا تھا کہ آفس کے کام سے مجھے اچانک اسلام آباد آنا پڑا ہے۔

اب مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت بھی مل گیا تھا۔ میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو جلد بازی میں ساری بازی الٹ ہو جائے۔ جب سے میری ربیعہ کے ساتھ شادی ہوئی تھی۔ میں اس سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے میری محبت میں ہر روز اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں بھلا اس سے بچھڑ کر کب زندہ رہ سکتا تھا۔

☆.....☆

اسلام آباد میں رہ کر بھی میں اپنے مسئلے کا حل نہیں ڈھونڈ پایا۔ مسئلے کا حل نہ سہی لیکن میری دہشتوں میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ مجھ پر بڑھتا ہوا شدید دباؤ کچھ

غزل

زمانہ ساز ہے ایسی اساس رکھے گا
وہ گھر سے دور مگر دل کے پاس رکھے گا

وہ داستان کسی اور کو سنائے گا
مرے لیے تو فقط اقتباس رکھے گا

وہ میرے شہر میں آئے گا میرا دل رکھنے
بھرم تو خیر، وفاشناس رکھے گا

اگر بہار کے موسم میں مجھ کو پا نہ سکا
تو ہارشوں کے زمانے کی آس رکھے گا

یہ اور بات کہ تنہائیوں میں خوں روئے
مچلتے وقت مکمل حواس رکھے گا

مجھے تو زعم رہے گا کہ ہو گیا میراب
کسی کے داسلے تھوڑی سی پیاس رکھے گا

مجھے نصیب نہ ہو، وہ مرے قریب تو ہو
یہ کیا ستم کہ مسلسل اداس رکھے گا

رفعت ناہید

کم ہو گیا تھا۔ اب میں ربیعہ کا سامنا کر سکتا تھا۔ اپنے دفاع میں کچھ بول بھی سکتا تھا۔ گویا وہ پہلے والی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ سو میں نے اسلام آباد سے واپسی کا قصد کیا۔

میں خوفزدہ سا گھر میں داخل ہوا اور نوکروں کے سلام کا جواب دے کر پہلے مما سے ملنے چلا گیا۔ مما ابھی ابھی گھر لوٹی تھیں۔ ان سے دو چار باتیں کر کے، میں نے تھکن کا بہانہ بنایا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

ربیعہ سے میں ابھی تک ملا نہیں تھا لیکن اتنا اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کچن میں مصروف ہوگی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ دس منٹ بعد کافی کا کپ لے کر آ گئی اور کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"کافی پیجیے.....!" وہ کپ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

میں نے کافی لے کر ڈرتے ڈرتے اس پر نظر ڈالی۔ وہ سنجیدہ لگ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ یعنی جب سے وہ مجھ سے ناراض ہوئی تھی تو وہ یہی رویہ اختیار کرنے لگی تھی۔ یعنی نہ تو چہرے پر مسکان تھی۔ نہ لہجے میں نرمی اور شگفتگی تھی۔ ایک منجمد سا لہجہ ہوتا تھا اس کا جو آج بھی قائم تھا۔

ایک ٹھنڈی ٹھنڈی آہ میرے اندر دم توڑ گئی۔

'کہاں جا کر ہمارے درمیان یہ فاصلے ختم ہوں گے؟'

'کب ختم ہوگی یہ چقلش ہمارے درمیان؟'

میں سوچوں کے گرداب میں پھنس کر چکرانے لگا تھا۔

رات کا کھانا بھی میں نے برائے نام کھایا۔ کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ مما نے کھانے کی افادیت پر مجھے لمبا چوڑا لیکچر دیا اور میرے سامنے ربیعہ سے کہنے لگیں۔

"ربیعہ بیٹا..... اپنے میاں کو Healthy اور اچھی خوراک دیا کرو۔ اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہ کرو..... دیکھو تو..... آج سعد نے کچھ بھی نہیں کھایا۔" مما کا اپنا ہی انداز تھا۔ پیار کا بھی اور خیال رکھنے کا بھی۔

"جی۔" وہ تابعداری سے کہنے لگی۔

مما تو خود بہت کم خوراک لیتی تھیں۔ موٹاپے کے ڈر سے وہ بہت کم کھانا کھاتی تھیں لیکن میرے کھانے پینے کا انہیں ہمیشہ بہت خیال رہتا تھا۔

☆.....☆

میں اپنے بیڈ روم میں بیڈ سے ٹیک لگائے بے دلی سے ٹی وی کے چینل اِدھر اُدھر کرتا رہا۔ آخر کار اکتا کر میں نے ٹی وی بند کیا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔ نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی ٹینشن ہی ٹینشن تھی۔

ربیعہ نے ہمیشہ کی طرح اپنے کام ختم کیے اور چھوٹا سا نیلا بلب جلا کر باقی سارے بلب بجھا دیے اور آ کر میرے برابر میں لیٹ گئی۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر آ جائے وہ ہمیشہ کی طرح بالکل چپ تھی لیکن میں آج چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

اس کے قریب کھسک کر میں نے پیچھے سے اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں کہا۔ "ربیعہ جان!! مجھے معاف کر دو۔ آئی ایم سوری۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں آپ؟"

میں دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے شمی کے بارے میں چھپالیا تھا نا..... اس لیے....."

اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اب کیا ظاہر کر رہے ہو۔ وہ تو مجھے خود ہی پتا چل گیا، ورنہ تم تو مجھے کبھی نہ بتاتے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جو اس کی کوشش کے باوجود نہیں چھوڑا تھا، آہستہ سے ہونٹوں سے لگایا اور بولا۔

"میں نے صرف تمہاری دلآزاری کے ڈر سے تمہیں شمی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ربیعہ تمہاری قسم اور کوئی بات میرے دل میں نہیں تھی اگر میرے اور اس کے بیچ کوئی تعلق ہوتا تو میں اس سے ہی شادی کرتا۔ کوئی پابندی تو نہیں تھی مجھ پر..... نہ مما کی طرف سے نہ کسی اور کی طرف سے۔"

وہ خاموش رہی۔ بس اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ "تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا؟"

اس کی خاموشی نے میرے اندر سناٹے بھر دیے تھے، کیسی چپ تھی اس کی جو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر کار تنگ آ کر میں نے ساری لگی لپٹی ایک طرف رکھی اور صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"دیکھو ربیعہ۔ اب تو ساری بات صاف ہو گئی ہے۔ شمی کا کوئی وجود نہیں ہے اور جس بندی کا کوئی وجود نہیں ہے اسے ہم کیوں وجہ تنازع بنائیں۔" میں بے ساختگی میں کہہ گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور عجیب سے تاثرات لیے میری طرف دیکھنے لگی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"میں جان گیا ہوں ربیعہ کہ تم اور شمی دو نام مگر ایک ہی شخصیت ہو۔ بس اب اس قصے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر شدید حیرت نمودار ہوئی۔ وہ بے یقینی سے مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی کہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد بھی بھول گئی۔

وہ دم سادھے مجھے دیکھنے لگی تھی اور میں اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے اسے رسان سے بتانے لگا کہ کیسے میں وقت سے پہلے آفس سے آ گیا تھا۔ جب وہ اپنی دوست یا کزن کبیرہ سے بات کر رہی تھی اور میں نے ساری حقیقت جان لی اور الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔ میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس لیے اسلام آباد چلا گیا۔ تین دن میں نے وہاں سوچتے گزار دیے اور اب تمہاری خدمت میں معافی کی درخواست دینے آیا ہوں۔

جتنی سزا میں نے جھیلی ہے ربیعہ..... وہ بہت ہے آئندہ اگر میں نے سانولی رنگت سے نفرت کی تو جو چور کی سزا..... وہ میری....."

وہ قدرے توقف سے تیکھے انداز میں بولی۔ "تو کیا سانولے رنگ سے محبت کرو گے؟"

"نن..... نہیں....." میں بوکھلا کر بولا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش میں اس کا گلابی رنگ سرخ پڑنے لگا تھا۔ چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا اور وہاں بڑا نرم سا تاثر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے قریب کیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

اس کے بالوں میں منہ چھپا کر میں جذبوں سے لرزتی آواز میں بولا۔ "آئی لو یو..... ربیعہ!!"

اس نے جواب تو نہیں دیا لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس نے میری سزا ختم کر دی ہے۔

میں نے ربیعہ کو اپنے سینے میں چھپا لیا تھا اور رات آہستہ آہستہ جھکتی جا رہی تھی۔ ہمارے پیار کا اثر ماحول پر بھی ہو گیا تھا۔ اندھیرے چھٹ گئے تھے اور ہماری محبت کی روشنیاں ہر طرف پھیل گئی تھیں۔

صبا نور

ایک نام میرے دل میں

میری محبت، شبنم کے قطرے کی مانند نازک، اَن چھوئی اور کومل تھی مگر اس محبت کے اختتام پر نارسائی کی آگ تھی، جس کی تپش اول روز سے میں محسوس کر سکتی تھی۔ تقدیر کا یہ کتنا بڑا مذاق تھا کہ تم مجھے جب ملے.....

یادوں کی ستم گری لیے ایک تحریر، افسانے کی صورت

تو تم جا رہی ہو نگین؟'' ہمایوں نے اپنے دل کا سارا درد نظروں میں سمو کر اس کی جانب دیکھا۔

اس نے جواباً ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں جانا تو تھا۔ ایک نہ ایک دن.....'' پارک میں لگے پام کے درختوں کے اس پار ایک سنہری شام ڈوبنے کو تھی اور اسے لگا جیسے آس پاس کا سناٹا اس کے اندر اتر رہا ہو۔

''سچ کہتی ہو، ایک نہ ایک دن تو ہمیں بچھڑنا ہی تھا اور یہ بات ہم دونوں ہی جانتے تھے پھر بھی آنکھیں بند کیے محبت کی شاہراہ پر قدم بڑھاتے رہے، ایک ایسی راہ پر چلتے رہے جس کی کوئی منزل ہی نہ تھی۔ مالو تو ایک دوسرے کو فریب دیتے رہے۔ محبت کا فریب! ہاہ! یہ محبت کا فریب، کیسا دل خوش کن ہوتا ہے نا!''

''فریب! نہیں تو..... یہ تو ایک اٹل حقیقت تھی، جو ہمیشہ تمہارے اور میرے درمیان سانس لیتی رہی مگر محبت خوش گمان ہے اور اسی وجہ سے زندگی کے حقائق سامنے کھڑے اکثر منہ چڑاتے ہیں اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ پلک جھپکتے ہی اس کی دنیا بدل جائے گی اور اس کی تمام خواہشات اس کے قدموں میں ہوں گی۔ ہماری محبت کا یہ سفر بھی ان ہی خاردار خوش گمانیوں سے الجھتے حقائق کی کڑی دھوپ سہتے اور خوابوں میں سفر کرتے گزرا ہے۔''

''ہاں خوش گمانی.....!'' ہمایوں نے شدتِ کرب سے لب بھینچے۔ ''اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ اس کا انت جدائی ہے۔ میرا اور تمہارا ساتھ ندی کے دو کناروں جیسا ہے اور یہ تو روزِ اول ہی روشن تھا۔ ہم دونوں ہی اپنی مجبوریوں سے بندھے تھے لیکن پھر بھی ہم نے تمام حقائق سے جانتے بوجھتے چشم پوشی اختیار کیے رکھی۔ یہ بات اور اس جیسی بہت سی باتیں..... دیکھی اَن دیکھی سی..... چاہی، اَن چاہی سی..... کسی ہوا کے نرم جھونکے کی طرح..... جو صرف محسوس ہوتا ہے، نظر نہیں آتا..... بے ریا، معطر و صاف ستھرا..... ہماری اسی محبت جیسا.....!''

''محبت!'' نگین پل بھر کو چونکی پھر سنبھل گئی۔ ''ہاں محبت.....'' اسے پل بھر کو ایسا لگا کہ پارک کی بوجھل فضا مکمل سی اٹھی ہے، کتنا دلکش لفظ تھا یہ محبت!

''یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بچھڑنے کا وقت ہے تو جان لبوں سے کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

''آج جب ہم نے اعتراف کر ہی لیا ہے تو آؤ آج گزرے وقت کی باتیں دہراتے ہیں بلکہ آج وہ سب ایک دوسرے سے کہہ دیتے ہیں جو ہم آج تک نہ کہہ پائے۔ تم مجھے اچھی لگتی تھیں اور شاید میں بھی تمہیں پسند تھا۔'' وہ اس بار دھیرے سے مسکرایا مگر پھیکی بے جان مسکراہٹ.....

''اچھا! صرف پسند تھے؟ تم میرے منہ سے کہلوانا چاہ رہے ہو؟''

''ہاں میں نے کہا نا، آج کہہ دو۔ ہر بات کہہ دو، جو ہم آج تک ایک دوسرے سے نہ کہہ پائے۔''

''تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں ایک جملہ کہا تھا؟ وہ جملہ شاید تم بھول گئے۔ میں نے کہا تھا کہ میری زندگی میں جو کچھ بھی ہے اس میں سب سے زیادہ عزیز مجھے تم ہو اور یہ ایک حقیقت ہے؟''

''ہاں! مگر ایک تلخ حقیقت..... اور اس جیسے دیگر تلخ حقائق کی بنا پر ہی ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ہم صرف دوست ہیں مگر محبت ایک خود رو پودے کی طرح خود بخود اور غیر محسوس طریقے سے پنپتی رہی۔ کتنی عجیب بات ہے نا! ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور یہ بات ہم دونوں ہی جانتے تھے مگر کبھی کہہ نہ پائے، بس ایک دوسرے کو دوستی کا فریب دیتے رہے۔''

”محبت، فطری جذبہ ہے اور یہ بھی فطرت کا اصول ہے۔ فنا ہو یا بقاء۔ کبھی اچانک رونما نہیں ہوتی۔ کلی سے پھول بن کر رفتہ رفتہ مرجھا کر شاخ سے جھڑ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی بھی جذبہ اچانک ہمیں اسیر نہیں کرتا۔ ہمارے درمیان محبت بھی اسی طرح آہستہ آہستہ نمو پاتی رہی تھی۔“

”سنو! تم نے گزرے وقت کی بات کی ہے۔ آج یکم اپریل ہے۔ یاد ہے نا آج کی تاریخ!“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں! مجھے خوب یاد ہے یکم اپریل کو ہم پہلی بار ملے تھے اور کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے ملنے اور بچھڑنے کا دن ایک ہی ہے۔ اس دن جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہنگامی حالات میں سڑک کے کنارے کھڑی خوفزدہ سی لڑکی کو میں نے لفٹ دی تھی تو گمان تک نہ تھا کہ یہ لڑکی میری زندگی کا عنوان بن جائے گی۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”شاید اس لیے کہ میں بہت عام سی لڑکی ہوں۔ اتنی عام کہ جسے کوئی مرد محض ایک نظر دیکھ کر گزر جاتا ہے ورنہ کاہے کو اتنی عمر گزرتی...... بھلے رشتے کی آس میں، آخر کار ہر امید کھو کر اب عبدالقدیر جیسے عام، دو بچوں کے باپ رنڈوے مرد کا رشتہ قابلِ قبول ٹھہرتا۔“ نگین کے لہجے میں تلخی اور لبوں پر استہزاء اُمڈ آیا۔

”نہیں، تم بہت خاص الخاص ہو۔ صرف اس لیے کہ مجھ میں اور تم میں عمروں کا واضح تفاوت تھا۔“ اس نے مسکرا کے کہا۔

”محبت سراسر احساسات کا سودا ہے۔ یہ کب اور کس کے لیے ہمارے اندر سر اٹھا جائے۔ ہم کب بااختیار ہوتے ہیں۔ پھر یہ تفاوت کیا معنی رکھتا ہے۔ اپریل کی نرم و گرم سی شام گویا ایک حوالہ تھی، ہمارے اگلے مراسم کی...... وہ ایسی ہی تو سرمئی شام تھی، مہکی مہکی...... نیم گرم سی...... جب ہماری محبت کی پہلی بنیاد پڑی تھی۔“

”مجھے خوب یاد ہے۔ تمہاری دلکش آنکھوں میں ڈھلتے وقت کے سبب ہراس اُمڈ آیا تھا۔ شاید اسی لیے میری لفٹ کی آفر پر تم نے زیادہ سوچ بچار سے کام نہ لیا...... اور میری گاڑی میں بیٹھ کر جیسے ہر ہراس مٹ سا گیا تھا۔ تم قدرے پُرسکون نظر آئی تھیں۔“

”تم تھے ہی اتنے سوبر باوقار کہ دل کو کوئی برا خیال چھو کر بھی نہ گزرے اور اسٹیئرنگ پر رکھے تمہارے سونے جیسے ہاتھ بار بار میری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے...... کوئی خصوصیت تھی ان ہاتھوں میں...... سونے جیسی رنگت کے دلکش بھرے بھرے ہاتھ...... پہلی نظر میں بڑے قیمتی محسوس ہوتے تھے۔ سنا ہے ایسے ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ بہت نوازتا ہے مگر ان ہاتھوں میں رکتا کچھ نہیں، سب کچھ پھسل جاتا ہے۔“

”ہاں، ان ہاتھوں کی لکیریں بار بار دغا دیتی ہیں۔ قسمت ہر بار پھسل جاتی ہے۔ جیسے آج تم...... تم مجھ سے دور جا رہی ہو، خیر تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

”ہماری محبت کی بنیاد تو شاید جب پڑی تھی جب میں نے تمہیں پہلا فون کیا تھا شکریہ کا...... تمہیں یاد ہے ناں پہلی ملاقات میں تم نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا؟“

”ہاں یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تمہاری کال کے جواب میں، میں نے تمہیں کال کی تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ تمہارے Massages، کالز ہر موقع پر مجھے وش کرنا، میری سالگرہ کا دن یاد رکھنا، مجھ پر تمہاری چاہت کے راز عیاں کر کے اس احساس کو بڑھا گیا اور بھلا کسے برا لگتا ہے چاہنا یا چاہے جانا؟“

”تب تمہاری بیوی، تمہاری فیملی کا خیال بار بار

میرے قدم روکتا مگر میں اپنے جذبوں میں بھی بے اختیار تھی۔“

”حق ہاں! فیملی......؟“ ہمایوں نے استہزائیہ ہنسی لیے اس کی طرف دیکھا۔ ”ساتھ چلنے والے دو الگ الگ راہوں کے مسافر، اگر جیون ساتھی کہلائے جاسکتے ہیں تو بصد شوق کہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اٹھارہ سالہ ازدواجی زندگی میں، میں سکون کو ترس گیا ہوں۔“

”اس وقت تمہارے ذاتی حالات سے میں لاعلم تھی مگر تمہاری ازدواجی حیثیت کے سبب ہی میں لبوں پر قفل ڈالے رہی تھی۔ شاید اسی لیے ایک عرصہ تمہیں چاہنے کے باوجود اپنے جذبے تم پر عیاں نہ کرسکی مگر کچھ وقت گزرا تم خود ہی بھانپ گئے۔“ نگین آج جیسے سب کچھ دہرانا چاہتی تھی، یاد کرنا چاہتی تھی۔

”تم نے سنا نہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایک انسان بلاوجہ کسی غیر متعلقہ انسان کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے زیرِ نظر کچھ نہ کچھ محرکات ضرور ہوتے ہیں۔“

”میری محبت شبنم کے قطرے کی مانند نازک، اَن چھوئی اور کومل تھی مگر اس محبت کے اختتام پر نارسائی کی آگ تھی، جس کی تپش اول روز سے میں محسوس کرسکتی تھی۔ یہ تقدیر کا کتنا بڑا مذاق تھا کہ تم مجھے جب ملے، جب تم کو میری ضرورت نہ تھی۔“

”اگر تم اس وقت مل جاتیں تو بلاشبہ میں اعتراف کرلیتا کہ میری زندگی میں تم جیسی کسی لڑکی کی کمی تو تھی جو مجھے بھرپور محبت سے نوازتی کہ میرے پاس سب کچھ تھا، بس ایک محبت کی ہی کمی تھی۔“

”میں سمجھتی ہوں، ایک وقت آتا ہے کہ مرد کی حیثیت معزول حکمراں کی سی رہ جاتی ہے۔ عورت کی

غزل

میری رُوداد ہے کہ آئینہ
یہ کوئی یاد ہے کہ آئینہ

ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا
دل کی فریاد ہے کہ آئینہ

جسم و جاں دیکھ کر لرزتے ہیں
کوئی اُفتاد ہے کہ آئینہ

دلِ درویش کچھ بتا تُو ہی
عشق آباد ہے کہ آئینہ

کوئی بتلاؤ سامنے میرے
میرا ہمزاد ہے کہ آئینہ

شبیر نازش

حیثیت زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اولاد جوان ہو جائے تو عورت کے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ باپ کا کردار پھر ثانوی بلکہ غیر اہم رہ جاتا ہے پھر وہ خود ترسی یا احساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اور مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھے اس احساس تنہائی سے باہر نکالا، مجھے چاہت کا مان بخشا، اس حد تک کہ میں بھول گیا کہ میں جوان بچوں کا باپ ہوں۔ میں جانتا ہوں، اس عمر کے تفاوت کو غیر محسوس بنانے کے لیے تم مجھے قصداً "تم" کہہ کر مخاطب کرتی ہو تا کہ میں اپنے اور تمہارے مابین عمروں کے فرق کو بھلا دوں۔"

"اور اس لیے بھی کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھو!"

"تم نے مجھے پہلی بار "تم" کہا تو مجھے بہت اچھا لگا اور پھر انجانے ہی میں تعلق بنتا چلا گیا۔"

"ہاں تمہارا ساتھ بلکہ تمہاری ساری شخصیت...... خصوصاً تمہارا لب و لہجہ، شائستگی، تہذیب۔ عورت کو عورت سمجھ کر عزت دینا...... یہ خوبیاں بہت کم جگہ یکجا ہوتی ہیں۔ ہم میں دلی اور جذباتی طور پر فاصلے کم ہوئے مگر تم نے کبھی تہذیب کا دامن چھوڑا، نہ اس شائستگی و تہذیب کو ہاتھ سے جانے دیا۔" نگین کے لہجے میں اعتراف تھا۔

"محبت بہت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ جو سستی خواہشات کو محبت کا نام دے کر نفس کی تسکین کیا کرتے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے تم سے نہایت صاف و شفاف اور سچی محبت کی ہے۔ تمہارا حصول ناممکن ہے تو یہ بھی تقدیر کا فیصلہ ہے۔"

"ہاں! اسٹیٹس کا تضاد، عمروں کا فرق، گھریلو اور معاشرتی مجبوریاں۔ یہ سچی محبت کا نصیب ہے کہ وہ ناممکن حالات میں جنم لیتی اور پنپتی ہے ورنہ شاید کوئی رومانوی کہانی جنم نہ لیتی بلکہ عظیم رومانوی کرداروں کے ناموں سے بھی دنیا ناواقف ہوتی......"

"تم سچ کہتی ہو، یہ معاشرتی تضاد، ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں، جن کاموں میں شرعی قباحت نہ ہو، ان سے انکار مصلحت و مجبوری ہی تو ہے، وگرنہ دنیا کے کسی قانون کی رُو سے میرا اور تمہارا ملن غلط نہیں ہے۔" "ہم نے کبھی ایک دوسرے کو پانے کی سعی نہ کی تو ہمارے درمیان مجبوریاں ہی تو تھیں۔"

"ہاں، میں ایک عام سی لڑکی...... جو باپ کے گزر جانے کے بعد کنبے کی کفالت کا بوجھ اٹھانے پر مجبور، تم ایک باحیثیت شادی شدہ مرد...... زمین و آسمان کا تضاد ہے...... مگر تمہاری محبت نے مجھے تقویت دی تھی۔ حوصلہ، امید اور خوش گمانی بھی...... اور میرے لیے قدم واپس موڑ لینا کبھی بھی سہل نہیں رہا۔ اگرچہ یہ حقائق کسی عفریت کی طرح ہمیشہ میرے اندر پنجے گاڑے بیٹھے رہے۔ لاشعور کسی امکان کے سبب بار بار جنہیں رد کرتا رہا مگر ایک امید...... ہاں ایک امید ہمیشہ زندہ رہی۔"

"آج تم نے اعتراف کر ہی لیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ محبت کے لیے تمہارا نظریہ کیا تھا؟"

"میرا ایمان تھا کہ محبت ہو گی تو بس ایک بار اور ایک بندے سے...... جو جائز ہو گی اور مجھے محبت ہوئی بھی تو کس سے......؟ تم سے......؟ مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ایسا رشتہ اس وقت میرے گھر آ جاتا تو بہ یک جنبش ابرو رد کر دوں۔ سچ ہے، انسان کو دعویٰ تو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ جب وہ اپنی زندگی کے ایک لمحے کا بھی مختار نہیں تو اس کا دعویٰ، اس کا غرور ہی رہا نا۔"

"چار بچوں کا باپ عمر رسیدہ نہ بھی ہو تو خود کو

بوڑھا محسوس کرتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ میں محبت کا اسیر تھا۔ میرے آس پاس میری فیملی ہوتی اور دل میں تم...... دماغ میں تمہارا خیال...... یہ محبت دنیا سے اتنی متضاد کیوں ہوتی ہے؟ ایسے ہی لمحات نے مجھے باور کروایا کہ تم سے...... صرف تم سے میرا دل کا رشتہ تھا، باقی سب تو بس دنیا داری......"

"میری زندگی میں جو کچھ تھا یا ہے، تم ان میں عزیز تر اور اول درجے پر تمہاری چاہت ہے۔ میں پل بھر کو سوچتی تو ایک عجیب سا احساس ہوتا، جیسے میں کسی مضبوط گھر کی دیوار میں دراڑ ڈال رہی ہوں۔ کئی بار رستہ بدلنے کا سوچا اور دونوں رابطہ نہ کیا مگر خود بھی بہت ڈیپریس رہی۔ ہو ہی نہ پایا۔ دل کو ایک خلش سی گھیر لیتی۔ تم سے ملنا ناممکن نظر آتا اور کسی کے لیے بھی دل آمادہ نہ ہوتا تب تھک ہار کر میں نے فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔"

"تقدیر! ہاں ہم سب کی پیشانیوں پر درج ایک اٹل حقیقت...... ہم چاہیں بھی تو اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ محبت اور تقدیر میں اتنا بیر کا ہے کا ہے، نگین۔"

"کاش کہ تم نے دنیا سہی ہوتی، جاب کر کے، اپنے کنبے کی کفالت کرنے والی لڑکی کو دنیا کی کیا کیا باتیں سننی پڑتی ہیں۔ میرے سر میں دھوپ بھرتی جا رہی تھی اور لوگ اماں کو کہتے کہ انہوں نے کمائی کھانے کے لیے بیٹی کو بٹھا رکھا ہے۔"

"ہاں اور تمہاری اماں مجبور ہو گئیں، جو ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر تمہیں بیاہنے کو...... اور محبت کے انجام پر ازل سے قربانی ہی درج ہوتی چلی آئی ہے۔" ہمایوں کا لہجہ تلخ ہو چلا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ کسی کے نہ ہونے سے وقت ٹھہر نہیں جاتا، کسی کے کھو جانے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ جب ابا گزرے تھے، تب ایسا ہی لگا تھا، جیسے

غزل

بات گو زندگی سے لمبی ہے اور سُنانی ہے ایک مصرعے میں
دیکھ حرفوں میں باندھ لایا ہوں، زندگانی ہے ایک مصرعے میں

کچھ حوالے ہیں میرے ماضی کے، عمرِ رفتہ کی بات ہے اِس میں
میرے بچپن کے چند قصے ہیں اور جوانی ہے، ایک مصرعے میں

ہیں تو دونوں الگ مگر پھر بھی، نامکمل ہیں ایک دُوجے بن
تیرا لہجہ ہے ایک مصرعے میں، میری رانی ہے ایک مصرعے میں

تیرے غم میں ڈبو کے لکھی ہے، آنسوؤں میں بھگو کے لکھی ہے
دیکھ پُوری غزل نہیں سُوکھی، دیکھ پانی ہے ایک مصرعے میں

عشق میں جو کتاب لکھتے ہیں اور ہوں گے وہ میں نہیں عاطف
اپنی برسوں کی جو کمائی ہے، چھوڑ جانی ہے ایک مصرعے میں

عاطف جاوید عاطف

زندگی ٹھہر گئی بلکہ ختم ہوگئی لیکن میں آج بھی زندہ ہوں۔ یہ زندگی کسی نکتے پر ختم نہیں ہوتی۔ بڑی مستقل مزاج وحیلہ ساز ہوتی ہے، ہزار بہانوں سے انسان کو اپنی جانب گھسیٹ لیتی ہے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

غروب ہوتے سورج کی سرخی آسمان پر بکھری پڑی تھی۔ چڑیاں اپنے ٹھکانوں کو شور مچاتے لوٹ رہے تھے۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ اس کی مٹھی میں مقید آس کے ڈھیروں ڈھیر جگنو آزادی کے لیے تڑپ رہے تھے مگر ہمایوں ایک بار پھر اسے زادِ راہ تھمانے کے درپے تھا۔

''ہاں! مگر ایک خلا سا رہ جاتا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوتا۔ انسانوں کا نعم البدل اتنا سہل ہوتا تو شاید کبھی کوئی کسی کے بچھڑنے پر نہ روتا۔''

''شاید ایسے ہی وقتوں میں تقدیر اپنے آپ کو منواتی ہے۔ انسان کو زندگی میں سب ہی کچھ حسب خواہش نہیں ملا کرتا۔'' نگین نے سر جھٹک کر نئے امکان کو رد کیا تھا۔

رستہ آگے بھی بڑا خاردار تھا۔ وہ خواہشوں کے بھنور میں پھنس جاتی تو سفر مشکل ہوجاتا۔

شاید اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا ہے.....

محبت کرنے والے دل سدا نا شاد رہتے ہیں
محبت اک پرانی بددعا معلوم ہوتی ہے

اس نے سگریٹ لبوں میں دبا کر سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر دھواں فضاؤں کے سپرد کیا۔ بیچ کے دوسرے کونے پر بیٹھی نگین کی نظروں کے سامنے پل بھر کو اس کا سراپا دھندلا ہو کر پھر واضح ہوا تھا۔

''انسان ہزار لوگوں سے ملتا ہے، ربط رکھتا ہے مگر محبت تو بس ایک ہی سے ہوتی ہے۔'' اس کے لفظ اس کے لیے مرہم بنتے جارہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے اہم ہوتا ہے، اسے ہر کسی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔''

''تم اگر کہتی ہو تو مجھے بھی اعتراف ہے، میرے قدم تو بس مجبوریاں روکتی رہیں۔ اسٹیٹس کو میں نہیں گردانتا مگر معاشرتی اور گھریلو مجبوریاں..... ایک فساد کھڑا ہو سکتا ہے اور تمہارے مشاہدے کے عین مطابق میری حیثیت کمزور ہے۔'' معاشرہ اور خود میرے اپنے مجھے مجرم قرار دے کر قرار واقعی سزا سنا دیں گے۔ وگرنہ شرعاً ممانعت نہیں، تم درست کہتی ہو۔'' وہ شاید خود کو بھی سمجھا رہا تھا۔

''بات معاشرتی ہے تو انسانیت کی رُو سے میں بھی کسی عورت کے احساسات کی پامالی کو ناقابلِ معافی گناہ سمجھتی ہوں۔ یہی وہ حالات تھے جو میرے اور تمہارے درمیان اونچی اونچی فصیلوں کی مانند حائل رہے اور جن کے سبب بارہا میں نے چاہا کہ رستہ بدل لوں، تمہیں بھول جاؤں مگر ایسا سوچتی بھی تو لگتا کہ دل کی رگیں کٹتی جارہی ہیں۔ جب انسان کسی رستے پر سفر کرتا ہے تو یکدم راہ بدلنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ میں نے کہا نا! انسانی زندگی میں سب کچھ یکدم اور اچانک نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح کسی کو الوداع کہنے سے پہلے اسے آہستہ آہستہ جدائی کے لیے تیار کر لینا ہی بہتر ہے۔''

''یہی وہ حقائق تھے، جن کے سبب آغاز میں ہی میں نے تمام حالات سے پردہ اٹھا کر تمہارے قدم روک دینے چاہے تھے۔'' ہمایوں نگین کو نہ جانے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

''میرے نزدیک انسانوں کا ربط رب کا ودیعت کردہ ہے۔ ہم کب کس سے ملیں گے اور یہ ربط کہاں تک پہنچے گا، یہ امر صرف رب کا طے کردہ ہے۔ تم رب کا ودیعت کردہ انعام تھے پھر میں خود

سے منہ کیوں موڑتی؟ میں سوچتی تھی، میں رب نے راہیں یکجا کی ہیں، ممکن ہے دائمی ملن کی بھی کوئی سبیل رکھی ہو۔'' نگین نے وضاحت کی۔

''تم نے ٹھیک کہا، ہمیں ملنا ہے کہ بچھڑنا ہے۔ یہ فیصلہ وقت کو کرنا تھا اور فیصلے کا وقت آگیا ہے۔ حالات نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ ہمیں بچھڑنا ہے۔'' اس نے گویا فیصلہ دے دیا۔

''یہ زندگی کا کارواں ہے جو یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ دو لوگ ملتے ہیں، ساتھ چلتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں مگر کبھی کبھی کوئی ہم میں رہ جاتا ہے اور کسی میں ہم.....'' نگین نے شدتِ کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔

''ہاں لیکن ہمیں تقدیر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو ایک حقیقت ہے۔ انسان کے خوابوں اور خواہشوں کے درمیان در آنے والی ایک اٹل حقیقت، شاید اسی لیے، کسی دانشور نے کہا ہے کہ خواب دیکھیے، ضرور دیکھیے مگر یہ یاد رکھیے، تقدیر کو آپ کے خوابوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' ہمایوں کو اعتراف کرنا پڑا۔

''خواب تو محض سراب ہوتے ہیں یا فریب اور محبت بھی تو خوابوں اور خواہشوں سے گندھی ایسی ہی کوئی لاحاصل شے ہے۔ کوئی دل خوش کن خواب، جس کی تعبیر الٹ تھی۔'' اس کے لفظوں میں کڑواہٹ سمٹ آئی تھی۔

''اگر یہ خواب تھا تو بہت سہانا اور فریب تھا تو نہایت دل کش۔'' ہمایوں نے ایک اور کش لے کر دھوئیں کے مرغولے فضا کے سپرد کیے۔

''ہاں مگر خواب کی ایک مدت ہوتی ہے بالآخر آنکھ کھل ہی جاتی ہے اور خواب ٹوٹ جاتا ہے۔''

''مگر محبت ہمارے اندر کو کاٹتی، ہمیں دھیرے دھیرے کھوکھلا کر کے فنا کرتی کسی شے کا نام

غزل

میں تیری محبت سے مکر بھی نہیں ہوں
لیکن میں خود وفا کا پیکر بھی نہیں ہوں

ہے لاکھ خامیوں کا مرقع میرا وجود
پوشیدہ رکھ لوں خود کو' باہنر بھی نہیں ہوں

جینے کی ادا سیکھنے کی خو کم' بہت ہے کم
ہوں خود سے آشنا' بے خبر بھی نہیں ہوں

ہے جاننا زمانہ بھی کیا میں' کیا میری ذات
میں ماہ رو و دلنشیں' دلبر بھی نہیں ہوں

ہو میرے لیے کوئی فنا' خوش فہم نہیں
میرے ہو ہمقدم کوئی' رہبر بھی نہیں ہوں

آنکھوں میں خواب بُن کے تو رہنا بھی عبث ہے
میں دھندلی کسی یاد کا منظر بھی نہیں ہوں

زمرّ نعیم

ہے..... یہ لاحاصل چاہت نہ انسان کو جینے دیتی ہے نہ مردوں میں شمار رکھتی ہے۔"

"ہاں چاہت..... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ چاہت مجھے اندر سے خالی کر چکی ہے۔ میرے پاس کسی اور کو دینے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ خواہ وہ عبدالقدیر ہو یا کوئی اور بھی۔" اس کے لہجے میں زمانوں کی تھکن امڈ آئی۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔" ہمایوں نے مبہم سا احتجاج کیا۔ "تمہیں نئے رشتے کو خلوصِ نیت کے ساتھ اپنانا چاہیے۔"

"میں نے اپنی محبت زندگی کے ساتھ کے لیے ہی سنبھال کر رکھی تھی مگر وہ محبت میرے نصیب میں، میرے ارادوں سے قبل لکھی تھی اور میں بھی اس پر قادر نہ تھی مگر میں اپنی سوچ پر اب بھی قائم ہوں۔ اپنے حصے کی محبت میں بھگتا چکی ہوں، اب تو بس گزارہ کرنا ہے۔ سمجھو ایک رشتے کو نبھانا ہے۔" وہ بے بسی سے مسکرائی۔

"یہ سراسر زندگی سے فرار اور رشتوں کی راتی سے انکار ہے نگین! تمہیں سب کچھ بھول کر ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہوگا۔"

"تمہارے پاس تو زندہ رہنے کے اور کئی جواز ہوں گے مگر میں شاید اب اپنی زندگی نہ جی سکوں۔" نگین نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "میں اپنے آپ کو تو بھول سکتی ہوں مگر آپ کو نہیں....."

"پھر آپ کو.....؟" اس نے ایک بار پھر احتجاج کیا۔

"ہاں، جس طرح ہم نے آپ سے تم تک کا فاصلہ طے کیا تھا اسی طرح ایک بار پھر ہمیں اپنے قدم موڑنے ہوں گے۔ ایک دوسرے کو سب کچھ لوٹانا ہوگا۔ اپنے پاس رکھنی ہیں تو صرف یادیں..... جو آئندہ کے سفر کو سہل بنانے کے لیے زادِ راہ ہیں۔"

"آج تم جانے کی بات کرتی ہو تو لگتا ہے کہ جیسے میرا اندر بھی خالی ہوتا جا رہا ہے اگرچہ یہ امر بعد از قیاس نہ تھا مگر وجود کو فنا ہے۔ تب ہی تو مٹی میں مل جاتا ہے مگر محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یاد کے طاقچے پر محبوب کے نام کا دیا سدا روشن اور جاوداں رہتا ہے۔"

"یہ محبت ہی تو ہے جو کفر سے جا ملتی ہے۔ دل میں رب کی لگن کو کم کر کے عشقِ مجازی میں ڈبو دیتی ہے۔ جتنی لگن ہم محب کے لیے رکھتے ہیں، رب کے عشق میں ڈوب جائیں تو کامل ہو جائیں مگر محبت کی اصل روح کیا ہے، یہ ہم تب جان پاتے ہیں جب کسی عزیز از جان ہستی کو کھو کر پھر صبر و قرار کے لیے اُسی رب کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔" نگین کی آنکھیں یک بہ یک کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آنے لگی تھیں۔

اس کے کپکپاتے لبوں سے بہت کچھ ادا ہونے کو بے قرار تھا مگر سارے لفظ جیسے ٹوٹ کر بکھر گئے۔

"مجھے لگتا ہے، تمہاری یہ چاہت میری جان لے لے گی نگین۔"

"اور تمہاری محبت نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔" وہ آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو تم جا رہی ہو؟" اسے لگا جیسے آج وہ اپنا سب کچھ لٹا کر فقاش ہونے جا رہا ہو۔

"ہاں، جانا تو تھا۔" نگین نے تھکے تھکے قدم آگے بڑھا دیے۔

شام نے اداسی سے آج پھر جدائی کے لمحات کو ایک بار پھر اپنے اندر سمیٹ لیا۔

رنگ فسانہ

محمد تقی

روشنی کے سامنے

اُس کی تو دنیا ہی کچھ اور تھی۔ وہ ایسی دنیا میں تھا، جہاں انسان کو محض ایک ہی شے نظر آتی ہے۔ اس کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، سونا جاگنا، سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کا سب کچھ محض ایک نگاہِ التفات، اک ادائے دلبری کے.....

عشق کی ایک کتھا، افسانے کی صورت.....

ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی کی لائبریری میں ہوئی تھی۔ وہ ایم کام کر رہا تھا۔ جب کہ وہ نفسیات میں ایم اے۔ سو ان دونوں کا تعلق کلاس فیلو کی حیثیت سے تو نہ تھا۔ البتہ ایک ہی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہونے کے ناتے ایک دوسرے سے گاہے بہ گاہے ملاقات ضرور ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ موبائل فون نے بھی اب رابطے بہت آسان کر دیے ہیں۔ محض ایک بٹن کو کلک کرنے کی دیر ہوتی ہے۔

مزید آسانیاں ان کے پیکجز نے کر دی ہیں۔ چاہے کتنی دیر بات کرو۔

ان دونوں کے مابین اس تعلق کو گزرتے ہوئے وقت نے عشق کا وہ لبادہ اوڑھا دیا تھا جو اس حاضر عہد میں عنقا ہے۔ کیونکہ اس نوع کے تعلقات نے آج کل کافی بے ہودگی اختیار کر لی ہے مگر وہ دونوں اس ضمن میں حیرت ناک حد تک سیریس تھے۔

دونوں کی تعلیم جب مکمل ہوئی تو انہیں یونیورسٹی کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں سے نکل کر سلمان نے بینکنگ کا ایک کورس کیا جس کے بعد قسمت سے اسے ایک ملٹی نیشنل بینک میں ملازمت مل گئی جب کہ عینی پیا ملن کی آس وانتظار میں گھر بیٹھ گئی۔ اس تعلق نے ان دونوں کے طور طریقے بدل ڈالے تھے۔ خاص طور پر سلمان کے...... نئی نئی ملازمت ہونے کے باعث بینک میں تو وہ ڈیوٹی ٹھیک طریقے سے سرانجام دے رہا تھا مگر اس سے ہٹ کر اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ شیو بڑھی رہے یوں بھی تو آج کل یہ فیشن میں ہے۔ کب کھایا اور کتنا کھایا کچھ ہوش نہیں۔

''آج کل کس چکر میں ہو؟'' امی اکثر پوچھتیں۔

''یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے تم نے اور کھانے پینے کا بھی کچھ ہوش رہتا ہے؟ صحت تو دیکھو ذرا اپنی۔''

وہ امی کی بات سنی ان سنی کر دیتا۔

اس کی تو دنیا ہی کچھ اور تھی۔ وہ ایسی دنیا میں تھا جہاں انسان کو محض ایک ہی شے نظر آتی ہے۔ اس کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، سونا جاگنا سب ہیچ ہوتا ہے۔ اس کا سب کچھ محض ایک نگاہِ التفات اک ادائے دلبری کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔ دنیا اور دنیا داری اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ عشق ایک ایسی آگ ہے جو سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے دل ہی بچتا ہے فقط یوں کہ اس پہ تصویرِ یار ہوتی ہے۔ عشق ایک ایسا دریا ہے جس کا کوئی کنارا نہیں ہوتا۔ اس میں اترنے والے کو ساحل فراموش کر دینا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا نور ہے جس میں ماسوائے اپنے محبوب کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایسا سفر ہے جو محبوب کے در سے شروع ہو کر اسی کے در پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا خواب ہے جو کبھی ٹوٹتا نہیں۔ چاہے وقت کا سورج ڈوبتا ابھرتا رہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرکار ایک افسانے میں ڈھل جاتی ہے۔ عشق ایک ایسا پنچھی ہے جو دل کے آسمان پر اڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا شجر ہے جس کی جڑیں دل میں ہوتی ہیں جو نمو کے بعد پورے وجود کو جکڑ لیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ سلمان کا وجود بھی اسی سحر میں جکڑ چکا تھا۔

''امی پوچھ رہی تھیں، مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' ایک دن وہ عینی سے بولا۔

''کہہ دیتے، عشق ہو گیا ہے۔'' اس نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

''ایسا کیسے کہہ دیتا۔'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

''سچ بولنا بری بات ہے کیا؟'' عینی اترائی۔

''تم اپنی امی سے یہ کہہ سکتی ہو؟'' سلمان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کا لہجہ سچائی لیے ہوئے تھا۔

''کیوں؟'' سلمان نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''میں لڑکی ہوں۔'' عینی کی آواز دھیمی تھی۔

''واہ! یہ تخصیص تم نے خوب کہی۔'' سلمان شوخی سے بولا۔

''میں کون ہوتی ہوں۔ یہ تخصیص، اس معاشرے کا طرہ ہے اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ تم یہ بتاؤ تمہاری امی اور کیا کہہ رہی تھیں۔'' عینی نے موضوع بدلا۔

''میں اپنے حال حلیے کا خیال نہیں رکھتا۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے۔'' سلمان نے تفصیل بتائی۔

''تم اتنے اپ ٹو ڈیٹ اور پیٹو کب تھے۔ کم از کم یہ بات مجھے بھی معلوم ہونی چاہیے۔'' عینی نے پوچھا۔

''بہر حال میں ان معاملات میں کبھی اتنا لاپروا بھی نہیں رہا۔'' سلمان نے وضاحت کی۔

''تو میں نے تم سے کہا کہ تم مجنوں بنے گھومتے رہو۔ میں نے روکا ہے تمہیں کھانے پینے سے۔'' عینی نے ناراضگی سے کہا۔

''اور ہے کون؟'' سلمان رومانوی انداز میں بولا۔

''میں ہی ہوں موردِ الزام، عینی بھی رومینٹک ہو گئی۔ تم تو جیسے......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر بولی۔

''میں لڑکی ہوں نا۔ ضبط تو جیسے مجھ پر ہی لازم ہے۔ کچھ بھی گزرے مجھ پہ۔ عیاں کسی طور نہ ہو۔ یہی رہی نا ہمیشہ میری صنف کی صفت۔'' عینی نے چہرے پر ہوا سے بکھرتے بالوں کو سمیٹا۔

سلمان چند لمحے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کا ہاتھ (پہلی بار) تھامتے ہوئے بولا۔ ''آئی لو یو...... آئی لو یو مائی ڈیئر عینی آئی لو یو۔''

عینی نے حیا سے پلکیں جھکا لیں اور بولی۔ ''آج یہ ہاتھ تھاما ہے نا تو......'' حیا پھر غالب آ گئی اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہ ہاتھ میری زندگی ہے۔'' سلمان بولا۔ ''اسے چھوڑوں تو زندگی چھوڑوں۔''

عینی نے حیا سے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر سلمان کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں محبت کے دیے جل رہے تھے۔

☆......☆

عشق و محبت والے معاملے میں وہ دونوں رجعتی ہو گئے تھے۔ انہوں نے تاریخ کا پہیہ الٹا گھما دیا تھا۔ دنیا کیا سے کیا ہو گئی تھی اور وہ پیار کا راگ الاپ رہے تھے۔ دنیا ملاوٹ کر رہی تھی، کم تول رہی تھی، ناجائز منافع لے رہی تھی۔ استحصال کر رہی تھی، خون چوس رہی تھی۔ ایک دوسرے کو دھوکا دے رہی تھی۔ جھوٹ بول رہی تھی۔ سیاست کر رہی تھی۔ جوڑ توڑ کر رہی تھی باہم دست و گریباں ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے کا خون کر رہی تھی پیار کو پامال کر رہی تھی۔ محبت کا تمسخر اڑا رہی تھی اور وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ کتابِ عشق کے ورق الٹ رہے تھے، ان میں لکھے پرانے سبق پڑھ رہے تھے۔

''یہ عشق ہے کیا؟'' عینی نے ایک دن سلمان سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' سلمان نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' عینی نے حیران ہو کے پوچھا۔

''غور کیا تو اور کچھ نہ کر سکوں گا۔'' سلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ڈھونڈتی ہی رہو گی مجھے تم اور میں کسی فلسفی کی طرح استغراق میں گم اس کی EXPLAINATION (وضاحت) میں الجھا رہوں گا۔''

''میری خود سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کچھ۔ سمجھنے کے لیے غور کرتی ہوں۔ بہت کچھ پڑھتی ہوں۔ مثلاً غالب کو بھی پڑھا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس کا ہر شعر ہر بار ایک نئے مفہوم کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ سوچتی ہوں۔ کبھی کسی نے مجھ سے اس عمل کی

مٹی کے رنگ

جہانِ خاک کی پہچان' اسم ہے گویا
ہزار طرح کا جس میں طلسم ہے گویا

ہم اپنے آپ سے گزرے تو یوں ہوا محسوس
حدودِ جسم سے آگے بھی جسم ہے گویا

قاضی حبیب الرحمان

معروف لکھاری

نسرین اختر نینا

کے خوب صورت افسانوں اور ناولٹ کا مجموعہ

"سراب"

جس میں معاشرے کی برائیوں کو قلم کے نشتر سے بے نقاب کیا گیا ہے

کتاب ملنے کا پتا

حُسنِ قلم پبلیکیشنز

4، بگل پلازہ۔ مین مارکیٹ گلبرگ III۔ لاہور

رابطہ: 042-35758333

042-35756555

موبائل نمبر: 0300-4717801

تشریح مانگی، جس سے میں گزر رہی ہوں تو کیا کہوں گی۔ کیا سمجھاؤں گی اسے۔

"سمجھنے سمجھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ عشق کرنے کا کام ہے۔ سمجھنے سمجھانے کا نہیں۔ اس میں تو بس دل کی مانئے ہے اور دل کی ماننے کے لیے کسی سوچ بچار کی بھلا کیا ضرورت۔ دل کا بھلا دماغ سے کیا سمبندھ۔"

"ایک دوست کہہ رہی تھی۔" یمنی بولی۔ "اسے سمجھنے کے لیے غالب کو نہیں فرائیڈ کو پڑھو۔"

"بکواس کرتی ہے وہ۔ فرائیڈ کو محبت کی ماہیت کا کیا معلوم۔ وہ تو دل کی بات ہی نہیں کرتا، وہ تو انسان کے سارے اعمال و حرکات کو ذہن کی کارگزاری قرار دیتا ہے۔ اس کو پڑھو گی تو نہ اپنی رہو گی نہ میری۔ بھٹک جاؤ گی۔ وہ تمہیں بھٹکا کر ایسے راستے پر لے جائے گا جس پر دل کے قافلے سفر نہیں کرتے، جہاں انسانی ذہن اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے سر پٹختا ہے مگر وہ سوال جوں کا توں موجود رہتا ہے جو آج سے تین ہزار سال پہلے سقراط نے کہا تھا کہ اپنے آپ کو پہچانو" لہٰذا تم غالب کو پڑھو نہ فرائیڈ کو۔ بس مجھے پڑھو اور اپنے آپ کو۔"

"ابھی تک تو وہی کر رہی ہوں۔ چونکہ اپنے آپ کو کہیں گم کر دیا ہے تو اس کی کھوج میں غالب اور فرائیڈ تک پہنچ گئی تھی۔"

"تم کہیں گم نہیں ہوئی ہو۔" سلمان روسٹنگ ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا ہے۔ اپنا دل، اپنا دماغ، اپنا وجود سب کچھ اور یہ سارا اثاثہ میں نے اپنے دل کی تجوری میں کسی خزانے کی طرح محفوظ کر دیا ہے، مقید کر دیا ہے۔

"میں اب آزاد ہو کر کروں گی بھی کیا۔ یوں ہمارے سماج کی تقریباً ہر عورت اسی طرح کی قید و بند چاہتی ہے۔ کیونکہ یہی قید اس کی زندگی ہے۔" یمنی نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

☆.....☆

سلمان کی وحشت ان دنوں سوا ہو گئی۔ جب اس کے پاپا اس رشتے پر معترض ہوئے۔ اعتراض کلاس ڈیفرنس تھا۔ سلمان کے پاپا کا اعتراض تھا کہ اس گھر میں اس کی ایڈجسٹمنٹ پرابلم بن سکتی ہے حالانکہ بذاتِ خود یمنی کی نظر میں یہ بات قطعی اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں۔ میری نظر میں اس امر کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے سلمان سے سروکار ہے کلاس سے نہیں۔"

سلمان جو پہلے ہی بکھرا ہوا تھا۔ اپنے پاپا کی اس مزاحمت کے بعد مزید جنوں خیز ہو گیا۔

"اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔" امی نے اس کے پاپا سے کہا۔

"یہ شکایت تو تمہیں پہلے سے ہے۔" انہوں نے ٹیلی ویژن اسکرین پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"مگر اب وہ پہلے سے بھی زیادہ لاپروا ہو گیا ہے۔ کل رات کے کھانے میں بھی اس نے مشکل سے بس ایک چپاتی کھائی ہوگی۔" وہ فکرمندی سے بولیں۔

"باہر کچھ کھا لیتا ہوگا۔" پاپا نے سلمان کی بھوک کی کمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"باہر تو جب کھائے ناجب گھر میں اچھا نہیں بنا ہوگا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اسے میرے ہاتھ کا پکا کتنا پسند ہے۔ میرے ہاتھ کی پکی دال بھی ہو تو وہ بہت شوق سے کھاتا ہے مگر جب سے وہ یمنی کے چکر میں پڑا ہے اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔" امی نے زچ ہو کر تفصیل بھی بتائی۔

"تو اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" پاپا نے گویا استفسار کیا۔

"میں تو کہتی ہوں۔ اس کی زندگی ہے نہیں سمجھ رہا۔ تو خود ہی بھگتے گا اور ویسے بھی کلاس ڈیفرنس کوئی بہت واضح نہیں ہے وہ ایڈجسٹ ہو جائے گی۔" وہ

غزل

ہر نظر بدلی ہوئی ہے، ہر سخن بدلا ہوا
اب تری بستی میں ہے سب کا چلن بدلا ہوا

کچھ نہ کچھ تو مجھ میں بھی آئی ہے تبدیلی ضرور
پیرہن بدلا ہوا ہے یا بدن بدلا ہوا

اک تماشہ گاہ مدت سے ہے میرے سامنے
بس یہاں فن کار بدلے ہیں نہ فن بدلا ہوا

کچھ دنوں سے اپنے لہجے میں تھکن در آئی ہے
لگ رہا ہے اِس کا بھی طرزِ سخن بدلا ہوا

کچھ تو ہے جو آنکھ میں ویرانیوں کا راج ہے
کچھ تو ہے جو ہے تمہارا بانکپن بدلا ہوا

شاد ہوں اوصاف میں تعبیر کی امید پر
دیکھتا ہوں خواب میں رنگِ چمن بدلا ہوا

اوصاف شیخ

اصل بات کی طرف بھی آ گئیں۔

''ماں ہو نا۔ ماں کی طرح سوچتی ہو۔ ذرا سی بات ہوتی ہے موم کی طرح پگھل جاتی ہو۔ یہ زندگی پتھر کی طرح سخت ہے۔ بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے، اسے گزارنے کے لیے۔'' انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

امی کے چہرے سے تشویش کے بادل چھٹ گئے اور خوشی سورج کی کرنوں کی طرح ان کے چہرے پر پھیل گئی۔

☆.....☆

یہ خوشی انہیں زیادہ دن راس نہ آئی۔ وہ بیمار رہنے لگیں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تو وہ پہلے ہی تھیں۔ اب انہیں دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا اور آخر کار اس دل ناتواں نے ایک دن دھڑکن سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ گھر میں اور کوئی تھا نہیں۔ سلمان کی ایک بڑی بہن تھی جس کی کچھ عرصہ پہلے شادی ہو چکی تھی۔ سو گھر میں اب عینی، سلمان اور پاپا رہ گئے تھے۔ گھریلو امور کی ساری ذمہ داری اب عینی پر آ گئی تھی۔ ہر چند کہ فیملی مختصر تھی مگر گھر کے کام بھی کچھ کم نہ تھے اور سلمان کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ کوئی ملازمہ افورڈ کرتا۔ جھاڑو پونچھا برتن کپڑے دھونا، کھانا پکانا۔ سب کچھ اسے اکیلے ہی کرنا پڑتا تھا۔ پاپا ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور ان کی پنشن بھی بہت معمولی تھی۔ عینی سب کچھ کر لیتی تھی۔ سب کچھ الٹا سیدھا چل جاتا تھا۔ ڈسٹنگ کرتے وقت کونے کھدرے صفائی سے محروم رہ جاتے تو کوئی اتنا حرج نہ تھا۔ دھلے ہوئے کپڑوں میں اجلا پن نہ آتا تو خیر واشنگ پاؤڈر کی ٹھہرتی مگر کوکنگ۔ اس میں پرفیکشن بہت ضروری ہوتی ہے۔ ابھی وہ گزارے لائق پکا لیتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس میں مہارت حاصل کر لیتی مگر ایک دن.....

''یہ تم کھانا کیسا بناتی ہو؟'' سلمان برا سا منہ بنا کر بولا۔

وہ چپ رہی، کیا کہتی۔

''زہر مار کرنا پڑتا ہے۔'' اس کے لہجے سے برہمی صاف جھلک رہی تھی۔

''میں کھانا اب اتنا برا بھی نہیں بناتی۔'' اس سے رہا نہ گیا۔ ''اور وہ دن بھول گئے تم۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ یاد کرو۔ ان دنوں کھانے پینے میں تمہارا قطعاً انٹرسٹ نہیں تھا۔ کہتے تھے میرا کھانا پینا اوڑھنا بچھونا سب کچھ تم ہو۔''

''سلمان کے چہرے پر جیسے ایک سایہ سا آ کر گزر گیا مگر وہ جلد ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تمہاری ایک بھوک مٹ گئی تو دوسری بھوک عود کر آئی حالانکہ یہ تم ہی تھے جو فرائیڈ کے نظریے کو جھٹلانے میں لگے رہتے تھے۔

''کیا بکواس ہے؟'' وہ جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں اب تمہیں کسی بات کے بارے میں DEFINITION بھی بکواس لگنے لگی ہے۔ مجھ سے وہ عشق و محبت، وہ وارفتگی، وہ جنون، پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے سے تمہاری وہ بے اعتنائی۔ آخر وہ سب کیا تھا۔ صرف میرے وجود کا حصول، محض ایک میری چاہ تھی جو اب مٹ گئی ہے۔ وہ بھوک مٹی تو شکم کی بھوک عود کر آئی۔ اب تجزیہ کرو، ذرا اپنے اس عشق کا، جس میں تم نے شکم کی بھوک کو فراموش کر دیا تھا۔ پرکھو اس عشق کو جو اپنے عقل کی کسوٹی پر..... کیا تھا وہ سب کچھ اور کیا ہے یہ اب۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''بڑے آئے عشق کا دعویٰ کرنے والے۔''

باقی ماندہ الفاظ جیسے اس کے حلق میں پھنس گئے شدتِ جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی اشک بھی پلکوں پر لرزنے لگے تھے۔

عینی کی بات سن کر سلمان یوں پلکیں جھپکانے لگا جیسے اندھیرے سے اچانک کسی نے اسے تیز روشنی کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہو۔

رنگِ فسانہ

مدیحہ عدنان

خواب اور گھروندے

شادی کے لیے، اماں نے جب سرخ غرارے کی جگہ نیلا غرارہ بنوایا تو اس کے دل پر اوس سی پڑ گئی۔ خوابوں میں تو وہ سرخ کمخواب، نفیس شیفون کے کام والے غرارہ سوٹ میں ملبوس تھی...... "حامد کو سُرخ رنگ پسند نہیں ہے، اُسے نیلا رنگ پسند ہے" اماں نے تسلی دیتے ہوئے......

خواب اور حقیقت سے جڑا ایک خیال، افسانے کی صورت

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

اس میں زندگی کا ہر سچ موجود ہے

☆ہمارے معاشرے میں بکھرے تلخ اور برہنہ سچ جن کا جاننا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔

☆آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، جیتی جاگتی کہانیاں، پراسرار کہانیاں، جو باتیں آپ اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی گھبراہٹ کا شکار ہو جائیں، ایسے موضوعات پر دل کے تاروں کو جھنجھوڑنے والی کہانیاں۔

☆ہمارے ہر مسئلے کا حل چاہے، بیٹی کی شادی ہو یا بیٹے کی نافرمانی، شوہر کا بیوی کو دھوکا دینا ہو یا بیوی کا اپنی حدود کو پار کرنا، تعلیم، صحت تمام مسائل کا حل صرف کلام پاک کے ذریعے۔

سچی کہانیاں نہ ملنے کی صورت میں سرکولیشن منیجر سے رابطہ کریں 0333-2269932 - 0300-2313256

آفس فون نمبر: 34939823 - 34934369

منگوانے کا پتا: پرل پبلی کیشنز 110 آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ۔ کراچی

ماہ بانو نے جب سے آنکھ کھولی تھی خود کو گھر کے گھٹن زدہ ماحول اور پابندیوں میں جکڑے ہوئے پایا تھا۔ بچپن تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن جوانی میں خوابوں اور خواہشوں کو مارنا آسان کام نہیں تھا اور اس کا دل بھی ایسا باغی تھا کہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتا۔

اماں جب بھی گوشت کی ہانڈی بناتیں تو بھنے ہوئے گوشت کا تھوڑا سا سالن اس کے ابا اور بھائیوں کے لیے علیحدہ نکال لیتیں اور باقی گھر والوں کے لیے پانی ڈال کر پتلے شوربے والا بدذائقہ سا سالن تیار کر دیتیں، ماہ بانو کا دل کٹوری میں نکلے بھنے ہوئے گوشت کے سالن میں ہی اٹکا رہتا۔

اماں اس کی للچائی ہوئی نظریں دیکھتیں تو غصے سے دو ہتھڑ اس کی کمر پر مارتیں۔ ''باپ اور بھائیوں کے کھانے کو نظر ہی لگا دے گی کم بخت۔ سارا دن محنت کرتے ہیں۔ کمانے والے مرد ہیں۔ اچھی خوراک ان کی ضرورت ہے۔ تُو تو صرف روٹیاں ہی توڑتی رہتی ہے۔ یہ سارے عیش، باپ اور بھائیوں کے دم سے ہی ہیں مگر کیسا چھوٹا دل ہے تیرا، کسی کو اچھا کھاتا پیتا دیکھ ہی نہیں سکتی۔''

وہ اپنی کمر سہلاتی، نظروں کا زاویہ بدل لیتی۔

اس کا بھی دل چاہتا کہ بھُنے ہوئے گوشت کا مسالے والا سالن کھائے یا تازہ دودھ کی کھیر جو اماں صرف ابا اور بھائیوں کے لیے ہی بناتی تھی، اس کا ایک پیالہ چپکے سے اپنے لیے بھی نکال لے۔ اسے اچھا کھانے کا شوق تھا لیکن وہی غربت اور مہنگائی کے مسائل جو صرف باقی گھر والوں کے لیے ہی موجود تھے۔ ورنہ ابا اور بھائیوں کو تو گھر میں ہر طرح کی خوش حالی میسر تھی۔

اس کا کتنا دل چاہتا کہ زاہد بھائی اور عارف بھائی کی طرح ناشتے میں پراٹھا اور انڈہ کھائے لیکن مجبوراً اسے چائے کے ساتھ سوکھی روٹی نگلنی پڑ[تی]۔ کبھی جو اماں سے دبے دبے لہجے میں فرمائش کرتی وہ بے مروتی سے کہتیں۔

''اپنے گھر جا کر سارے شوق پورے کرنا یہاں تو صرف گزارہ کرنے کی فکر کرو۔''

کبھی کبھی، اسے لگتا تھا کہ اماں کو صر[ف] بیٹوں سے ہی محبت ہے اور اس کا گھر میں ہونا برابر ہے۔

''اپنا گھر!!'' ماہ بانو کے تصور میں ایک خو[ب] صورت سا گھر ابھر آتا اور اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی، اپنے گھر کا خواب اس قدر دلنشیں تھا [کہ] گھنٹوں اس تصور میں کھوئی رہتی۔

اس کی آنکھوں نے خوابوں کے روپ نگر کا [خواب] دیکھ لیا تھا۔ وہ سنہرے سپنوں کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگنے لگی۔ اسے بے جا پابندیوں اور گھر [کے] سخت ماحول سے اکتاہٹ سی ہونے لگی تھی۔

بقر عید پر جب وہ دونوں کلائیوں میں ڈھیر سار[ی] چوڑیاں پہنتی اور خوب سارا میک اپ کرتی تو ا[ماں] اسے کسی نہ کسی بہانے سے ضرور ٹوکتیں، پتا نہیں اماں کو ٹوکنے کی عادت کس سے پڑی تھی۔ ماہ بانو [اپنے] ہی دل میں نئے خوابوں کے منصوبے بنانے لگتی۔

''یہ چوڑیوں کی چھن چھن تمہارے ابا کو ناپسند ہے اور کنواری لڑکیوں کو اتنا بار سنگھار زیب نہیں دیتا۔ بھائیوں کے سامنے رنگے ہوئے [منہ] کے ساتھ آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اتنے [شوق] سے کیے ہوئے میک اپ پر اماں کی یہ تنقید، اس [کا] دل ہی توڑ دیتی۔

وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔ اسے شوخ رنگو[ں] کے خوب صورت کپڑوں کا بے حد شوق تھا لیکن [یہاں] اماں کے ارشادات جاری ہو جاتے۔

''کنواری لڑکیوں کو شوخ رنگ نہیں

[جچتے] ہیں۔ وہ مجبوراً سادہ اور ہلکے رنگوں کے کپڑے [پہنتی] لیکن شوخ رنگ پھولوں بھرے ڈیزائن اور نت [نئے] فیشن اسے بے حد بھاتے تھے۔

''ہونہہ! ایسے کپڑے تو اب بوڑھیاں بھی نہیں [پہنت]یں۔'' وہ جلتے کڑھتے ہوئے، کہنے سے نہ [رہت]ی۔

''شادی سے پہلے لڑکیاں سادہ ہی اچھی لگتی [ہیں]۔ اپنے گھر جانا تو جو مرضی کرنا، سجنا، سنورنا، اپنی [مرضی] کے کپڑے بنانا، پہننا، جو دل چاہے کرنا لیکن [یہاں] ایسے شوق پورے کرنے کا خیال بھی دل میں نہ [لانا] کہ سسرال میں سنو کہ ماں نے کیسی تربیت کی [ہے]۔'' یہ جملہ تو لگتا کہ اماں کو ازبر تھا۔

''اماں، اس کی خواہشات سے واقف تھیں لیکن [ان کا] نافذ کردہ کرفیو بڑا سخت تھا۔ اب بھلا آنے [وال]ے دنوں کے انتظار میں انسان کب تک صرف [خوا]ب ہی دیکھے، اماں کے اصول......! اماں کے [احک]امات......!!

''اپنا گھر!'' اس کے ذہن میں بار بار اسی لفظ کی [تکر]ار ہوتی۔

''ہاں عورت کا اصل گھر اس کے شوہر کا ہوتا [ہے] وہ اسی گھر کی حکمران ہوتی ہے۔ ماں باپ کا [گھر] تو لڑکی کے لیے سدا سے پرایا ہوتا ہے۔'' اماں [ہ]ر وقت یہ ہی سمجھایا کرتیں۔

''تو یہ میرا گھر نہیں ہے؟'' یہ سوچ اس کے [ذ]ہن کو پریشان ہی کر دیتی۔

''نہیں! یہ تمہارے بھائیوں کا گھر ہے۔ تمہارا [گھر] وہ ہو گا جہاں تم بیاہ کر جاؤ گی۔'' اماں قطعیت [سے کہت]یں۔

☆......☆

[خی]الوں ہی خیالوں میں اب اکثر وہ خود کو سرخ [جوڑ]ے میں ملبوس دلہن بنے دیکھتی۔ اس کے کانوں

غزل

اپنی تنہائی کو محفل نہ بنا
ڈوبتی ناؤ کو ساحل نہ بنا

ساغرِ جاں نہ چھلک جائے کہیں
مے کشی کو بھی غمِ دل نہ بنا

جو ستم کیش نہیں ہے یہ طرب
اس کو اپنا کبھی قاتل نہ بنا

روئے گا بعد میں خود کو کھو کر
خود کو اُس شخص کے قابل نہ بنا

اپنی بھٹکی ہوئی رہ سے نہ بھٹک
خود کو دیوانۂ منزل نہ بنا

ہم نے چاہا تو بہت بار رضیؔ
پر جو خارج تھا' وہ داخل نہ بنا

رضیؔ مجتبیٰ

میں شہنائی کی دلنشیں آواز گونجنے لگی تھی۔ خوب صورت پھولوں کے گجرے، رنگ برنگ کے ملبوسات! اف خواب خواب...... خوشیاں ہی خوشیاں......

اس کی آنکھوں میں ایک ایسے اجنبی کا انتظار در آیا تھا جو اس کا ہاتھ تھام کر اسے پیارے اور شاندار سے گھر میں لے جاتا۔ جہاں وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوتی اور پھر اپنی ساری تشنہ خواہشات اور سارے ادھورے خواب پورے کرتی۔ اپنے خیالوں میں گم ہو کر، وہ حقیقت کی ساری تلخیاں بھلا دیتی اور اب اکثر اماں کی پابندیاں اسے بری نہ لگتیں، اسے کون سا عمر بھر یہاں رہنا تھا۔

ان ہی دنوں رشتے کروانے والی بوا کے توسط سے اس کے لیے ایک رشتہ آیا تو اماں ابا نے مناسب چھان بین کے بعد انہیں ہاں کہہ دی۔

وہ بے حد خوش تھی۔ اپنے گھر جانے کی خوشی ہر شے پر حاوی تھی۔

اماں ابا نے اپنی بساط کے مطابق معمولی سا جہیز بنوایا۔ کپڑوں کی خریداری کے وقت صرف اماں کی ہی پسند چلی، وہی ریشمی لیکن کم قیمت کپڑے دیکھ کر اسے مایوسی تو بہت ہوئی لیکن پھر یہ سوچا کہ بری کے کپڑے بھی تو ہوں گے جن میں اکثر خوب صورت اور ستاروں، موتیوں کے کام والے بھی ضرور ہوں گے اور بنارسی کپڑے تو اسے بہت ہی اچھے لگتے تھے۔

سسرال سے اس نے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ جہیز میں پلاسٹک کے برتن، سیل سے خریدی ہوئی چادریں اور تولیے، ریشمی کپڑے اور عام سا فرنیچر شامل تھا لیکن پھر بھی وہ خوش تھی کیونکہ بات چیزوں کی نہیں، احساسات کی ہوتی ہے۔ اس کے احساس زندگی کے نئے رنگوں میں سنہری کہکشاں بُن رہے تھے۔

☆......☆

شادی کے لیے اماں نے جب سرخ غرارے کی جگہ نیلا غرارہ بنوایا تو اس کے دل پر اوس سی پڑ گئی۔ خوابوں میں تو وہ سرخ کمخواب، نفیس، شیفون کے کام والے غرارہ سوٹ میں ملبوس تھی اور حامد قدم سے قدم ملا کے زندگی کی نئی شاہراہ پر قدم رکھ رہا تھا، اسے محبت بھری نظروں سے، پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔

''حامد کو سرخ رنگ پسند نہیں ہے، اسے نیلا رنگ پسند ہے اور شوہر کی پسند و ناپسند کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔'' اماں نے اس کی اتری صورت دیکھ کر تسلی دیتے ہوئے اسے پہلی بار پیار سے سمجھایا۔

''اور میری پسند و ناپسند کی کوئی اہمیت نہیں۔'' اس نے اداسی سے سوچا۔

'شاید نہیں' دل نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، اس نے گہری لمبی سانس لی اور سر خود بخود جھکتا چلا گیا۔

☆......☆

شادی کا نیلا جوڑا پہن کر وہ ایک نئے سفر پر رخصت ہوگئی۔ وہاں اس کے خوابوں کا شہزادہ اور وہ گھر اس کا منتظر تھا، جہاں کی ہر چیز اس کی اپنی تھی...... مگر وہ گھونگھٹ اٹھاتے ہی حیران ہوگئی۔

یہ گھر اس کے تصورات سے بالکل الگ تھا، بالکل مختلف...... کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو اس نے سوچا اور چاہا تھا۔

سیمنٹ کی اکھڑی دیواروں اور گھسے ہوئے فرش والا، تین کمروں کا یہ خستہ حال مکان دیکھ کر اسے دھچکا تو لگا لیکن یہ خیال تسلی بخش بھی تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے اور یہ خواب ہر شے پر حاوی ہوگیا اور پھر اپنا گھر جیسا بھی ہو، محلوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس

گھر کو محبتوں سے سجانے کا خواب دیکھنا اس کا حق تھا، سو اسے بہت اچھا لگا۔

شادی کے شروع کے دن تھے، وہ نئے نئے کپڑے پہن کر خوب تیار ہوتی تھی لیکن اسے پتا چلا کہ اس کے میاں اور ساس کو یہ بات سخت ناپسندیدہ لگتی ہے۔

چند دن بعد حامد نے کہہ ہی دیا۔ ''مجھے ان ریشمی کپڑوں سے وحشت ہوتی ہے۔ سادہ سے کپڑے پہنا کرو اور یہ ہر وقت منہ اور ہونٹ رنگنا بہت ضروری ہیں کیا؟ یہ سب بھی مجھے بالکل پسند نہیں، تم سادہ ہی اچھی لگتی ہو۔''

اس کے شوہر نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح اظہار کر دیا تھا۔ اس نے خاموشی سے دل کو سمجھایا اور شوق سے لیا گیا میک اپ کا سامان ڈبوں میں بند کر دیا اور ریشمی کپڑے اس نے بڑی خاموشی سے ٹرنک میں رکھ کر دل کے دروازے پر گویا تالا بھی لگا دیا۔ اب بھلا جسے سادگی پسند ہو، اسے سج بن کے کیا دکھانا۔

☆......☆

''گھر میں جوان نندیں موجود ہیں۔ تمہارا ہر وقت بنے ٹھنے رہنا ان کے ذہن پر غلط اثر ڈالے گا۔'' ساس نے حکم دیا۔

''جی......'' اس نے خاموشی سے سر جھکایا۔

خوابوں نے بھی شاید اسی لمحے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

☆......☆

رات جب حامد کے لیے سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھا تو بے اختیار، ماہ بانو نے شکوہ بھی کر ڈالا جو جانے کب سے اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔

''یہ سارے شوق اپنے گھر سے پورے کر کے آنے تھے۔ یہاں ان الّلے تلّلوں کی گنجائش نہیں ہے۔'' حامد کا لہجہ بے حد اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

غزل

آدمی خود بھی جہاں خضر نظر آتا ہے
موڑ اک ایسا بھی دورانِ سفر آتا ہے

بوجھ کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے تنہائی کا
جب کوئی رات گئے لوٹ کے گھر آتا ہے

قافلے والے تھکن اوڑھ کے سو جاتے ہیں
دھوپ میں کام مسافر کے شجر آتا ہے

صرف ہو جاتا ہے جب خون تمناؤں کا
تب کہیں جا کے دعاؤں میں اثر آتا ہے

مشتعل لاکھ ہوا ہو، یہ بھڑکتے ہی نہیں
کچھ دیے ہیں، جنہیں جلنے کا ہنر آتا ہے

کیا عجب شخص تھا دیکھا ہے اُسے جس دن سے
جس کو دیکھو وہی محبوب نظر آتا ہے

ایک ہم ہیں کہ ہنر بھی نہیں رکھتے کوئی
ورنہ لوگوں کو قیامت کا ہنر آتا ہے

فیصلہ ترکِ تعلق کا میں جب کرتا ہوں
دل کے آئینے میں اِک عکس ابھر آتا ہے

بند رکھنا کبھی اعجاز نہ دروازے کو
روٹھنے والے کو آنے دو، اگر آتا ہے

اعجاز رحمانی

سونف

ہمارے باورچی خانے میں عام طور پر استعمال ہونے والا یہ مسالہ بہت ساری تکالیف اور امراض کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سونف میں قبض، خون کی کمی، امراضِ تنفس، کھانسی، اسہال، بخار، بدہضمی اور پیٹ کے درد کو دور کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ علاوہ ازیں یہ دودھ پلانے والی ماؤں کے لیے خاص طور سے مفید ہے۔ بدہضمی کے علاج کے لیے ایک چائے کا چمچہ سونف کو سوکھی ہوئی ادرک اور لونگ کے ساتھ ملا کر باریک پاؤڈر کی شکل میں پیس لیجیے۔ پھر اس میں شہد ملا کر اس کا گاڑھا گاڑھا پیسٹ بنا لیجیے۔ ہر کھانے کے بعد اور رات کو سونے سے پہلے ایک چائے کا چمچہ بھر کر کھائیے۔

''اپنے گھر سے......'' اس کے ذہن میں بگولے اڑنے لگے۔

''میرا گھر تو یہی ہے؟'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''یہ میری ماں کا گھر ہے۔ تمہارا گھر وہ تھا، جو تم اب چھوڑ آئی ہو، زیادہ حکمرانی کرنے کی ضرورت نہیں۔'' حامد نے یہ کہہ کر دودھ کا گلاس غٹ غٹ کر کے پیا اور کروٹ بدل کے لیٹ گیا۔

☆......☆

شاید ہر شخص کا اپنا فلسفہ، اپنی ہی زندگی ہے۔ آخر اس کا گھر کون سا ہے؟ وہ کس سے پوچھے......؟

عورت کا شاید کوئی گھر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ہر جگہ سرائے کی مانند ہوتی ہے۔ سرائے جو محض عارضی قیام گاہ ہوتی ہے۔

اس گھر میں صرف اس کی ساس کی مرضی چلتی تھی۔ کھانا بھی ان کی پسند سے ہی بنتا بلکہ گھر کا سارا نظام بھی انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔ ماہ بانو کو تو اپنا آپ صرف ایک کٹھ پتلی کی ہی طرح لگتا تھا۔

ہفتے میں ایک دن گوشت پکتا اور اس کی ساس اچھی اچھی بوٹیاں حامد کے لیے اور اپنے لیے نکال لیتی۔ ماہ بانو اور اس کی نندوں کے لیے پتیلی میں صرف گوشت کا پتلا شوربہ ہی رہ جاتا۔

اسے ایسے وقت میں نہ جانے کیوں اماں اور ان کی باتیں یاد آنے لگتیں جو شاید اس وقت نہ تو اسے سمجھ آتی تھیں اور نہ ہی وہ ان پر عمل کر کے خوش ہوتی تھی مگر اب......!

اپنے گھر کے تصور سے آباد سب خواب ایک ایک کر کے چکنا چور ہو چکے تھے۔ زندگی کے سبق ہمیں روز ملتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں روز ہم بھول بھی جاتے ہیں۔

حامد جو کچھ کماتا، اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھتا۔ ماہ بانو کی مٹھی خالی کی خالی رہ جاتی، بالکل اس کے دل کی طرح...... جواب نہ گھر کی تلاش میں تھا اور نہ ہی اب آرزوؤں کے پھول اس دل میں کھلا کرتے تھے۔

اپنے گھر کے خواب نے اس کا بے حد دل دکھایا تھا۔ اس نے تنہائی میں سوچا کہ کیا واقعی عورت محض کچھ وقت کے لیے اس میں پناہ لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ پناہ گاہ اور گھر میں فرق ہوتا ہے۔ بس ایک ہی ٹھکانا ابدی اور مستقل ہوتا ہے۔

اپنے گھر کا تصور محض سراب تھا۔ ایسا سراب جو ساری زندگی عورت کو اپنی خوش رنگ جھلک سے بہلاتا رہتا ہے لیکن زندگی کے تجربے ماہ بانو کو اب ایک نئی راہ کی طرف لے جا رہے تھے، جہاں وہ اس رشتے سے آشنا ہو چکی تھی جو ماں کے روپ میں جنت کی نوید تھا اور گھر کے دکھ نے تخلیق کے خوشی سے آشنا کرا کے چاروں طرف روشنی بکھیر دی تھی۔

رنگِ فسانہ

زرافشاں فرحین

رازِ حیات

گزرے ماہ و سال میں جہاں وہ دنیا کی ہر طرح کی لذتوں سے ہمکنار تھے، وہیں ہانیہ اور سالم کی خواہشات اب تمام حدود پھلانگ کر ہوس کا روپ دھارنے لگی تھیں اور جب خواہش ہوس کی شکل میں، تناور درخت بن کر سینوں میں اپنی جڑیں پھیلا دے تو......

مال و متاع کے جال میں الجھی ایک راہ نما تحریر، افسانے کی صورت

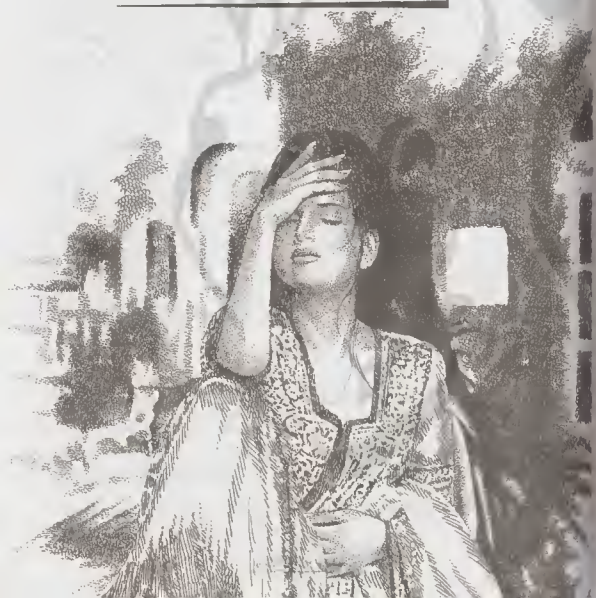

”اف کس قدر زبردست فنکشن تھا، شاندار ارینجمنٹ اور بے حد لذیذ ڈنر...... مزا آگیا۔“ وہ آنکھیں بند کیے، ابھی بھی اس تقریب کا حصہ تھی، جہاں سے وہ لوگ رات کے تین بجے فارغ ہوکر اب گھر واپس لوٹ رہے تھے۔

بچے نیند سے بے حال پچھلی نشست پر تقریباً سو ہی گئے تھے اور سالم، قدرے بے زاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

رہنے دو ہانیہ، اتنی تعریف...... میں تو سخت بے زار ہوتا ہوں، اتنے لیٹ نائٹ فنکشنز سے، اوپر سے اس قدر اسراف...... خدا کی پناہ! بینڈ باجا تو اس قدر سر میں درد کرتا ہی ہے اور پھر خواتین کی اس قدر فضول تیاریاں، مجھے تو سب کو دیکھ دیکھ کوفت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے تو کھانا بھی صحیح طریقے سے نہیں کھایا۔“

”ہیں!! اتنا اچھا کھانا اور آپ نے نہیں کھایا......“ ہانیہ آنکھیں پھاڑ کر چلائی۔ ”اتنی زبردست فنگر فش تھی اور وہ روسٹ، میں نے تو پوری پلیٹ بھر لی تھی۔ آپ آخر تھے کہاں؟“ سارے مرد اپنی فیملی کے ساتھ ٹیبل پر تھے، آپ نہ جانے کہاں گم تھے۔“ وہ برہم ہوکر بولی۔

”بھئی تمہیں تو معلوم ہے، مجھے عورتوں کے درمیان بیٹھنا قطعی پسند نہیں۔ میں اپنے کزنز ثمیل اور علی کے ساتھ تھا۔“ سالم نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں آپ تینوں میں ہی بوڑھی روح گھسی ہوئی ہے۔ ساری دنیا سے بے زار...... پتا ہے آج ثمیل بھائی کی بیوی ان کا اتنا مذاق اڑا رہی تھیں کہ میں تو ابھی جوان ہوں بھئی زندگی زندہ دلی کا ہی تو نام ہے تو کیوں نہ انجوائے کروں وہ اپنے شوہر کو سب کے سامنے بوڑھا کہہ رہی تھی اور خود جوان بننے کے چکر میں اس قدر اوور میک اپ تھیں اور ڈریسنگ...... توبہ...... توبہ اتنا بھاری جسم ہے اور اس پر فلیپر...... شارٹ شرٹ تو عجیب ہی لگ رہی تھی بے چاری......“ ہانیہ نے اپنے مخصوص انداز میں مسز ثمیل کا سارا نقشہ کھینچ ڈالا۔

”اور وہ آپ کے دوسرے دوست علی، ان کی بیوہ...... اوہ سوری...... بیوی۔ انہوں نے سارے جہاں کا غم اپنے دل میں پالا ہوا ہے۔ اس قدر سادہ اور بے رنگ کپڑے تھے ان کے کہ کئی لوگوں نے استفسار کیا...... خیریت تو ہے...... کہنے لگیں، ہاں سب خیر ہے لیکن ایک بار تو جلے بھنے انداز میں بول پڑیں۔ بھئی جب شوہر کو ہی دلچسپی نہ ہو تو کیوں بلاوجہ خود پر وقت اور پیسہ ضائع کروں۔ میں سمجھ گئی علی بھائی انہیں توجہ ہی نہیں دیتے ہوں گے۔ آخر آپ کیوں نہیں سمجھاتے اپنے دوستوں کو......“

سالم ہمیشہ سے اس کی اتنی لمبی تقریر کا عادی تھا اور آخر میں وہ اسی پر جرح شروع کر دیتی جس پر سالم کا ہمیشہ ایک ہی ردِعمل ہوتا...... سو اس نے وہی کیا۔

”ارے بیوی...... چھوڑو سب کے غم، تمہارا شوہر تو ان عیبوں سے پاک ہے نا! تمہیں تو کوئی شکایت نہیں۔“ اس کی مسکراتی ہوئی نظریں ہانیہ پر ٹک گئیں۔

وہ کھل اٹھی۔ ”ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔“

وہ جانتی تھی سالم، خود کتنا ہی سادہ طبیعت...... آدم بے زار اور سادگی پسند تھا مگر اس کے شوق کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔

اسے بہت شوق تھا، ہر طرح کے فیشن اپنانے کا، ہر طرح کی سجاوٹ کرنے کا، اس کے لباس انداز اور گھر کی ایک ایک چیز سے اس کے زندہ دل ہونے کا پتا چلتا تھا۔ اس کے ڈریسنگ روم، ڈائننگ ہال، کچن حتیٰ کہ واش رومز تک میں نفاست اور حسنِ لطیف کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

سالم اسی لیے بھی اس کا دیوانہ تھا کہ ہر ایک عزیز

اقارب اس کی بیوی کے خوش ذوق ہونے کی تعریف کرتے تھے۔

بڑی محنت اور لگن سے ان دونوں نے اپنا گھر بنایا تھا۔ دو بچے تھے، وہ بھی اچھے اسکولز میں زیر تعلیم تھے۔ ہانیہ کا عزم تھا کہ دونوں کو ہائی اسٹڈیز کے لیے ملک سے باہر بھیجے، اسی لیے وہ خود بھی سالم کے ساتھ ساتھ ملازمت کر رہی تھی۔

سالم کے والدین کافی ضعیف تھے اور اپنے سب سے بڑے بیٹے کے گھر مقیم تھے۔ یہ لوگ عرصہ ہوا الگ شفٹ ہوچکے تھے مگر اس کی وجہ ہانیہ کی بے رخی نہیں بلکہ سالم کے والدین کی وسیع القلبی تھی۔ انہوں نے خود خوشی خوشی اپنے تینوں بیٹوں کو اپنی زندگی میں ہی کاروبار کرا دیا تھا اور گھر بنانے کے لیے بھی مدد دی تاکہ سب خود کفیل ہوسکیں اور کوئی دوسرے پر زیر بار نہ ہو......

ہانیہ کو اپنے سسرال میں بھی ایک خاص مقام حاصل تھا۔ خوب صورت، خوش لباس، خوش اخلاق و خوش اطوار بہو...... ہر دلعزیز...... گویا راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

☆......☆

”ہانیہ یار...... ہماری کمپنی اپنی برانچ مڈل ایسٹ میں بھی بنانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے ذمہ داری سونپی ہے کہ میں اس پورے پراجیکٹ کو سنبھالوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ سالم نے چائے کے سپ لیتے ہوئے اس سے مشورہ کیا۔

”اچھا، یہ تو ایک خوش آئند بات ہے۔ مزید ترقی کے چانسز بھی ہیں۔ آپ فوراً قبول کرلیں۔“ ہانیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”سوچ لو یار، مجھے کافی عرصہ تم سے دور اور ملک سے باہر رہنا ہوگا۔ بچے بھی چھوٹے ہیں۔ بہت کمی محسوس کریں گے۔“ وہ قدرے یاسیت سے بولا۔

غزل

بہار نشہ فزا ہے، ہوا شگفتہ ہے
کہ آج رنگ رُخِ یار کا شگفتہ ہے

ہتھیلیوں پہ تری اے بہارکِ تازہ
گُلِ حنا جو شگفتہ ہے کیا شگفتہ ہے

تمہاری ہم قدمی پر ہوا سُبک ہے بہت
تمہاری سانس کو چھو کر صبا شگفتہ ہے

شگفتہ ہے لبِ بالا مگر لبِ زیریں
شگفتگی سے ذرا سا سِوا شگفتہ ہے

سجا ہوا ہے عجب آج اُس کے حسن کا باغ
ہر ایک قوس ہر اک دائرہ شگفتہ ہے

بہت ہی دور اُن آنکھوں میں مَیں نکل آیا
بہت ہی دور تلک راستہ شگفتہ ہے

رُکا نہ مَیں کسی خوشبوئے تیز پر اُس روز
کِھلا رہا تھا وہ غنچہ جو ناشگفتہ ہے

کاشف رضا

ہانیہ کو بھی اس بات کی اہمیت کا احساس تھا مگر ترقی کے چانسز بھی تو بہت روشن تھے۔ یہ روشنی اس کے سارے احساسات پر چھا گئی اور وہ اسے سمجھانے لگی۔

''سالم! دیکھیں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا! ان ہی بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنا ہے اور ملک کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا سب ہی بزنس ٹھپ ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے لوگ یہاں سے Move ہو رہے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پھر میں اکیلی تو نہیں، سب ہی یہیں ہیں۔ ویسے بھی آپ جانتے ہیں، میں اکیلی بھی سارے معاملات فیس کر سکتی ہوں۔ آپ قطعی بے فکر رہیں۔''

ہانیہ کی طرف سے حوصلہ ملنے پر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔

☆......☆

اب وہ ایک شاندار گھر، بہترین گاڑی اور ہر طرح کے آسائش و آرام کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

ہانیہ کی خوش ذوقی کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اب وہ شہر کے اعلیٰ طبقے کی انتہائی سوشل اور معزز خاتون کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی تھی۔

گزرتے ماہ و سال میں جہاں وہ دنیا کی ہر طرح کی لذتوں سے ہمکنار تھے، وہیں ہانیہ اور سالم کی خواہشات اب تمام حدود پھلانگ کر ہوس کا روپ دھارنے لگی تھیں اور جب خواہش، ہوس کی شکل میں تناور درخت بن کر سینوں میں اپنی جڑیں پھیلا دے تو اس دل میں خوفِ خدا یا خلقِ خدا کی محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ پاتی۔

سالم کو آج کل یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ گویا وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہیں کچھ دیر کے لیے بیٹھ جائے...... ستا لے...... مگر یہ خواہش حسرتِ ناتمام بن کر رہ گئی تھی...... بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ مدت تک صرف فیملی کے ساتھ گھر کا مزہ لینا ہے اور بس...... یہی سوچ کر، اس نے ہانیہ کو کال کر ڈالی۔

''سالم بہت عرصہ ہو گیا ہمیں ایک دوسرے سے دور رہتے ہوئے، یہ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے آ جائیں، میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' ہانیہ کا جواب بھی اثبات میں تھا۔

بچے بھی بہت خوش تھے۔ کعب تو اب پندرہ سال کے خوبصورت نوجوان کا روپ دھار چکا تھا۔

☆......☆

ایک شام وہ لوٹ آیا۔ یہ دن بھی ان کے لیے بہت یادگار اور حسین گزرے اور ہمیشہ کی طرح دن گزر گئے۔ وقت کبھی رکتا نہیں، برف کی طرح پگھلتا جاتا ہے، بند مٹھی میں سے اڑتے ہوئے آوارہ بادلوں کی طرح انہیں کبھی قید نہیں کیا جا سکتا، اس کا احساس ان دونوں کو ہی شدت سے ہوا اور اس بار تو سالم نے کعب کو بھی ہائر اسٹڈیز کے لیے U.S.A بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا، جو ان دونوں کا خواب بھی تھا۔

وہ افسردہ بھی تھے مگر پُرجوش بھی، بقول ہانیہ کے کچھ کھو کر ہی بندہ کچھ پاتا ہے۔

☆......☆

وہ دونوں بھی چلے گئے اور ہانیہ سبرین کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ تنہائی بانٹنے کے ہزار گر ہانیہ کو آتے تھے لیکن اس بار اس نے سوچا کیوں نہ سوات کی حسین اور سرسبز وادیوں میں بنے اپنے حسین کاٹج میں کچھ وقت گزارے، اس کے لیے ہانیہ کی زبردست پلاننگ تھی کہ سبرین کی اسکول سے تعطیلات ہوں تو وہ لوگ فوراً وہاں چلے جائیں۔ اپنی کئی ہم خیال و ہم ذوق دوستوں کو بھی اس نے اپنے ساتھ تیار کر لیا تھا۔

وہ لوگ بائی روڈ روانہ ہوئے۔ راستے بھر خوب انجوائے کیا۔

جنتِ نظیر سوات کی پہاڑیوں کے پُر آسائش کاٹج میں اس روز ہانیہ نے بار بی کیو کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ دھواں دھار رنگین ماحول، اونچے قہقہے لگاتے ہر غم اور فکر سے آزاد یہ تمام لوگ اس وقت ہراساں ہو گئے، جب اچانک ہی لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہونے لگا......

''تمام لوگ اپنے اپنے گھروں سے فوراً باہر نکل آئیں، بستی میں موجود دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کیا جا رہا ہے۔'' رات کے خوفناک سناٹے میں گونجتی آواز صورِ اسرافیل سے کم نہ تھی۔

کافی دن سے گو کہ وہ سن رہے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے مگر اس کی فکر کس کو تھی، اس لیے یہ سب انہیں انتہائی اچانک محسوس ہوا۔ یہ اعلان ہو رہا تھا بار بار کہ ان کے پاس بہت کم وقت ہے، وہ فوری طور پر وہاں سے نکلیں، اس سے قبل کہ بمباری یا گولیوں کی بوچھار میں وہ سب گھر کی جانب روانہ ہوں اور کسی حادثے کا شکار ہو جائیں۔

اس گھبراہٹ میں نہ موبائلوں کا خیال رہا، نہ بیگز کا، جس کے جو ہاتھ لگا، اس کے ساتھ گاڑیوں میں سوار ہو گیا۔ اس اچانک رفتار میں ہانیہ کو سبرین بھی دکھائی نہ دی کہ وہ کس کی گاڑی میں سوار ہوئی ہے۔ بس سب کو وہاں سے بھاگنے کی فکر تھی۔

ابھی وہ شہر کی حدود سے نکلے بھی نہ تھے شدید بمباری اور فائرنگ کی آوازوں نے رات کی تاریکی میں انتہائی ہیبت پھیلانا شروع کر دی۔

☆......☆

شہر کی حدود سے باہر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اپنی اپنی سواریوں پر کوئی پیدل، کوئی خچر گاڑیوں پر، اپنی اپنی عورتوں اور بچوں کو سنبھالتا بھاگنے کی فکر میں تھا۔

ہانیہ کو لگا، قیامت کا منظر ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے، گاڑیوں کا اژدہام، راستے مسدود اور انتہائی شور، بے بسی سی بے بسی تھی۔ کبھی سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے، کبھی سالم یاد آتا تو کبھی سبرین......

وہ اپنی ساتھیوں کے ساتھ ایک گاڑی میں سوار تھی اور بے انتہا رش میں پھنسی ہوئی تھی۔ بے چینی میں سبرین کو دیکھنے کے لیے گاڑی سے اتر گئی۔ رات کی تاریکی اور سیکڑوں کے مجمع میں سبرین تو کیا ملتی، وہ خود بھی اپنی دوستوں سے بچھڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ایک گدھا گاڑی میں جگہ مل سکی کہ وہ آگے کا سفر کر سکے۔

انتہائی بے بسی کی گھڑیاں اسے لہو رلا گئیں۔

''اے اللہ! میری مدد فرما۔ میری بچی...... اے اللہ میری حفاظت کر...... ہمیں اس مشکل سے نکال۔''

وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ روتے روتے دعا کرتے کرتے آنکھیں اور گلا خشک ہو گیا۔

صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ ایک امید بندھی کہ اب بحفاظت نکل جائیں گے لیکن معلوم ہوا کہ آگے تمام راستے مسدود ہیں۔ وہ آگے جاتی بھی کیسے، وہ تو خود اپنی بیٹی کی تلاش میں تھی اس کے بغیر نکلنا ناممکن تھا مگر دن کی روشنی مزید دہشت ناک اعلانات کر رہی تھی۔

لوگوں کا یہ مجمع سیکڑوں پر نہیں، ہزاروں پر مشتمل تھا۔

بے قصور، معصوم اور نہتے شہری جو اپنے اپنے گھروں میں آرام کی نیند لے رہے تھے، اچانک ہی بے در اور بے گھر کر دیے تھے۔ کتنے ہی لوگوں کے پیروں میں چپل تک نہ تھی۔ کتنے ہی سر ننگے تھے۔ نہ جانے کتنی مائیں، پیچھے اپنے بچوں کو چھوڑ کر بے دھیانی میں نکل آئیں اور بچھڑ گئی تھیں۔

ہانیہ حیران پریشان ایک ایک کی حالت دیکھتی اور اس کا دل حلق میں آ جاتا مگر ہر چیز سے سبرین کی

تلاش تھی، جو کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔

سبرین گلابی رنگ کے سوٹ میں تھی، اس وقت تو ہانیہ کو ہر گلابی رنگ میں سبرین کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ نڈھال ہو گئی مگر سبرین کا کچھ پتا نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ایک فوجی کی مدد سے فون کرنا نصیب ہوا۔

وہ بار بار سالم کا نمبر ملانے کی کوشش کرتی مگر نہ ملتا، ایسا لگ رہا تھا کہ ساری لائنیں جام کر دی گئی ہوں۔

ہانیہ کو بے حد شدت سے تنہائی کا احساس ہوا۔

''اے اللہ! میں کیا کروں۔''

سارے دوست بھی بچھڑ گئے تھے۔ نہ جانے سب کہاں تھے۔ کبھی سنی ہوئی ایک بات شدت سے یاد آئی۔ ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

اکثر جب سالم اس کے پاس ہوتا تھا تو ایسے چینلو لگا دیتا، جس میں قرآن و سنت کی تعلیمات یاد کروائی جائیں۔ شاید کبھی کسی چینل پر قیامت کا ذکر سنتے ہوئے یہ آیت سنی تھی...... اور جب اسے یاد آیا کہ وہ کتنی بے زار ہو کر چینل بدل دیا کرتی، ساتھ ہی سالم کو بوڑھی روح کا طعنہ دے کر...... مگر آج اسے لگ رہا تھا اس کی تنہائی، بے بسی اور دکھ، دل کا بوجھ اٹھانے والا کوئی نہیں، گویا یہ وارننگ محض افسانہ نہ تھی۔ بے ساختہ کئی آنسو خود بخود آنکھوں سے نکل آئے۔

☆......☆

کئی دن گزر گئے...... بھوک، پیاس، تھکن...... اور سفر ناتمام...... پھر دو راتیں، دو دن عارضی قیام گاہوں میں جو کہ لاتعداد خیموں کی شکل میں نہ جانے کن کن NGo`s نے بنا ڈالی تھیں وہ ہر لمحہ سبرین کو ڈھونڈتی پھری...... لیکن اسے نا ملنا تھا نا ملی...... وہ تو نہ ملی مگر ہانیہ کو زندگی کی حقیقتیں اتنی شدت سے کبھی محسوس نہ ہوئی تھیں جیسے اب ہوئیں، ایک ایک خیمے میں پندرہ بیس لوگوں کا قیام...... کھانے کے نام پر برائے نام ابلی ہوئی دال کا ایک وقت میسر آنا، صاف پانی ناپید...... بیماریوں اور آنسوؤں کا سیلاب...... دکھی دلوں کا تڑپنا...... بے گھر ہو جانے والوں کی آہیں......

ہانیہ کو لگتا وہ آسمان سے گرا دی گئی ہے اور خلاء میں معلق ہے۔ نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن......

وہ اس آسیب زدہ ماحول سے فرار بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی بیٹی اسے مل نہیں رہی تھی مگر یہاں رہنا بھی اس کے لیے ہر لمحہ اذیت ناک تھا۔ اسے اپنا گھر، گھر کا عیش و آرام ایک خواب لگنے لگا گویا وہ کوئی قصرِ عنکبوت'' تھا۔ یعنی محل نما مکڑی کا گھر۔

محل جیسا بھی ہو مگر یہ مکڑی کا جالا کتنا ناپائیدار اور بے وزن اور بے وقعت ہوتا ہے، ایک ذرا سی پھونک سے بکھر جانے والا۔ چھن جانے والا...... ٹوٹ جانے والا...... گویا اس کا محل جیسا گھر ایک نہیں کئی محل، ہر دنیاوی لذت اور آسائش سے بھرپور گھر، آج قصرِ عنکبوت'' ثابت ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ایک زوردار جھٹکے سے اسے بکھیر دیا گیا تھا۔ نہ دولت، نہ اسٹیٹس...... نہ شوہر نہ...... کوئی دوست...... بس وہ تنہا تھی...... نہ جانے کتنے لوگوں سے مدد مانگ چکی تھی۔ بالآخر تین دن کی انتہائی تگ و دو کے بعد سبرین انتہائی بدحال اور بے قرار روتی بلکتی دکھائی دی۔

ہانیہ کو تو گویا زندگی مل گئی۔ اسے لگا، اس کے سر پر آسمان آ گیا ہو۔ پھر وہاں کی شدید گرمی اور بھوک پیاس بھی برداشت کرتیں وہ دونوں بالآخر کسی نہ کسی طرح اپنے شہر واپس آ ہی گئیں۔ ہانیہ تو خیر تھی ہی ہراساں...... سبرین پر تو ان ساری باتوں نے انتہائی نفسیاتی دباؤ ڈالا تھا اور وہ تو بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ سالم ساری بات سن کر پہنچا تھا مگر اس بار وہ ان دونوں کے درد کا کوئی سامان خرید کر نہ لا سکا کہ سکونِ قلب بھی کبھی دولت سے ملا ہے؟

☆......☆

''ہانیہ پلیز، خود کو سنبھالو! بھول جاؤ سب کچھ، تم تو کہتی ہو زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ تم دوبارہ زندگی کی طرف کیوں نہیں آ جاتیں۔'' سالم بڑی بے بسی سے مخاطب تھا۔

ہانیہ کی صحت، اس کا مزاح...... اس کی خوش ذوقی اور اس کی ہنسی...... ترس گیا تھا وہ...... کبھی سبرین کو سنبھالتا تو کبھی ہانیہ کو سمجھاتا۔ ابھی وہ انہیں سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ کعب کی طرف سے Mail موصول ہوئی کہ اس کا ایڈمیشن کینسل کر دیا گیا تھا۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ ایک دھماکا تھا جو اس کے سر پر ہوا۔

سالم کو سمجھ نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس نے اسے Reply کیا کہ وہ خود اس کے پاس پہنچ رہا ہے۔ وہ نہ آئے لیکن کعب تین دن بعد ہی واپس آ پہنچا۔ انتہائی کمزور جسم، آنکھوں کے گرد حلقے...... بے نور آنکھیں اور نڈھال نڈھال سا، اس کو دیکھ کر سالم کوئی سوال نہ کر سکا...... خود ہی کعب نے اپنے ایڈمیشن کینسل ہونے کی روداد سنائی۔ فحش ماحول...... بے حیا دوستوں کی صحبت، برائی کی ترغیب...... اس پر ہر طرح کی مادر پدر کی آزادی۔ ماں باپ سے دوری، ہر طرح کے تعیشات کا ملنا اسے بہت کم عمری میں تباہ کر گیا تھا اور ناکارہ لوگوں کو تو ویسے بھی سوسائٹی اٹھا کر پھینک دیتی ہے۔

سالم کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کیا کھویا، کیا پایا؟ آج پُرسکون سا گھر بکھر گیا تھا۔ جسے اب کوئی سنبھالنے والا ہی نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے......؟ کیونکہ ہم بھول جاتے ہیں کہ واحد سہارا پروردگار کی ذات ہے، ہم نے اسے چھوڑا تو آنے والے کل میں کوئی ہمیں سہارا نہ دے گا!! وقت پھر سے آواز دے...... مگر اب صرف اے کاش!!...... اے کاش!!

◆

غزل

کون کہتا ہے کہ تعلیم رفو دیتا ہے
عشق تو چاکِ گریبانی کی خُو دیتا ہے

سلسلہ اپنا اُسی اسمِ بقا بخش سے ہے
جاں بہ لب حرف کو جو آبِ نمو دیتا ہے

ہم جو اِک یاد کی لذت سے شکم بھرتے ہیں
تُو سمجھتا ہے کہ یہ رزق بھی تُو دیتا ہے؟

یار کی موج ہے! عُشاق کو وہ اذنِ سخن!
نہیں دیتا ہے کبھو اور کبھو دیتا ہے

دیکھ یہ شوقِ شہادت کہ ترا دیوانہ
خدمتِ تیغ میں خود بڑھ کے گلو دیتا ہے

بُردِ دریا ہو مجھے پاکی و ناپاکی کیا؟
اور تُو ہے کہ مجھے حکمِ وضو دیتا ہے

جتنی عزت تیرے احباب تجھے دیتے ہیں
اُس سے بڑھ کر تو مجھے میرا عدو دیتا ہے

تا کہ مستی میں علی فرق نہ رہ جائے سو وہ
اپنے ہشیار کو بھر بھر کے سُبو دیتا ہے

علی زریون

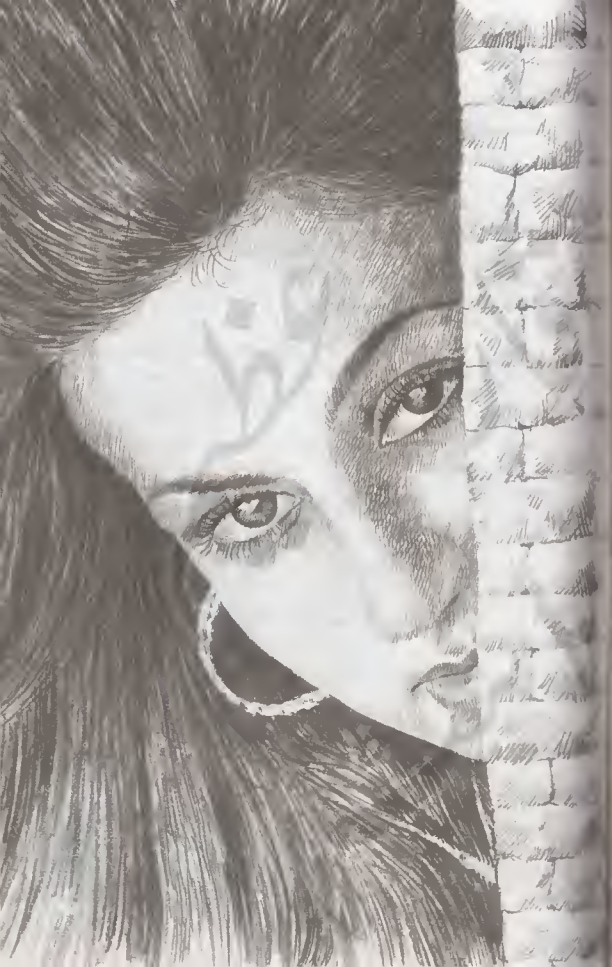

سلسلہ خاص

ارم زہرا

چاند میرا منتظر

ہمارے اطراف میں سانس لیتے کرداروں سے سجی، سلسلہ وار ناول کی نویں قسط

گوہر ایک بھرے پُرے، روایات سے جڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ قسمت اسے رضا بیگ جیسے بندے سے یونیورسٹی میں ملا دیتی ہے۔ گوہر شادی کے بعد رضا کے گھر آ جاتی ہے۔ رضا کی ایک بہن سبیکہ ہے اور ماں صولت بیگم، باپ سائیں رئیس بیگ ہیں۔ صولت بیگم خواہشوں کے حصول کے لیے ہر ناجائز حربہ استعمال کر کے تنِ تنہا اس خاص مقام تک پہنچی ہیں۔ جہاں امیر زادے ان کی ایک ابرو کی جنبش پہچانتے ہیں۔ سبیکہ بیگ ماں کا دایاں بازو بننے کے لیے تیار ہے۔ دونوں ماں بیٹی ہائی سوسائٹی کی جان بن چکی ہیں۔ گوہر کا بھائی فاضل ہے۔ مطالعے کا بے حد شوقین ہے مگر انٹر تک تعلیم حاصل کر پایا ہے۔ گھر میں ذکیہ بیگم کی راجد ھانی ہے۔ بہوویں قدسیہ اور کشور اس گھر میں آل اولاد سمیت ہنسی خوشی، دکھ سکھ بانٹتی زندگی گزار رہی ہیں۔ ذکیہ بیگم کی نواسی ہانیہ بھی یہیں رہتی ہے جو اپنی ماں کے انتقال کے بعد باپ سے بھی دور ہے۔ گوہر کے لیے آہستہ آہستہ رضا کے گھر کا ماحول اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ بہت سارے سوال جواب طلب ہیں اور جب اس پر کچھ حقیقت آشکار ہونے لگی تو ہانیہ ماموں فاضل کے لیے کڑھتی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی طور اس نے فاضل کو آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے راغب کر لیا۔ فاضل کی کتابوں سے دوستی اسے لائبریرین کے روپ میں لے آئی۔ سائیں رئیس اپنے گھر سے اب بھی دور ہیں۔ سبیکہ اور صولت بیگم دن بدن کھل کر گوہر کے سامنے آتی جا رہی ہیں۔ رضا کی گوہر سے محبت عروج پر ہے۔ جو ماں بیٹی کے لیے فکرمندی کا باعث ہے۔ سبیکہ فاضل میں دلچسپی لے رہی ہے مگر فاضل اس کے ناز و ادا کے جال میں کسی طور پر نہیں آ پا رہا۔ ذکیہ بیگم کے گھر کی رونقیں آباد ہیں، ہانیہ امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ آگے پڑھنے کے لیے اسکول سے اسے استعفیٰ دینا پڑتا ہے اسکول والے اس کے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں اور...... فاضل کی ملاقات فرح نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔ وہ اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ہانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں کا ماحول اسے خوب راس آتا جا رہا ہے اور اُس کی علمی تشنگی سیراب پانے لگی ہے۔ سبیکہ شہرت کے زینے پر قدم رکھ چکی ہے۔ اُس کا بوتیک اعلیٰ پیمانے پر لانچ ہو چکا ہے۔ صولت بیگم، سبیکہ کو اپنی جانشین بنانے کی پوری تگ و دو میں مصروف ہیں۔ سبیکہ ہائی سوسائٹی موو کر رہی ہے مگر اس کا خون اُسے اکثر احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ قسمت کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ گوہر اور رضا سائیں رئیس سے ملنے آبائی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں اُن کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔ سائیں رئیس اپنے آبائی گوٹھ سے الیکشن لڑنے کی پوری تیاری کر لیتے ہیں۔ اس بات کی خبر صولت بیگم کو ہو جاتی ہے اور...... **اب آپ آگے پڑھیے:**

نظر کے سامنے حسنِ بہار رہنے دو
جمال دید کو پروردگار رہنے دو
سوال شوق کا کوئی جواب ہو کہ نہ ہو
ہمارے دل میں اُمید بہار رہنے دو

''واہ کیا شعر داغا ہے۔'' خوشبو نے دور سے آتی آواز کی جانب دیکھا۔

ہانیہ کی نظریں بھی بے اختیار اسی جانب مڑ گئیں۔

''اوہ طلال بھی لگتا ہے کہ بزمِ شاعری میں جلوہ گر ہونے کی تگ و دو میں ہے۔'' ہانیہ نے کلاس فیلو، طلال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانتی تھی۔ اس کی زبان میں خارش نہ ہو۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔'' خوشبو نے ناگوار نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔

سرمئی رنگ کے سوٹ میں، وہ خاصے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

''طلال کے بچے ہمارے حال پر رحم کرو۔'' خوشبو نے گھبرانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''کیوں چھیڑ رہی ہو اسے؟'' ہانیہ نے آنکھیں دکھائیں۔

''ادے تم دونوں یہاں بیٹھے ہو؟ اگر طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو ایک پھڑکتا ہوا شعر عرض کروں؟'' طلال نے باقاعدہ گلا کھنکارتے ہوئے سوال کیا تو دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

شعر عرض ہے کہ

کرم شعار نہ، تھے معتبر نہیں ٹھہرے

''اوہ خدا کے لیے طلال...... سچ میرے سر سے گزر گیا۔'' خوشبو نے جلدی سے ٹوکا۔

''ہاں پلیز ہمارے صبر کا امتحان نہ لو۔'' ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے دوستو، ابھی تم لوگوں نے سنا ہی کہاں ہے۔ میں تو کتنے ہی مجموعے گھول کر پی چکا ہوں۔ بس ایک بار شعری نشست سج جائے، جیت کر دکھانے دوں تو میرا۔''

''ہاں طلال کی جگہ تمہیں کچھ بھی پکار لیں گے مگر پلیز ہمارے حال پر رحم کرو۔'' خوشبو اسے چھیڑ کر اب سخت کوفت میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ ایک باذوق انسان کی ایسی حوصلہ شکنی؟''

''تم کورس کی کتابوں کی جگہ شاعری کی کتابوں کو رٹ رہے ہو۔ افسوس کی بات ہے۔'' ہانیہ نے پُر ملال انداز میں کہا تو طلال کراہ کر رہ گیا۔

''بدذوق ہو تم لوگ، ابھی کوئی اور ہوتا۔ واہ...... واہ کی رٹ لگا رہا ہوتا اور تو اور......''

''بس بس، شکر ہے یہاں اور کوئی نہیں۔'' خوشبو نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

''ہاں...... ہاں مجھ سے بھی تم لوگوں کے مخالفانہ رویے برداشت نہیں ہو رہے۔ جا رہا ہوں میں۔'' طلال ناگواری کے تاثرات لیے مڑ گیا۔

''خوشبو کی بچی۔'' ہانیہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اپنا جرنل، خوشبو کے سر پر دے مارا۔

ڈاکٹر نگہت نسیم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

مٹی کا سفر

شائع ہو گیا ہے

ایک ایسی مصنفہ جو مسیحا بھی ہے اور تخلیق کار بھی......

دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے آباد افسانے جو اپنی مثال آپ ہیں۔

کتاب ملنے کا پتہ

مثال پبلشرز

رحیم سینٹر۔ پریس مارکیٹ۔ امین پور بازار۔ فیصل آباد

(Contact No. 0300-6668284)

”ارے یار حلیہ دیکھا ہے اس کا۔ بالکل مجنوں جیسا، 2012ء کا ماڈل مجنوں۔“ خوشبو مسلسل ہنس رہی تھی۔
”بہت بری بات ہے۔“ ہانیہ نے خوشبو کے بازو پر چٹکی کاٹ لی۔
”آؤچ! جنگلی بلی۔“ خوشبو بلبلا اٹھی۔
”یہ بتاؤ، یہ جو دوسروں کا مذاق اڑاتی پھر رہی ہو۔ تمہاری اپنی تیاری کیسی چل رہی ہے؟ اب دن کم رہ گئے ہیں۔ شعر وغیرہ رٹے یا پھر ناک آؤٹ ہونے کا پروگرام ہے۔“ ہانیہ نے ابرو اچکا کر خوشبو کو دیکھا۔
”ارے نہیں بھئی، بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے تم ہی اچھی ہو۔ سُر اور لے میں سنا تو لیتی ہو۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔“ خوشبو نے برجستہ جواب دیا۔
”گانے کو نہیں کہا ہے بے وقوف، شعری مقابلہ ہے یار۔“ ہانیہ کتاب کو گھورتے ہوئے بولی۔
”ہاں جو بھی ہو مجھے معاف کرو۔ اپنی کہو، تیاری کیسی چل رہی ہے؟ آخر آل ساحر لدھیانوی کو Tribute دینا ہے۔“ خوشبو نے اپنائیت سے اپنا دفاع کیا۔
”جاؤ میں بھی شرکت نہیں کر رہی۔ میں تو تمہاری وجہ سے دلچسپی لے رہی تھی۔“ ہانیہ نے اگلے ہی لمحے اپنا دامن چھڑایا۔
”اوہ نو۔ کہا ناں کتنی پیاری شخصیت جج کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ تم بالکل بھی یہ پروگرام مس نہیں کرنا۔ دو باذوق لوگ ایک ساتھ ہوں گے تو مجھے دلی خوشی ہوگی۔“
خوشبو بے مقصد بیگ کی زپ کھولتے اور بند کرتے ہوئے بولی۔ ”میں کوئی جج کی وجہ سے Participate (شرکت) نہیں کر رہی۔ شاعری تو مجھے ویسے ہی متاثر کرتی ہے اور یہ بار بار ریان کا نام نہیں لیا کرو میرے سامنے۔“ ہانیہ کا لہجہ کاٹ کھانے والا تھا۔
”لیکن میں نے نام تو ایک بار بھی نہیں لیا۔“ خوشبو نے چہکتے ہوئے کہا تو ہانیہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔
”سدھر جاؤ۔“

یہ اداس، اداس چہرہ یہ مٹا مٹا تبسم
کسی گل کی بے رخی کا یہ شکار تو نہیں ہے

”طلال جو دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ایک دم بول پڑا۔
”تم پھر ٹپک پڑے۔“ خوشبو نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔
”اس سے پہلے کہ ہم کچھ گل کھلائیں۔ یہاں سے نکلتے بنو۔“ ہانیہ نے سب سے موٹی جلد والا رجسٹر ہوا میں لہرایا اور طلال کے سر کی طرف بڑھانے ہی لگی تھی۔
وہ چیخا۔ ”قلبی چوٹ کے بعد جسمانی چوٹ افورٹ نہیں کر سکتا۔ میں تو بتانے آیا تھا کہ نوٹس بورڈ دیکھ لو، امتحانی شیڈول لگ چکا ہے وہاں۔“
”کیا ڈیٹ شیٹ آگئی ہے؟“ ہانیہ اور خوشبو بیک وقت چلائیں۔
”نیکی کرنا آج کے دور میں بے کار ہے۔“ طلال منہ بسورتے ہوئے بولا۔
”ارے نہیں تھینکس۔ وہ تو بس۔“ ہانیہ منمنائی۔
”اگر آپ لوگوں کے پاس ٹائم ہو تو دیکھ لیجیے گا۔ میں جا رہا ہوں۔“ طلال برہمی کے تاثرات چہرے پر

سجائے مڑ گیا۔
ہانیہ اور خوشبو چیخ و پکار کے ساتھ نوٹس بورڈ کی طرف لپکیں۔

☆......☆

وہ فان کلر کے سوٹ میں تھی۔ کلائیوں میں میچنگ چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ پیروں میں نازک سی سینڈل اور گولڈن پازیب جو اس کے بات بات پر پیر ہلانے سے بج رہی تھی۔
”کیسی ہو سارہ؟“ صولت بیگم، ڈرائنگ روم میں صوفے پر دراز سارہ کو دیکھ کر ٹھٹکیں۔
”آنٹی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“ سارہ بے تکلفی سے گویا ہوئی۔
”ماما آج میں نے سارہ کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں ہم دونوں اکٹھے نہیں بیٹھے۔“ سبیکہ اپنے حواس سنبھالتی ہوئی مخاطب ہوئی۔
”ارے ہاں کیوں نہیں سویٹ ہارٹ، انجوائے کرو۔ یہی تو تم لوگوں کی عمریں ہیں۔“ صولت بیگم جواباً بولیں۔
”اور بھئی سارہ، آج کل کیا ہو رہا ہے؟“ صولت بیگم نے بے اختیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”کچھ خاص نہیں، آنٹی فری ہوں۔ سوچ رہی ہوں، سبیکہ کی کچھ ہیلپ ہی کر دوں۔ مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے ڈیزائننگ کا۔ دیکھیے تو یہ سوٹ میں نے خود ڈیزائن کیا ہے۔“ سارہ نے بے اختیار دوپٹہ گلے سے کھینچا اور گلے کا ڈیزائن صولت بیگم کو دکھانے لگی۔
”اوہ واہ!“ سیٹی کے انداز میں لب سکیڑتی صولت بیگم سارہ کی فٹنس کا جائزہ لے رہی تھیں۔
”ارے ہاں، یار تم نے تو بہت اچھا ڈیزائن کیا ہے۔“ سبیکہ خوشی سے بولی۔
”لیکن اس میں کچھ Technical Mistakes ہیں؟“ سبیکہ بولی۔
”اب تم Expert (ماہر) ہو۔ تم سے آگے تھوڑی نکل سکتی ہوں۔“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”سارہ تم ماڈلنگ کیوں نہیں کرتیں؟“ صولت بیگم نے سارہ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
”نہیں آنٹی مجھے ماڈلنگ پسند نہیں۔ کپڑوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ جسم کی نمائش جو ہوتی ہے۔ اس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔“ سارہ کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ کھیل گئی۔
وہ جانتی تھی، صولت بیگم ایک مایہ ناز انسٹرکٹر ہیں۔ اس کی اس بات سے اتفاق نہیں کریں گی۔
”اپنی اپنی سوچ ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی، تمہارے پاس بیوٹی بھی ہے اور فگر بھی ہے۔ Hieght بھی تمہاری Perfect ہے۔ پھر Try کیوں نہیں کرتیں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے سارہ کو تک رہی تھیں۔
”رہنے دیں ناماما، اس کی مرضی اگر اس کی دلچسپی نہیں ہے تو آپ کنوینس کیوں کر رہی ہیں؟“ سبیکہ نے بے اختیار کہا، گویا ماں کے الفاظ دل کے کسی گوشے میں چبھن پیدا کر رہے ہوں۔
”مرضی ہے اس کی، ویسے کامیابی، عزت، دولت سب اس کے قدم چومے گی کیونکہ اس کے پاس Natural Beauty ہے۔ یو نو سارہ ڈارلنگ، میرے پاس جو ماڈلز آتی ہیں وہ چار گھنٹے میک اپ کروانے، بال سنوارنے کے بعد بھی اتنی حسین نظر نہیں آتیں جتنی تم بغیر میک اپ کے لگتی ہو۔“ آخر دل کی بات صولت بیگم کی زبان پر آہی گئی۔

"تھینکس آنٹی۔ اصل میں مجھے یہ فیلڈ پسند نہیں ہے اور سب سے بڑی بات مجھے میری ممی، پاپا اجازت بھی نہیں دیں گے۔"

"ہاں یہ الگ بات ہے۔" صولت بیگم نے خاموش بیٹھی، سہیکہ کو نظروں کے اشارے سے اسے کنوینس کرنے کو کہا۔

"لیکن ماما یہ Media کی دیوانی ہے۔ کوئی ڈرامہ، کوئی فیشن شو نہیں چھوڑتی۔" سہیکہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"خیر اس کی مرضی، جو اس کو اچھا لگے۔ تمہاری دوست ہے ناں تو ہوگی تمہاری ہی طرح خودسر۔" صولت بیگم کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"ارے نہیں آنٹی میں سوچوں گی اس بارے میں۔" سارہ نے صولت بیگم کے بدلتے تیور دیکھے تو یکدم نروس سی ہوئی۔

"ماما اپنی دوست کو منانا مجھے خوب آتا ہے۔ اچھا ہمارے ساتھ ڈنر تو کریں گی ناں آپ؟" سہیکہ نے آہستگی سے پوچھا۔

سارہ کے چہرے کے تاثرات آہستہ آہستہ بدل رہے تھے۔

"یس ڈارلنگ کیوں نہیں، تم نے سرونٹ کوارٹر کا کہا جب تک میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" صولت بیگم اپنے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

"سارہ ام کی بات کا برا نہیں منانا، بس وہ یونہی۔"

"ارے نہیں، میں جانتی ہوں۔" سارہ نے بال سمیٹتے ہوئے کشن گود سے ہٹایا اور کھڑی ہوگئی۔

"چلو آؤ ڈائننگ ہال کی طرف چلتے ہیں۔" سہیکہ نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

سارہ کی آنکھوں میں سوچوں کے بھنور آج گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

☆.....☆

"ارے آپ!!" فاضل، فرح کو دیکھتے ہی اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

وہ بے حد اداس، پریشان نظر آ رہی تھی اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی فاضل کے قریب رکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی، جس پر واپسی کی انٹری دو ماہ پہلے کی تھی۔

"معذرت خواہ ہوں آپ سے۔" فرح آہستگی سے بولی۔

فاضل کو فرح کی آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ملال بھی نظر آیا، وہ بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

"میں آپ کے گھر آنے کا سوچ رہا تھا۔ بہت فکرمند ہو رہا تھا آپ کے لیے۔ اچھا ہوا آپ آگئیں۔" حیرت اور خوشی سے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے وہ بولا۔

"جی یہ رہی کتاب، میں خود بہت شرمندہ ہوں۔" وہ آہستگی سے کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا طبیعت خراب تھی آپ کی؟" فاضل کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا سوال کرے۔

"نہیں! بس یوں سمجھ لیجیے کہ بعض دکھ اور غم انسان کی ہمت اور برداشت سے باہر ہوتے ہیں یا شاید میں ہی کم ہمت ہوں۔"

"آپ اور کم ہمت!! نہیں آپ تو بہت بہادر ہیں۔" فاضل نے فرح کے ہاتھ سے کتاب لے کر رجسٹر کے صفحات پلٹنے شروع کر دیے۔

"ہم تقدیر کا نام لے کر اپنے آپ کو بہت اچھی طرح بہلا لیتے ہیں لیکن کچھ ایسی پریشانیاں اور مصائب ہماری زندگی میں آتے ہیں جو ہمیں خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔" فرح کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے فاضل کو ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"پلیز فرح!" فاضل کو یہ نظریں اپنی روح میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"ایسا کیا حادثہ ہو گیا ہے آپ کے ساتھ کہ آپ یکسر ہی بدل گئی ہیں۔ کرب فاضل کے چہرے پر بھی اُمڈ آیا تھا۔

"اب میں چلوں گی، کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بار بار ذکر روح پر کچوکے لگاتا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"جی ٹھیک ہے، جیسا آپ بہتر سمجھیں۔ ویسے آپ مجھے اپنا بہترین دوست سمجھ سکتی ہیں۔" فاضل نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اسے کہا۔

"یقیناً!" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"یہ میرا نمبر رکھ لیجیے اگر کبھی ضرورت محسوس ہو تو یاد کر لیجیے گا۔" فاضل نے سادے کاغذ پر اپنا نمبر لکھتے ہوئے فرح کی جانب بڑھایا۔

"تھینکس آپ مجھے میرا کارڈ دے دیجیے۔" فرح کا لہجہ اٹل تھا۔

"کیا!!" فاضل کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"کوئی دوسری بک نہیں لیں گی؟" فاضل ہونق چہرے کے ساتھ گویا ہوا۔

"پھر کبھی سہی!" وہ آہستگی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

فاضل نے بادل نخواستہ فرح کا کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

وہ زبردستی مسکرا دی۔ "دعا کیجیے گا کہ مجھے سکون مل جائے۔"

"مگر آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟" فاضل کی بے اختیاری میں آواز بلند ہوئی۔ لائبریری میں فاضل کی آواز پر سب ہی متوجہ ہوئے مگر اگلے ہی لمحے فاضل نے دونوں ہاتھ اٹھا کر معذرت کی اور تاسف کے انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔

فرح حیرانی کا تاثر چہرے پر لیے مڑ گئی۔ وہ فاضل کو خائف نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ فاضل کا دل چاہ رہا تھا، اسے جتنی دھوپ سے چھاؤں میں لے آئے۔ اس کے وجود پر صحرا جیسا سناٹا جو طاری ہے۔ اسے سائے کا آسرا دے دے۔ وہ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک سوچتا رہا۔

"اوہ گاڈ! آخر یہ لڑکیاں اتنی مشکل کیوں ہوتی ہیں؟" ایک موٹی سی جلد والی کتاب پر جھکا فاضل بے مقصد صفحے پلٹنے لگا۔

☆.....☆

یونیورسٹی میں مشاعرے کا انعقاد بڑی ہی خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ بڑے سے اسٹیج کے دونوں اطراف ساحر لدھیانوی کے بڑے بڑے پوسٹر آویزاں تھے۔ ہر پوسٹر ساحر کی خوب صورت شاعری سے آباد تھا۔ اسٹیج

کے بیک پر موجود بڑے سے پینا فلیکس پر ساحر کی مسکراتی تصویر، سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی گیٹ سے لے کر ہال تک ریان علی کے نام کے بینرز دیواروں پر نصب تھے اور آہستہ آہستہ پورا ہال شوخ رنگوں اور رنگ برنگے آنچلوں سے سجتا چلا گیا۔

اسٹیج پر موجود ہوئی میزبان نے مشاعرے میں حصہ لینے والے اسٹوڈنٹس کے نام لے کر انہیں اسٹیج پر بلانا شروع کیا۔

"تم نے تو سچ مجھے پھنسا دیا ہے۔" خوشبو نے منہ بناتے ہوئے پہلا قدم اسٹیج کی جانب بڑھایا۔

"کوئی بات نہیں۔" ہانیہ بے اختیار مسکرا دی اور پھر ایک ایک کر کے لڑکے اور لڑکیاں اسٹیج پر اپنی اپنی جگہیں سنبھالتے رہے، مہمانِ خصوصی کی کرسی ابھی خالی تھی۔

"اف جو شخص ٹائم پر نہیں پہنچ سکتا، وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔" ہانیہ نے بے اختیار کہا۔

"رہنے دو موصوف بڑے، بڑے کام کر چکے ہیں اور دنیا الگ ان کی دیوانی ہے۔" خوشبو نے برجستہ جواب دیا۔

"تم دونوں کمسر پھسر نہیں کرو۔" طلال نے دونوں کو آنکھیں دکھائیں۔

"دیکھنا آج کے مشاعرے کا وزن یہی ہوگا۔ کل رات سے اس نے بولنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ مبادا کہیں کوئی شعر نہ بھول جائے۔"

"ہیں؟" ہانیہ نے حیرت سے طلال کی جانب دیکھا، جو ہاتھوں کے اشارے سے کچھ سمجھانے کی کوششوں میں تھا۔

"ایک سے بڑھ کر ایک۔" ہانیہ مزید کچھ بولتی کہ پورے ہال میں شور مچ گیا۔

"ریان علی آ گئے! ریان آ گئے!"

اسٹائل سے چلتے ہوئے ریان علی اسٹیج تک پہنچ گئے۔ سوٹ بوٹ میں ریان کی شخصیت دیدہ زیب لگ رہی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، تو رار نگ، مسکراتے لب، سارے ہی اسٹوڈنٹس کے چہروں پر خوشگوار یت رقص کرنے لگی۔

ریان علی کو بڑے ہی احترام کے ساتھ سب سے آگے مختص کی گئی سیٹوں پر بٹھایا گیا، ایک فائل اور پین، ان کی جانب بڑھا دیا گیا۔

"اوئے ہوئے، میں تو سوچ رہی تھی کہ کوئی پچاس، ساٹھ سال کے جج ہوں گے یہ تو....." ہانیہ بے اختیار ہنس دی۔

"لیکن میں جانتی تھی۔ کیوں ہینڈسم ہے ناں!" خوشبو نے آنکھ ماری۔

"بے ہودہ۔" مگر ہانیہ کی آواز ڈائس پر سے آتی میزبان کی آواز میں دب گئی۔

ملک کے مشہور شاعر اور سنگر ریان علی ہمارے درمیان جلوہ افروز ہو چکے ہیں تو آیئے آج کی تقریب کا آغاز کرتے ہیں۔"

"سنو، تمہارا نام کون سے نمبر پر تھا؟" خوشبو نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہانیہ کو دیکھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" ہانیہ نے اس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"یار کہیں بے عزتی نہ ہو جائے میری، بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے مجھے۔" خوشبو نے منہ بسورا۔

"ارے میری بینا، کچھ نہیں ہوتا۔ Be Confident۔"

"میں ساحر کی پہلی طویل نظم "پرچھائیاں" سے کچھ بند آپ کی سماعتوں کی نظر کروں گا۔ یہ وہ نظم ہے، جس کے لیے ساحر لدھیانوی نے کہا تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے، وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوب صورت دنیا دے کر جائے۔ اس طویل نظم کا ایک حصہ آپ کی نذر....."

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے، خوابوں کی سرزمیں کی طرح
"واہ! واہ! کیا کہنے۔"
"ارے یہ تو پکا ساحر کا جانشیں نکلا۔"
"جیو احمد۔" پورا ہال مختلف ریمارکس اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ نظم ابھی جاری تھی کہ پرنسپل خراماں، خراماں چلتی ہوئی، ڈائس کے قریب رکھی، سیٹوں کی جانب بڑھ گئیں۔

"لو یہ اب آئی ہیں۔" طلال نے ہونٹوں کی طرح ہانیہ اور خوشبو کو دیکھا۔

"طلال، اب تمہیں اسٹیج پر بلایا جائے گا۔" مس شمع نے آہستگی سے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"پلیز میری Entry کینسل کروا دو۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔ دیکھو تو ذرا پوری یونیورسٹی جانے کہاں سے امڈ امڈ کر یہاں پہنچ گئی ہے۔ مجھ سے تو سب کہہ رہے تھے کہ ہم نہیں آئیں گے مشاعرے میں۔" خوشبو نے اپنی آنکھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"ہاں، ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ ہانیہ کی معنی خیز مسکراہٹ نے خوشبو کو اور الجھا دیا۔

"ارے چپ کرو، طلال اسٹیج پر پہنچ چکا ہے۔" خوشبو نے اسٹیج کی طرف دیکھا۔

"نذر کالج۔" طلال نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا تو سب ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
بصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
اے وادیِ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تیری بارگاہ میں
تُو آج بھی ہے میرے لیے جنتِ خیال

ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال

"اوئے ہوئے طلال زبردست...... زبردست......" ہال سیٹیوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔

"اماں یار، آگے تو سن لو۔" طلال سے شور برداشت نہیں ہوا۔ "ہاں بھئی سناؤ سناؤ۔"

تیری نوازشوں کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا
تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بو کے حسین کارواں کی خیر
دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بچی رہیں

"یہ آخری مصرعے میں نے اس یونیورسٹی کی لڑکیوں کے لیے سنائے تھے۔" طلال بتیسی نکالے لڑکیوں کے جھمگٹے کو دیکھ رہا تھا۔

"بھئی واہ مزا آ گیا۔" طلال نے ہم لڑکوں کے احساسات کی خوب منظر کشی کی۔" یہ منچلا عدنان تھا۔

"اس کا مطلب ہے ساحر لدھیانوی بھی ہماری طرح اس عشق و مشک کے چکر میں الجھے رہے ہوں گے۔"

"بھئی اسی لیے تو ان کی شاعری میں اتنا حسن تھا۔"

"ذرا ہم لڑکیوں کی باری تو آنے دو۔ پھر دیکھتے ہیں تم لوگوں کو۔" یہ فائنل ایئر کی عظمیٰ تھی۔

دبی دبی آوازیں اور ہلکا شور ہوا میں رقص کر رہا تھا مگر ڈائس پر آتے ہی میزبان کی خوب صورت آواز پر سب دوبارہ متوجہ ہو گئے۔

☆......☆

"بابا سائیں، ہم سوچ رہے تھے کہ آج شہر واپس چلے جائیں۔" رضا نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچتے ہوئے بابا کو مخاطب کیا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ جیسی تم دونوں کی خوشی۔" وہ آہستگی سے بولتے ہوئے کسی خیال میں گم ہو گئے۔

"بابا ہمیں آپ سے کچھ کہنا تھا؟" گوہر کا لہجہ اس کی ذہنی خلفشار کی غمازی کر رہا تھا۔

"ہاں کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟" سائیں رئیس نے گوہر کی طرف دیکھا۔

"بابا سائیں، سبیکہ کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔ وہ دن بدن پستی میں اترتی جا رہی ہے۔ ماما کا رویہ اس کی ڈھال بن چکا ہے۔ ایسے میں تو وہ اپنا بہت نقصان کر دے گی۔" گوہر کچھ جھینپے جھینپے سے لہجے میں بتا رہی تھی۔

"ہاں بابا سائیں، وہ انتہائی منہ پھٹ اور بدزبان ہو چکی ہے۔ اچھے برے کی تمیز وہ ختم کر چکی ہے۔ ہماری ہر صحیح بات بھی اسے غلط لگتی ہے۔ آپ ہی اسے کچھ سمجھائیں پلیز۔" رضا جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"جانتا ہوں۔" کسی بھی ردعمل کے اظہار سے باز رہتے ہوئے انہوں نے مختصراً جواب دیا۔

"تو اس کا حل؟" رضا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس کا رشتہ ڈھونڈ اور شادی کر دواؤ۔ خود ہماری نظر میں بھی کئی ایک رشتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ

ہماری پسند ٹھکرا دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ اس کے لیے رشتہ تلاش کرو۔" سائیں رئیس کے لہجے میں گہری تھکن کے سے آثار تھے۔

"بابا، آپ سبیکہ کو کیوں نہیں سمجھاتے؟" گوہر نے پوچھا۔

"میری بچی، میں تمہیں کیا بتاؤں، جس آشیانے کو سنوارنے کے لیے میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اسے تمہاری ساس ٹھوکر مار کر چلی گئی۔ دونوں بچوں کو تربیت کی خاطر اس نے اپنے پروں میں چھپا تو لیا لیکن ان کی تربیت اس نے اسی انداز میں کی جس کا میں سخت مخالف تھا۔ یہ تو رضا سمجھدار تھا۔ ہمارے خاندانی طور طریقوں سے واقف تھا، اس لیے آج پرسکون زندگی گزار رہا ہے مگر سبیکہ!! وہ مکمل ماں کے زیر اثر رہی ہے تو ظاہر ہے اس کی مکمل پرچھائیں بنی۔" سائیں رئیس کے لب و لہجے میں گہرے دکھ کے آثار تھے۔

"افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ ماما کی ترجیح، صرف اور صرف پیسے کا حصول ہے اور اب ان کی اس روش پر چلتے چلتے سبیکہ دن اور رات ایک کر رہی ہے۔ سبیکہ بوتیک، اس کی آرزو کی پہلی منزل ہے۔" گوہر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بابا، وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے نام سے پہچانی جائے اور جس دن اس نے ماما کے زیر اثر رہنے سے انکار کر دیا۔ خدانخواستہ، وہ دن اس کے لیے آتش فشاں بن جائے گا۔" رضا کا سر جھکا ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟" سائیں رئیس نے چونک کر رضا کو دیکھا۔

"ماما بہت مطلبی خاتون ہیں۔ وہ سبیکہ کو صرف اپنی کامیابی کی سیڑھی کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔"

"لوگوں کے سامنے عمدہ اور اعلیٰ دکھائی دینے کے چکر میں صولت جو مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کا ثمر اسے سبیکہ کی صورت تو ملنا ہی تھا۔ ہر کام میں میری مرضی، میرے نظریات، میری ضرورت اور میرا نقطۂ نگاہ، آج یہ سب سبیکہ کی شخصیت میں پنہاں ہو چکا ہے۔ مجھے تو وہ کسی خاطر میں نہیں لاتی، اب تم دونوں بچوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ تم سبیکہ کو پیار و محبت سے سمجھاؤ۔" وہ رسانیت سے بولے۔ گویا ہتھیار ڈال رہے ہوں۔

گوہر نے بے چارگی سے رضا کے چہرے کی طرف دیکھا تو رضا نے نظروں ہی نظروں میں اسے رام کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے اپنی بہو پر فخر ہے اور میں جانتا ہوں، وہ سبیکہ کی زندگی کو اک نئی ڈگر پر لے آئے گی۔" ان کے چہرے پر سنجیدگی در آئی تھی۔

وہ کچھ سوچنے لگے، جیسے مزید کچھ کہنا چاہ رہے ہوں مگر خاموشی سے اٹھ گئے۔

"بابا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" رضا متفکر سا ان کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

"نکلنے سے پہلے مل لینا مجھ سے۔" وہ مری ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب مڑ گئے۔

☆......☆

"اور اب میں آپ سب کی تالیوں میں دعوت دیتی ہوں۔ مس ہانیہ کو، آیئے سنتے ہیں کہ وہ ساحر کے کلام سے کون سا انتخاب لائی ہیں۔ ہانیہ ویلکم ٹو اسٹیج۔"

"دوست دل کی گہرائیوں سے تمہارے لیے دعا گو ہوں۔" خوشبو چہکی۔

ہانیہ اٹھ چکی تھی۔ ''ارشاد.....ارشاد.....''

''بھئی یہ آخری انٹری ہے۔ زور دار ہونی چاہیے۔'' ایک بار پھر ہال میں جملے کسنے کی آوازیں اپنے عروج پر تھیں۔

نغمہ و شعر کی سوغات کے پیش کروں
یہ چھلکتے ہوئے جذبات کے پیش کروں

وہ جذبوں سے لودیتی ہوئی آنکھوں سے ریان کی جانب دیکھتے ہوئے ذرا سا رکی مگر نوراہی نظریں چرالیں۔

''کیا بات ہے، شعر گوئی کا حق ادا کردیا۔ ریان نے مسکراتے ہوئے ہانیہ کا سرتا پا جائزہ لیا۔ برابر میں بیٹھی میزبان نے چونک کر ریان کو دیکھا۔

گرم سانسوں میں چھپے راز بتاؤں کس کو
نرم ہونٹوں میں دبی بات کہے پیش کروں
کوئی ہمراز تو پاؤں، کوئی ہمدم تو ملے
دل کی دھڑکن کے اشارات کہے پیش کروں

''واہ بھئی! بہت خوب، اب میں ریان علی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتی ہوں۔''

میزبان کی خوب صورت آواز، پورے ہال میں گونجتی رہی اور تالیوں کا شور سماعتوں کو جھنجھوڑ گیا۔

''دوستو! پرانے شعراء کے دیوان کے دیوان دیکھ ڈالے، شب ہجر کے پس منظر میں، محبوب کی بے وفائی کے سوا کوئی چیز ابھرتی دکھائی نہیں دے گی۔ یہ ساحر لدھیانوی کی فکر اور فن کا اپنا مخصوص انداز ہے کہ وہ زندگی کے مختلف روپ، مختلف تقاضے اور مختلف محرکات واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ محبت ان کے پاس ایک معیار ہے۔ جیسے ان کا یہ شعر۔

کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

ریان علی نے ایک مسکراتی نظر ہانیہ کے سراپے پر ڈالی اور پھر ہال کی طرف متوجہ ہوگیا۔

تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

''کہیں یہ شعر تمہارے لیے تو نہیں سنادیا، اس نے۔'' خوشبو نے ہانیہ کے کان میں سرگوشی کی تو وہ تلملا کر رہ گئی۔

''دوستو! انتخاب تو سب ہی کے خوب صورت تھے، کسی ایک کو داد دینا میری نظر میں بے ایمانی ہوگی۔ آپ سب ہی نے قابل تحسین انداز میں ساحر لدھیانوی کو بہت خوب صورتی کے ساتھ TRIBUTE پیش کیا۔ میں بھی ساحر کے اس شعر پر جو بعد میں ان کا مرثیہ بن گیا ہے۔ ان کی یاد کو تازہ کرنا چاہوں گا کہ

اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی
شب کی سنگین سیاہی سے مبارک کہہ دو

''ریان علی اسٹیج پر ہیں تو ان کا اپنا کلام بھی ہو ہی جائے۔'' یہ آواز کہیں دور سے آئی تھی۔

''ریان! ریان! ریان!'' پورا ہال ریان کے نام کے نعروں سے گونج اٹھا۔

''اچھا! اچھا آپ سب کی محبتیں سر آنکھوں پر کیونکہ یہاں ہم سب ہی ساحر لدھیانوی جی کو Tribute پیش کرنے آئے ہیں تو ان ہی کی ایک مشہور غزل آج میں آپ کو گا کے سناؤں گا۔''

''ہاں بھئی، بہت خوب ضرور ضرور۔'' میزبان نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

ریان علی کا لہجہ دھیما اور خوابناک سا ہوگیا۔ اس نے گہری نظروں سے ہانیہ کو دیکھا، دھیمی مسکراہٹ ہنوز اس کے لبوں کی تراش میں زندہ تھی۔ تب ہی وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے؟
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لیے

''آہا کیا بات ہے؟'' تالیوں کا شور پورے ہال میں گونج گیا۔

سُر اور لے میں ڈوبا وہ یکدم ہی جیسے ماحول سے کٹ کر گہری سوچ میں گم ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گہری دُھند سی پھیل گئی تھی، جس میں وہ جانے کیا اور کسے کھوج رہا تھا۔ پھر بے اختیار اس نے آنکھیں کھولیں اور غزل کے آخری مصرعے کو اپنی خوب صورت آواز میں سونے لگا۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تو مجھے چاہے گی عمر بھر یوں ہی
اٹھے گی میری طرف پیار کی نظر یوں ہی
میں جانتا ہوں کہ تُو غیر ہے مگر پھر بھی

اپنی سوچ کے سحر سے خود کو آزاد کراتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس بھری اور بھرپور نگاہوں سے ہانیہ کو دیکھا تو وہ سٹپٹا گئی۔ وہ ریان علی کے دھیمے اور سحر انگیز لہجے اور لفظوں کی جادوگری کے آگے خود کو بے بس تصور کر رہی تھی۔

یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس جمنڈ کی شکل میں اسٹیج کی جانب لپکے تھے۔ سب ہی ریان علی سے آٹوگراف لینے کے لیے بے چین تھے جب کہ ہانیہ کا دل آج جیسے معمول سے ہٹ کر دھڑک اٹھا تھا۔ ریان علی کی نگاہوں اور شاعری نے اس کے دل پر دستک دی تھی اور جیسے وہ بھی بے خیالی میں دل کا قفل کھول بیٹھی۔

''سب خیریت تو ہے ناں؟'' خوشبو نے کھویا سا پاکر اسے جھنجھوڑا۔

''ہاں۔'' وہ چونکی۔

''چلو آؤ ہم یہاں سے چلیں، کتنا شور و غل ہے۔ ماحول جیسے یکسر تبدیل ہوگیا تھا اور وہ بھی اب خوشبو کا ہاتھ پکڑتی اسے ہال سے باہر لانے کی تگ و دو میں تھی۔

☆.....☆

میں نے جب کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا۔ Dont irritate me۔''

''لیکن میم، ہمارے آنرز کا خیال ہے کہ آپ فرسٹ ڈیل میں ہمارے ڈیزائن کاپی کرلیں تاکہ آپ کو ہماری

چوائس کا اندازہ ہو جائے۔"
"اچھا۔" سبیکہ نے کمال مہارت سے اپنے غصے کو کہیں اندر دبایا۔
"بس ہمارا مقصد یہ ہے کہ آپ کو Next Time اسی کے مطابق ڈیزائن کرنے میں آسانی ہوگی۔" مخالف پارٹی میں سے قدرے نرم مزاج یہ لڑکا اپنے باس کا موقف بیان کر رہا تھا۔
"اور کچھ!!" سبیکہ نے بڑے ہی تحمل سے پوچھا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ میں گہرے غم و غصے کے آثار نمایاں تھے۔
"نہیں، میم بس اتنی سی بات ہے کہ آپ ہمارے ڈیزائن کو Remix کریں۔" ابھی وہ مزید آگے کچھ بولتا کہ سبیکہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔
"دیکھو مسٹر مجھے تمہارے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کرنی۔ تمہارے باس نے تمہیں یہاں سبیکہ کی ڈیزائنگ دیکھ کر بھیجا ہے۔ صرف میٹریل ہی نہیں۔ ڈیزائنگ بھی میری اپنی ہوگی۔" میں کسی کی بھی ڈیزائنگ کاپی کرنا پسند نہیں کرتی، شاید تمہارے باس جانتے نہیں۔ فیشن میگزین، فیشن چینلز، فیشن ویب سائٹ ہر جگہ تمہیں سبیکہ کی کلیکشن نظر آئیں گی۔ سبیکہ کا نام اب برانڈ بن چکا ہے۔" غصے سے چلاتی اس کی آواز ناگ کی طرح سر اٹھا، اٹھا کر ڈس رہی تھی۔
"میم آپ غلط سمجھیں۔" تینوں ممبران اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک بڑبڑایا۔
ڈیزائن فیشن ٹرینڈ بن جاتے ہیں اور آپ میری چوائس پر شک کر رہے ہیں۔ مجھے تم لوگوں کے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کرنی۔ مجھے تم لوگوں کی ضرورت نہیں۔ ہاں لیکن ایک دن تمہیں میری ضرورت اس در تک واپس لائے گی اور اس دن میرے دروازے تمہارے لیے نہیں کھلیں گے۔ آپ لوگ اب جا سکتے ہیں۔"
تینوں ممبران منہ لٹکائے مڑ چکے تھے جب کہ سبیکہ طیش کے عالم میں ٹیبل پر رکھی فائلیں نیچے پھینک چکی تھی۔
"اوہ مائی ڈارلنگ، یہ کیسا انداز ہے ڈیل کرنے کا۔" صولت بیگم الجھے لہجے میں سبیکہ سے مخاطب تھیں۔
"I Dont Care، ماما یہ لوگ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ میں ان کے ساتھ کسی قسم کی ڈیل کروں۔ خیر چھوڑیے، آپ کا اس طرف کیسے آنا ہوا۔" سبیکہ ہلکی ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔ جس میں طنز کی آمیزش شامل تھی۔
"تمہارے ملٹی نیشنل کمپنی میں جو ڈیزائن Fax کیے گئے تھے، وہ پسند کر لیے گئے ہیں۔ اب یہ بتاؤ آ کر Appointment لیں۔"
"مام میں کیوں جانے لگی۔ ہم ان کو فون کر کے کوئی قریبی Date دے دیتے ہیں۔" سبیکہ کے لہجے و انداز میں حیرت نمایاں تھی۔
"وہ ملٹی نیشنل کمپنی کا مالک ہے۔ اس کے ساتھ ڈیل کرنا ہماری ضرورت ہے۔ اس کے پاس تو ڈیزائنرز کی لائن لگی ہوگی۔ بے وقوف تمہیں تو بزنس کرنے کے بھی گر سکھانے ہوں گے۔" صولت بیگم منہ بگاڑ کر بولیں۔
"میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میرا بنایا ہوا ڈیزائن کبھی ریجیکٹ نہیں ہوتا اور میرے ملبوسات میں ماڈل Ramp پر آتی ہیں تو وہی سب کی توجہ کا مرکز ہوتی ہیں۔" سبیکہ زعم سے بولی۔
"آئی نو بے بی لیکن اس کے لیے تمہیں یہ قربانی تو دینا پڑے گی۔ مائی چائلڈ پہلے اپنی اہمیت کا احساس دلاؤ۔ جب تک خود کو Promote نہیں کرو گی، کیسے کام چلے گا۔ جس دن تم ان کی ڈیمانڈ بن گئیں، بس وہی

دن تمہاری کامیابی کا پہلا دن ہوگا۔ سمجھا کرو مائی چائلڈ۔" صولت بیگم پچکارنے والے انداز میں بولیں۔
"I will try دوسروں کے آگے جھکنا مجھے ذرا پسند نہیں لیکن آپ کہہ رہی ہیں تو ٹھیک ہے مل لیتے ہیں اس سے۔" وہ گلے میں پڑی زنجیر سے بے مقصد کھیلتے ہوئے بولی۔
"کیا نام ہے ویسے Owner کا؟"
"فائق۔" صولت بیگم کے لہجے میں بے پناہ اکتاہٹ تھی۔
"اونہہ دیکھ لیتی ہوں، اس مسٹر فائق کو بھی۔"
"Ok ڈیئر، اپنا ورک جاری رکھو، میں ذرا کلاس لینے جا رہی ہوں اس شیخ کے چکر میں سارے ٹائمنگ الٹ پلٹ کے رہ گئی ہے۔ ویسے تمہاری بوتیک لانچنگ میں ایک موٹی اسامی سے اور سیٹنگ ہوگئی ہے۔ ذرا تم اپنی میٹنگ کی Date کنفرم کر لو، پھر اس کی طرف ہم دونوں چلیں گے۔"
"اچھا وہ کون ہے؟" سبیکہ نے حیرت سے صولت بیگم کو دیکھا۔
"وہی مسٹر ولید۔" صولت بیگم مسکرائیں۔
"اوہ وہی ولید۔ پارٹی میں جو میرے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا۔" سبیکہ نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔
"ارے ڈارلنگ، اسی سے تو اندازہ ہوا کہ وہ تم میں کتنا انٹرسٹڈ ہے۔ فیشن ڈیزائنگ انسٹی ٹیوٹ کا مالک ہے۔ ارب پتی اسامی ہے بے بی۔" صولت بیگم کی تو گویا رال ٹپکنے لگی تھی۔
"ہوگا، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، خود ہم کسی سے کم ہیں کیا جو دوسروں کے زیر اثر رہیں اور پھر وہ، وہ تو بے ہودہ انسان ہے۔ اس کو لڑکیوں سے تو بات کرنے کی تمیز نہیں، جانے کیسے انسٹی ٹیوٹ چلاتا ہوگا۔" سبیکہ کو اگلے ہی پل اپنی تذلیل کا احساس تڑپا گیا۔
"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا سبیکہ؟" صولت بیگم نے سبیکہ کو آنکھیں دکھائیں۔
"جانے آپ کیسے برداشت کرتی ہیں ایسے فضول لوگوں کو، خیر میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔
"اگر ایسے ہی چلتی رہیں تو کر چکیں ترقی۔ تم میری بیٹی ہو مگر میری جیسی تم میں کوئی بات نہیں، اونہہ۔" وہ بولتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئیں۔
سبیکہ کا چہرہ غصے سے لال ہو چکا تھا۔

☆......☆

"کیا کہہ رہے ہو، سائیں رئیس دوبارہ سیاست کے میدان میں آ گئے ہیں۔ کہیں ان کا یہ اقدام دودھ میں آئے اُبال کی طرح نہ ہو۔ اب کوئی ان کی جدی، پشتی سیٹ تو ہے نہیں، اپنی خودی کے دم پر، گاؤں خوب صورت بنانے کا فیصلہ۔ اونہہ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔" صولت بیگم نے منہ بسورتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔
"نہیں ماما، کیا زبردست پارٹی تھی۔ بڑے بڑے عہدے دار، شہر کی نامور ہستیاں سب ہی اس پارٹی میں موجود تھیں اور وہ سب بابا سائیں کو سپورٹ بھی کر رہے ہیں۔" رضا نے صولت بیگم کو حیرت کا دھچکا دیا۔
"رہنے دو، بہت سورما آئے ہیں اور بری طرح مات کھا کر گئے ہیں۔ تمہارے بابا سائیں کی تو ان کے آگے کوئی حیثیت ہی نہیں۔ میں نہیں مانتی۔" صولت بیگم کی سوچوں میں اضطراب سمٹ آیا تھا۔

(جاری ہے)

انتخاب خاص

سائرہ ہاشمی

دھرتی کی باس

آج پھر بادل زور سے گرجے اور بارش کے بڑے بڑے قطرے گرد آلود سڑک پر دائرے بنانے لگے۔ تیز بوچھاڑ میں ردی کاغذ آگے ہی آگے سفر کر رہے تھے
''اندر آجاؤ بھیگ جاؤ گی'' فیروز نے اُسے آواز دی۔ وہ جھجکی اور پھر......

انسانی فطرت سے مکالمہ کرتا، ایک خوب صورت انتخاب

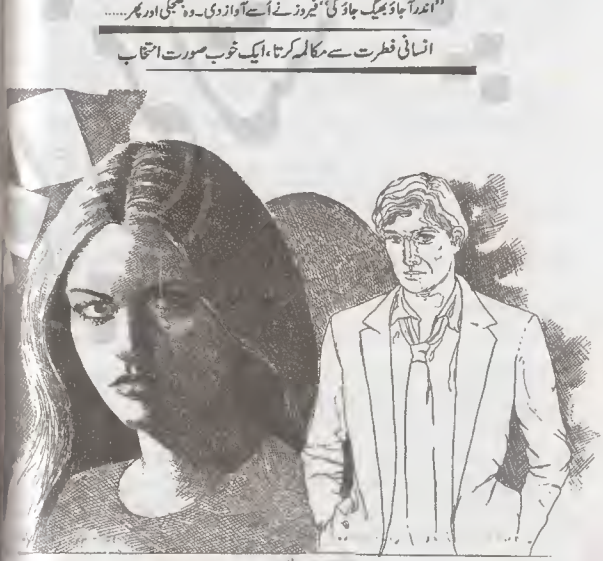

زہرا نے بازار میں کھڑے ہو کر آسمان کو لھا۔ سیاہ بادل مشرق کی طرف سے اُٹھ کر سب ف چھا رہے تھے اور تیز ہوائیں، گوشت، مچھلی رغیوں کی بساند سے پُر اس کے لباس میں گھستی گے ہی آگے اُڑی جا رہی تھیں۔ اِکا دُکا کاغذ پھڑ اتے، چکروں میں گھومتے اور رُک جاتے۔ اس اپنی ساڑی کا پلو اپنے سر اور جسم کے گرد زور سے لیا اور دوسری ساتھی عورتوں کی تلاش میں اِدھر مر دیکھنے لگی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بال پوائنٹ دیکھا اور فکر مندی سے امنڈتی گھٹا کو دیکھنے لی...... سردی کی تیز لہریں اس کے جسم کو سُن کر رہی یں لیکن وہ جانتی تھی، وہ اس بازار میں کھڑی کہیں ی نہیں جاسکتی تھی اور اس کا گھر جو ایک کمرے اور ہوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ سردی کو روک سکتا تھا ہاں اس کی بیمار اور لاغر ماں کا وجود تھا، جہاں اسے بھی جا کر پناہ کا احساس ہوتا تھا لیکن جو اتنے وں سے پھر بھی اسے گھر نہیں لگتا تھا۔

''میرا گھر کون سا ہوگا۔ کہاں ہوگا میرا گھر۔'' وہ سوال کی بازگشت اپنے دل کے اندر گونجتی محسوس تی لیکن اس سوال کا جواب نہ سوجھتا۔

لوگ تیز تیز قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ سایوں تلاش میں پناہ کی تلاش میں...... دنیا ہی دنیا اور وہ ...... اسے نہ جانے ماں کے باوجود اپنا آپ اکیلا ں لگتا تھا۔ وہ کہاں جائے...... اسے کس چیز کی وج تھی۔

رات اس نے گہرے بادلوں میں چاند کی ڈوبتی تی ناؤ کو دیکھا تھا اور چپ چاپ اس دور تک ی بستی کے درمیان کھڑی رہی تھی جواب اس کی ن بن گئی تھی۔ بہاریوں کی بستی، خانماں اادوں کی بستی۔ جہاں زرد چہروں اور بوسیدہ لباسوں میں لپٹے بدن عجیب بے چارگی سے زندگی کی طرف گھسٹ رہے تھے۔ اس کا دل گہری اداسی میں ڈوب رہا تھا۔ پھر سلام اللہ نے آ کر آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن پھر بھی کوئی گرمی اس کے ٹھنڈے وجود میں نہ دوڑی۔ اسے اندر سے اپنا آپ مرا ہوا اور بے جان لگتا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو سلام اللہ نے کہا تھا۔

''دیکھ زہرا تو جو گزری باتوں کو یاد کرنے کی کوششیں کرتی ہے نا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آؤ ہم بھی گھر بنا لیں۔ پھر تمہارے ذہن کی یادیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ تمہارے پاؤں اس دھرتی پر مضبوط ہو جائیں گے۔

زہرا اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسے لگا، جیسے ساری یادیں بھی اس کے ذہن میں جم گئی ہوں۔ بس بھوک، افلاس، ماں کی لمبی بیماری ہی زندہ یادیں تھیں جو اس کے ذہن میں کلبلانے لگتیں یا پھر کبھی کبھار سلام اللہ کی باتیں، جو اس کی زندگی کے اندھیرے میں چکا چوند کرنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ اسے زندگی کی پائیداری کے کسی پہلو پر بھی یقین نہیں تھا۔

''تم بولتی کیوں نہیں۔'' سلام اللہ کی آواز میں غصہ تھا۔

''دیکھ سلام! مجھے یہ دھرتی اپنی نہیں لگتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس نے پوری طرح ہمارے پاؤں نہیں پکڑے۔ میرا دل کیوں اس کے اندر سما جانے کو نہیں چاہتا۔ میرا دل کیوں اس کے پیار میں نہیں بھیگتا۔ میرا ذہن سارا وقت گزری یادوں سے بھرا رہتا ہے۔''

سلام اللہ کو ہمیشہ کی طرح زہرا کی یہ بات بری

لگی تھی۔اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ جس زمین کے اندر انہیں زبردستی دھکیل دیا گیا ہے ضرور اس سے ان کا ناتا بڑا گہرا اور مضبوط ہوگا اور یہ گھر، گھاس پھونس کی جھونپڑیوں اور ان میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں تھا، دونوں ہی ناپائیدار۔ ہواؤں کی زد میں لرزاں اور کمزور لیکن پھر بھی پناہ گاہ ہیں اور یہاں آکر اس نے تو پینٹ بوشرٹ بھی پہن لی تھی اور چوری چھپے نشہ بھی کرلیتا تھا۔اس کے پاؤں میں جوتے بھی تھے پھر زہرا نہ جانے کون سی یادوں میں کھوئی رہتی ہے۔ شک بھرا دل ویران ہی تو رہتا ہے۔

”ہجرت ہمارے ایمان میں شامل ہے۔“ سلام اللہ نے اسے قائل کرنا چاہا۔

”میں جانتی ہوں، میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن صرف ہم ہی کیوں؟ ہم ہی کیوں برباد ہوئے؟“ زہرا کی آنکھوں میں یاد کی چبھن سے آنسو نکل آئے۔

”ہم اکیلے تو نہیں ہیں۔ دیکھو اس بستی کو، گھروں میں سوئے لوگوں کو، اس بستی میں پھرنے والے کتوں کو۔ وہ سب ہمارے ساتھ ہیں۔“ سلام اللہ نے اندھیرے میں زہرا کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ اسے ہنسانے کی کوشش کررہا تھا لیکن یہاں کی ہواؤں میں نمی نہیں...... دُھول ہی دُھول...... سمندر کہاں ہے اور بارش...... اور پٹ سن، جس کو میرے بابا کوٹ کر ریشے بنایا کرتے تھے۔“

زہرا ہمیشہ کی طرح برسوں پیچھے لوٹ گئی وہ تو شاید زندہ ہی گزرے دنوں میں تھی۔

سلام اللہ کا دل بھی محرومی کی کسک سے بھر گیا لیکن پھر بھی وہ مرد تھا...... حالات میں ڈھلنے والا...... عملی انسان...... خوابوں اور یادوں سے دُور۔ اس نے نرمی سے زہرا کے ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔ ”زہرا ہم بھی ایک دن اپنا گھر بنالیں گے۔ تم اور میں۔“ اس کی آواز میں امید کی تازگی اور پیار کا رنگ تھا۔

”اور پھر کوئی بڑی طاقت، ہمیں یہاں سے بھی دھکیل کر کہیں اور جانے پر مجبور کردے گی۔“ زہرا کے اندر کی ساری بے یقینی اس کی آواز میں درآئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اس کے آگے کچھ نہیں۔ صرف موت ہوسکتی ہے۔“ سلام اللہ نے ہولے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جانتا تھا، اسے ابھی زہرا کا اور انتظار کرنا ہوگا۔ پھر زہرا بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں چپ چاپ رات کی آوازوں میں گھرے کھڑے رہے تھے، سیاہ بادل اور بھی سیاہ ہوگئے تھے...... اور سڑک کے کنارے بنے اجاڑ پارکوں میں اُگی خودرو جھاڑیوں میں ہوا آواز پیدا کرتی گزر رہی تھی اور یہاں سیاہ بادل اب بھی زہرا کو گھیرے ہوئے تھے۔ بھوک اور بے چارگی کا جان لیوا احساس اس کے اندر جاگ رہا تھا۔ بھوک جو اس کے اندر سے اٹھ کر اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

بازار کی رنگارنگی میں ڈوبی...... زیادہ تکلیف دہ لیکن اسے اس کو برداشت کرنا ہوگا۔ صرف انتظار...... لامتناہی...... کرب میں ڈوبا ہوا...... اچھے وقت کا...... اچھی روٹی کا...... ماں کے تندرست ہونے کا......

ان اونچی اونچی پختہ دیواروں اور شور وغوغا کے درمیان کھڑے اسے ایک اور شور سنائی دینے لگا جو اس کے اندر بھی اٹھ رہا تھا...... تیز اور شانت۔ مدھم اور دھیما۔ سمندر کا...... بارش کا...... سمندر میں بہتی کشتیاں اور دور کنارے پر اس کا اپنا جھونپڑا۔ ایک گھر۔ اس کے اندر سے اٹھتا دھواں۔ بھات اور مچھلی۔ اسے لگا جیسے جھونپڑے کے اندر سے بھات

اور مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی ہو اور وہ ماں سے کہہ ہی ہو۔ ماں بھوک لگی ہے اور ماں نے اسے تھالی بھر چاول ڈال کر دے دیے ہوں اور پھر آوازیں گہری ہوگئیں۔

☆......☆

اپنی اپنی سی باس اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ دور سمندر میں کوئی بڑی سی کشتی میں جال پھینکتے ہوئے گا رہا تھا۔ سُر لہروں پر بہتا اس تک پہنچ رہا تھا اور اس کا باپ تالاب کے کنارے پٹ سن کے ریشوں کو کوٹ رہا تھا۔ اس کا سانولا جسم کرنوں کی زد میں چمک رہا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے درمیان بھی اسے صرف اپنا باپ ہی اچھا لگتا۔

ر ...اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتا ہوا سمندر، آگے ہی آگے بڑھتا رہتا۔ آوازیں لوٹ لوٹ کر آتی رہیں۔

اللہ میگھ دے۔

پانی دے۔

سایہ دے رے توئی۔

ہماری زمین آنسو اور بادل...... پانی اور زرخیزی...... سفر اور آبادی...... شاید سفر ہی سفر......

لاہور میں ایک بڑے وسیع میدان میں اس نے کھڑے ہوکر دیکھا تو سپاٹ آسمان اور گرد آلود دھرتی اسے گھیر رہی تھی۔ دور درختوں کے گرد آلود پتوں میں چھپی چڑیاں شور ڈال رہی تھیں...... اور سورج کا سرخ گولا، درختوں کے تنوں میں الجھا نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا دل دکھ اور محرومی میں ڈوبنے لگا تھا، میری دھرتی کیا ہوئی، وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ وہ ایک ہجوم میں...... گھری بھی خوفزدہ ہو اٹھی۔

یہ کیسی دھرتی تھی۔ جہاں صرف چڑیوں کا شور ہی ہے۔ دوسری آوازیں جن سے اس کے کان مانوس تھے کیا ہوئیں...... لہروں کی شوریدہ سرشاں شاں...... ناریل کے بلند درختوں سے لٹکتے ہوئے ناریل اور خودرو جھاڑیوں کے گہرے مونگیا سائے۔

کوئی چیز اس کے دل میں سَن سَن کرکے گھس رہی تھی۔ اتنے سارے ہجوم میں بھی اکیلے رہ جانے کا خیال......

اس نے جھک کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔ دھول میں سے پاؤں اسے نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید پھر سب طرف اندھیرا چھا گیا۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ تینوں اس خیمے سے باہر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ جواب اس کا گھر تھا۔

وہ شفق کی اس آخری سرخی کو دیکھ رہے تھے جو آسمان کے بیچوں بیچ ایک ننھے سے بادل کو رنگ رہی تھی۔ امید کی ڈوبتی کرن کی طرح......

دن نکلتے اور ڈوبتے رہے۔ اس کا بابا شام کے وقت سب کے ساتھ بیٹھا گزرے دنوں اور چھنی ہوئی دھرتی کی باتیں کرتا رہتا۔ وہ سب ابھی بھی ایک خواب دیکھ رہے تھے۔ واپس جانے کا خواب۔ حالانکہ وہ جانتے تھے، اس دھرتی نے انہیں قبول کرنے سے انکار کردیا ہے لیکن وقت دھیرے دھیرے کھسکتا رہا تھا۔ آسمان اور زمین ہولے ہولے قدم دھرتے ان کے دل میں اترتے رہے اور پھر وہ سب اسی زمین سے اپنی وابستگی کو گہرا کرنے کی کوشش میں روزگار کی تلاش میں سارے شہر میں بکھر گئے۔

رات کو جب زندگی کی تیز آوازیں تھم جاتیں تو زہرا یادوں کی گہرائیوں میں ڈوبی دور بہت دور انجانے ساحلوں پر اتر جاتی۔ اس کا ذہن اور دل...... اسے نم آلود ہوا اور تیز بارشوں کی پھوار میں بھگوتا رہتا اور اسے لگتا، جیسے وہ بھی کسی کشتی میں بیٹھی گا رہی ہو۔ وہ آنکھیں بند کرلیتی اور پھر اس کے گرد

پھیلی ویرانی، گہرے مونگیا سایوں والی زمین میں ڈھل جاتی جو اس کی تھی صرف اس کی...... اس کو اپنے باطن میں جذب کرتی ہوئی دھرتی......

اللہ میگھ دے سایہ دے رے......
پانی دے رے توئی......
اللہ میگھ دے......
اللہ میگھ دے......

اور پھر ایک لمبی بیماری نے اس کے بابا کو نگل لیا۔ تب اسے آسمان پر دہکتے سورج کی تپش کا اندازہ نئے طور سے ہوا۔

☆......☆

خالہ آمنہ نے اس کی ماں کو کہا تھا، تو زہرا کو ہمارے ساتھ پنسلیں بیچنے کو بھیج دیا کر۔ حکومت کے روپے ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ زندگی بڑی گراں ہوگئی ہے۔

اس کی ماں نے خوف بھری نظروں سے زہرا کو دیکھا اور کہا۔ ''نہیں آمنہ، میں جوان لڑکی کو بازار میں سودا بیچنے کو نہیں بھیجوں گی۔''

وہ نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی۔ شاید وہ حالات سے آنکھیں موند لینا چاہتی تھی۔ لیکن جب روپے ختم ہو گئے تو زہرا ماں سے پوچھے بغیر ہی آمنہ خالہ کے ساتھ آ گئی۔

اس نے سوچا تھا جب ماں بھی نہ رہے گی تو پھر میری حفاظت کون کرے گا۔ کون میرے بارے میں فکر مند ہوگا۔

بازار میں کھڑے اسے ایک اور بازار یاد آ گیا لیکن اب ساری یادیں دھندلا سی گئی تھیں۔ آتے جاتے لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دکانوں پر کام کرنے والے بچے، دوپٹے سکھاتے لڑکے۔ سودا بیچتے چھابڑیوں والے مرد، جو اسے دیکھ کر خوامخواہ مونچھوں کو تاؤ دینے لگتے۔

اس نے آمنہ خالہ کا پلو پکڑ کر کہا تھا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اتنے لوگوں کی نظروں میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ آؤ گھر چلیں۔''

''اور بھوکا رہنا اچھا لگتا ہے کیا۔ میں نے بھی پہلے ایسا ہی سوچا تھا لیکن میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اس بھرے بازار میں تم زیادہ محفوظ ہو۔ کوئی زبردستی پکڑ نہیں سکتا لیکن کوٹھیوں کے صاحب لوگ'' اور آمنہ نے زور سے زمین پر تھوک دیا اور مختلف چیزوں کو اکٹھا کر کے باندھنے لگی جن میں مرغیوں کے سر اور پنجے، مچھلیوں کی دمیں اور بڑے گوشت کے چھیچھڑے تھے......

اس نے سر اوپر اٹھایا تو سامنے کھڑا ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اسے گھور رہا تھا۔ اس کا جی چاہا، وہ بھاگتی ہوئی اپنے خیمے میں جا کر چھپ جائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسلوں کو دیکھا اور اسے لگا جیسے وہ بھی ایک پنسل ہو، جسے مرد بغیر پیسے دیے ہی خریدنا چاہتے ہوں۔ اس نے آمنہ کا پلو پھر سے زور سے پکڑ لیا۔

آمنہ ہولے سے ہنسی۔ ''پگلی یہ بازار ہے یہاں ہر چیز کی بولی لگتی ہے لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی پہ ہے۔''

آمنہ کے چہرے پر زمانوں کا تجربہ۔ غمزدہ بصیرت اور بے بسی کی زردی تھی۔ اس کے لب ساری دنیا پر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے اور وہ سارے ہجوم سے بے پروا وہاں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اسے لگا، جیسے وہ اس ایک فقرے کی دیوار پھاند کر دوسری طرف اترنے سے پہلے عقل کی کئی منزلیں پار کر گئی ہو۔ ہاں یہ بازار ہے۔ یہاں ہر چیز کی بولی لگتی ہے لیکن یہ تو اپنی مرضی ہے، اس نے آمنہ کا پلو چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئی۔

''بابو جی پنسل خریدو گے؟'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ اس کا سانولا چہرہ عجیب سی جوت سے

روشن ہو گیا تھا۔

اور جب وہ شام کو سب کے ساتھ گھر پہنچی تو اسے لگا جیسے اپنے لڑکی ہونے کے بوجھ کو اس نے اٹھا کر کہیں پاتال میں پھینک دیا ہو۔ پیسے گنتے ہوئے اسے صرف دال بھات کی خواہش یاد تھی، جو اس کی ماں نے اس کے سامنے رکھا تھا لیکن بازار میں کھڑے مختلف نظریں اسے اس بات کی یاد دلاتی رہتیں۔ وہ گھبرا کر ساڑی کو اپنے گرد لپیٹ لیتی۔ ہاں مجھے صرف پنسلیں بیچنی ہیں۔

صرف اور صرف پنسلیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی گرفت اور سخت کر دیتی۔

وہ جان گئی تھی کہ لوگ پنسلوں سے زیادہ اسے للچائی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کے سانولے چہرے کی دہکتی جوت انہیں پُرکشش لگتی اور پیسے دیتے ہوئے مرد مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن وہ رسان سے سر جھکا لیتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ۔ زندہ رہنے کی تگ ودو کی طرف لیکن جب رات کو وہ سونے کی کوششیں کرتی تو دن بھر کی دیکھی ہوئی نظریں اس کے گرد اکٹھا ہو جاتیں اور اس کے جسم کے اندر گہری اتر جاتیں۔ وہ بے چین ہو جاتی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتی لیکن دہشت زدہ کرنے والا احساس اس کے اندر کلبلانے لگتا۔

اسے لگتا، جیسے وہ بھی دروپتی ہو اور اس کے دشمن اس کا دامن پکڑ کر اسے رسوا کرنا چاہتے ہوں۔

وہ اٹھ کر باہر آ جاتی۔ چاند ٹھٹھری رات میں اکیلا اور اداس سا محو سفر ہوتا اور دھند کی ہلکی سی تہہ خیموں کے گرد چھائی ہوئی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح سمندر میں بہتی اکیلی کشتی یاد آ گئی۔ ''میں گزری باتوں کو بھول کیوں نہیں جاتی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ جانتی تھی اسے زندہ رہنا تھا۔ ماں کے لیے، اپنے لیے اور وہ مرنا بھی تو نہیں چاہتی تھی۔ ہوا کو محسوس کرنا اور روشنی میں آنکھیں کھولنا کتنا اچھا لگتا تھا اور اب یہ بادل اور بارش کے تیز سرمئی جھکڑ جو دیواروں سے اور سڑک کے فرش پر سر پٹخ رہے تھے اور وہ بازار میں کھڑی تھی۔ بے چارگی کا احساس پھر اس کے گرم وجود سے اٹھ کر اسے بیخ کرنے لگا۔

نہ جانے وہ کیوں لوگوں کے درمیان پھرتی پھرتی اکیلی ہو جاتی۔ مسکراتے مسکراتے غمزدہ ہو جاتی اور پنسلیں ہاتھ میں پکڑے کھو جاتی۔

اسے لگتا وہ چھوٹی سی بچی ہو، جو زمانے کے سمندر میں اکیلی ہی کنارے تک پہنچنے کے لیے تیر رہی ہو۔ ڈوب رہی ہو۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ دنیا میں کتنے مرد ہیں۔ مرد ہی مرد، ہوس ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، گندے مذاق کرتے ہوئے۔ اس کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتے ہوئے لیکن پھر بھی کوئی اس کا نہیں۔

زندگی کے یہ گزرے سال۔ اسے کسی چیز کی کھوج تھی لیکن اسے سمجھ نہ آتا تھا کہ کھوج کہاں سے شروع کرے۔ اس کے اندر سب کچھ بے یقینی میں ڈوب جاتا۔ سلام اللہ کا چہرہ جو موٹر گیراج میں کام کرتا تھا اور رات کو نہ جانے کہاں سے پی کر آتا تھا یا فیروز جو اسے دیکھ کر سرخ چہرہ کیے مسکرانے لگتا لیکن بغیر منت کیے، کبھی گوشت کی دو زائد بوٹیاں بھی نہ دیتا یا اور چہرے...... چہرے ہی چہرے......!!

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں بہت عرصے بعد آنسو اکٹھے ہو رہے تھے۔

میرا اور دھرتی کا رشتہ ٹوٹ کیوں گیا ہے۔ وہ تو اس رشتے کو اسی طرح استوار کیے رکھنا چاہتی تھی۔ وہ زمین کیا ہوئی جس پر میرے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ جہاں میں اور برانھو رہتی تھی۔ بڑھ رہی تھی لیکن یہ دھرتی سفر کے کتنے مقام تھے۔ وہ ان مقاموں سے گزر کر اس ہجوم میں گھر گئی تھی، جس کا حصہ وہ بن نہ پائی تھی لیکن پھر بھی گھری ہوئی تھی۔

صبح ہی اس نے بڑے گوشت والے فیروز سے گوشت مانگا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ ”دو نا مجھے بھی۔ ابھی تم نے خالہ آمنہ کو دیا ہے اور وہ ساری بہاری عورتیں امید بھری نظروں اور زرد چہروں کے ساتھ فیروز کو دیکھتی رہی تھیں۔

وہ سب زہرا کی ان طاقتوں سے آگاہ تھیں۔ جن کی وجہ سے فیروز ان سب کو بھی چھیچھڑوں میں ایک آدھ گوشت کی بوٹی بھی ڈال دیتا تھا۔

وہ زہرا کی ہتھیلی پر گوشت رکھنے لگا تو اس نے جان کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرخ چہرہ کیے مسکرانے لگا تھا۔ زہرا کو اپنا آپ بڑا حقیر لگا لیکن زندگی کی ضرورتیں۔ وہ مسکراتی اور جلدی سے سب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا تھا اور شاید سلام اللہ کا جذبہ بھی۔ صرف رحم تھا۔ اپنے گرد پھیلے لوگوں کی نظروں کا رحم۔ سلام اللہ کا رحم..... حکومت کا رحم..... اور وہ اس رحم کے سیاہ سمندر میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی تگ و دو میں نڈھال ہو گئی تھی۔

پھر بادل زور سے گرجے اور بارش کے بڑے بڑے قطرے گرد آلود سڑک پر دائرے بنانے لگے۔ تیز بوچھاڑ میں ردی کاغذ آگے ہی آگے سفر کر رہے تھے۔

”اندر آجاؤ بھیگ جاؤ گی۔“ فیروز نے اسے آواز دی۔

وہ اندر آکر کھڑکی کے پاس پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔

”اللہ میگھ دے..... لیکن وہ دھرتی کہاں سے لاؤں۔“ وہ بارش کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اداس ہو رہی تھی۔

لوگ برآمدوں میں کھڑے سیاہ بادلوں اور تیز سرمئی بوچھاڑ کو دیکھ رہے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے درمیان بیٹھا، فیروز اس کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں گہری سی ہو گئیں۔ وہ اس کے پاس آکھڑا ہو گیا۔

ہم تینوں بڑی قیمت لگائیں گے بڑا مال ملے گا۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔

زہرا کو لگا جیسے وہ تیزی سے چھری اس کی ہڈیوں سے گوشت علیحدہ کر کے ٹانگ رہے ہوں۔ بچنے کے لیے..... بازار میں سجانے کے لیے۔ اسے منانے کے لیے۔ شاید زندگی کی خوشیاں۔

اس نے ایک ساعت کو سوچا۔ اس نے خاموشی سے دروازے کو دھکیلا اور بارش کے تیز بگولوں میں باہر آگئی۔ سیاہ بادل بہت نیچے اترتے لگ رہے تھے۔ زہرا کے جسم کی ساری طاقت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

وہ مارکیٹ کے برآمدے میں بھیگتی ہوئی خالہ آمنہ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ فیروز کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی۔ دکاندار چھابڑیوں والے اور اکا دکا خریدار خاموش کھڑے بارش کو دیکھ رہے تھے لیکن زہرا کو لگ رہا تھا جیسے سب طرف دہکتا الاؤ ہو جو اسے جلا ڈالنا چاہتا ہو لیکن وہ تو زندہ رہنا چاہتی تھی۔

اور پھر بادل چھٹ گئے۔ نکھرا اور اجلا آسمان بھیگی ہوئی زمین پر جھانکنے لگا۔

زہرا ہمیشہ کی طرح اپنی ساتھی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بس پر سوار ہو کر اپنی بستی کو چل پڑی۔ اس کا سارا اعتماد جو اس نے زندگی کے تجربوں سے حاصل کیا تھا کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ اس سے چھن گیا تھا۔

☆.....☆

رات جب اس نے سلام اللہ کو دیکھا تو وہ پہلی بار دل کی پوری سچائی سے مسکرائی۔

”سلام اللہ! ہمیں بھی اب ایک گھر الگ سے بنانا پڑے گا۔“

سلام اللہ نے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ تھام لیا۔ زہرا کو لگا جیسے اس دھرتی نے آگے بڑھ کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا ہو۔ نظروں کی تیزی اور غیر یقینی حالات سے بچا لیا ہو۔ فیروز کی نظریں..... غیر مردوں کی نگاہیں سب کچھ اور بہت سی یادوں میں گڈ مڈ ماضی کی دھند میں ڈوب رہا تھا۔ صرف وہ اور سلام اللہ اس دھرتی کے ٹھوس وجود پر کھڑے زندہ اور لازوال لگ رہے تھے۔

زہرا کو پہلی بار اپنے گھر کے تصور کے ساتھ اس نئی دھرتی کی محبت بھی اپنی روح میں سرائیت کرتی ہوئی لگی۔

اسے لگا جیسے اس نے اپنے وجود کا نیا پودا بو دیا ہو اور وہ بڑھ رہا ہو۔ بڑھتا ہی جا رہا ہو اور وہ سوچ رہی تھی۔ اس زمین پر میرا گھر ہو گا۔ میرا اپنا.....

رات تاروں کی جھانجھر پہنے اس کے گرد ناچنے لگی۔ آج اس نے پہلی بار ان آوازوں کو سنا تھا۔ جو صرف اس زمین سے وابستہ تھیں۔ خودرو جھاڑیوں میں سرسراتی ہوا اسے بڑی اپنی سی لگی اور زمین کی سوندھی سوندھی باس بھی۔ باس جو صرف اپنی دھرتی سے اٹھتی ہے۔

☆☆☆

غزل

جب تری کوئی ادا یاد آئی
وحشتِ وحشت میں قضا یاد آئی

تیری اک ایک جفا یاد آئی
جب ہمیں کوئی وفا یاد آئی

پھر وہی خواب حسیں یاد آیا
پھر وہی مست فضا یاد آئی

پھول کے بوجھ سے جھکی ڈالی
آپ کی شرم و حیا یاد آئی

رہ گئے دل میں مچل کے ارماں
ہائے تنہائی میں کیا یاد آئی

یاد پھر آئی بے بسی اپنی
عمر بھر کی جو سزا یاد آئی

نیر رضوی

م ش خ

کچھ سچ، کچھ......!

شکر ہے، علی ظفر کہ آپ نے ہماری عمر رسیدہ ہیروئنوں کے متعلق یہ جملہ نہیں کہا کہ فنکار تو ملک کے سفیر ہوتے ہیں اور اب یہ فیشن مرد فنکاروں میں بھی......!

کہتی ہے خلقِ خدا؟ مگر تم کو اِس سے کیا کہ مصداق، تحریرِ خاص

قارئین گرامی سلام قبول کیجیے، قبول تو ذہن کرتا نہیں، عوامی رائے کو کہ جس کو دیکھو، پارلیمنٹ اور قومی اسمبلی کے ممبران کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ یہ لوگ ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ کے ووٹوں کے ذریعے ممبر قومی اسمبلی بننے والوں پر پاکستانی عوام کس سختی سے تنقید کرتی ہے کہ یہ اس ملک کو ہر طرح سے لوٹ کر کھا رہے ہیں۔ ہمیں عوام کی اس بات سے اتفاق نہیں اور ہم ان غریب ممبران قومی اسمبلی کے ساتھ ہیں، ان کی غربت کا تو یہ عالم ہے کہ قومی اسمبلی میں ان غریبوں کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ یہ کینٹین کا بل ادا کرسکیں، جب کہ قومی اسمبلی کی کینٹین خاصی مہنگی ہے۔ ممبر پارلیمان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے کہ سیشن ختم ہونے کے بعد جب، ہم کینٹین کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں مہنگائی کا طوفان ہے اور ہم غریب، لوگ غریب عوام کے ووٹوں سے آئے ہیں۔ ہم اس مہنگائی میں کینٹین کا بل کیسے ادا کریں۔ اب یہ تو عوام کو سوچنا چاہیے کہ کسی غربت کا مذاق اڑانا کتنی بُری بات ہے۔ گزشتہ دنوں ایک S.M.S ہمارے پاس آیا، شکریہ کے ساتھ۔

اسمبلی کی کینٹین کی مہنگائی کے حوالے سے ہمیں S.M.S پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ یقیناً کسی دوست نے ہمیں عالمِ برزخ سے بھیجا ہے۔ مرحوم فرماتے ہیں کہ وہاں چائے ایک روپیہ کی، سوپ 6 روپے کا، دال دو روپے کی، بکرے کے گوشت کی پلیٹ 25 روپے کی، چپاتی ایک روپے کی، چکن اکیس روپے کی،

سبزی بریانی نو روپے کی، مچھلی غالباً 14 روپے کی...... لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا۔ صرف یہ لکھ کر بھیج دیا کہ اس کینٹین میں کھانا کھانے کے بعد ہی میں صدمے سے مرحوم ہو گیا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندہ حضرات کو صبرِ جمیل عطا کرے، عطا تو کرتے ہیں۔ یہ جملہ ہمارے سیاست دان عوام سے بار بار کہ آئین اور جمہوریت محفوظ ہے اور اگر مشکل پڑی تو عوام کے پاس جائیں گے۔

یہ حق، ہمیں آئین اور جمہوریت نے دیا ہے۔ واقعی جی، ہم تو خود آئین اور جمہوریت کا احترام کرتے ہیں کیونکہ جب کسی سیاست دان یا بیورو کریٹ کو ضرورت ہوتی ہے تو اپنے مفادات کے لیے تو آئین اجازت دیتا ہے اور جب کسی غریب کے مفادات کی بات ہو تو پھر بڑے آرام سے ایک جملہ کہہ کر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ پاکستان کا آئین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ لاء اینڈ آرڈر کی ابتر صورتِ حال، مہنگائی، لوٹ مار، صرف پندرہ سو روپے کے موبائل کے لیے انسانی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا ہے۔ کیا آئین اس بات کی اجازت دیتا ہے؟؟

عقلمندی کی بات تو کی ہے کمشنر کراچی روشن علی شیخ نے کہ زہریلے اور گندے پانی سے کاشت کی گئی سبزیاں ضائع کر دی ہیں جو تقریباً تین سو ایکڑ پر تھیں، ہم انہیں اس نیک کام پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

بحیثیت صحافی، جو لوگ اس ملک میں مثبت کام کرتے ہیں ان پر ضرور روشنی ڈالی جائے کیونکہ ان گندی سبزیوں کے استعمال سے کینسر کا مرض شدت سے پھیل رہا ہے۔ روشن علی شیخ اور سروے کریں تو انہیں ملیر کے قریب و جوار میں جگہ جگہ زہریلے اور گندے پانی سے کاشت کی گئی سبزیاں سیکڑوں ایکڑ پر ملیں گی جو روشن علی شیخ کو معلوم نہیں۔ اطلاعات فراہم کرنا ہمارا کام تھا کیونکہ یہ کام بڑے اثر رسوخ والے کر رہے ہیں۔ ہمت کر کے پاکستانی گلوکار علی ظفر نے کہا ہے کہ اداکارہ وینا ملک کے کردار کے حوالے سے پاکستان پر کیچڑ اچھالنا درست نہیں، وہ خود اپنے کیے کی ذمہ دار ہیں۔

شکر ہے کہ علی ظفر کہ آپ نے ہماری عمر رسیدہ ہیروئنوں کے متعلق یہ جملہ نہیں کہا کہ فنکار تو ملک کے سفیر ہوتے ہیں، اب یہ فیشن مرد فنکاروں میں بھی زور پکڑ رہا ہے کہ فنکار تو دنیا کے کسی خطے میں جائیں وہ تو ملک کے سفیر ہوتے ہیں۔ اب ہماری اداکارائیں وہاں کس قسم کے لباس زیبِ تن کرتی ہیں۔ یہ ان کی مرضی ہے۔ اداکارہ میرا نے بھارتی ہدایت کار مہیش بھٹ کی فلم میں جس قسم کا لباس زیبِ تن کیا، وہ تہذیب کے دائرے میں نہیں آتا اور وینا ملک وہاں کیا کر رہی ہیں وہ بھی عوام الناس کی نگاہ میں ہے اور حکومت اس لیے خاموش ہے کہ یہ پاکستان کی سفیر ہیں۔ ویسے یہ بات دوسری ہے کہ اس وطن میں شرفاء کے نکاح نامے پولیس جگہ جگہ طلب کرتی ہے اور عوام اس عمل پر بھی خاموش ہیں۔

خاموش تو ہیں عوام پرائم منسٹر کے اس بیان پر کہ حکومت نے وہ کام کیے ہیں جو دو تہائی اکثریت والے بھی نہیں کر سکتے۔ اب اس پر تو تفصیلی روشنی ہم تو نہیں ڈال سکتے کہ ہمارے

پاس وہ جادوئی چراغ نہیں اس بات کا فیصلہ تو قارئینِ دوشیزہ کی جھولی میں ڈال دیا ہے کہ وہ کام جو حکومت نے کیے ہیں، انہیں دوشیزہ میں خطوط کے حوالے سے ضرور لکھ کر روانہ کریں۔ ہم منتظر ہیں۔اس ملک میں اصل جمہوریت کے۔ پرویز مشرف کے دور میں چوہدری شجاعت کہا کرتے تھے کہ ہم نے اس ملک کو جمہوریت دی۔ پی پی پی کے صدر اور وزیراعظم نے کہا کہ ملک میں اصل جمہوریت بحال کردی گئی ہے، ابھی ہم جمہوریت کو تلاش ہی کر رہے تھے کہ میاں نواز شریف نے کہا ہے کہ عنقریب عوام کو اصل جمہوریت، ہماری حکومت سے ملے گی۔

اب اس جمہوری حکومت نے کیا کیا گرد کھائے ہیں، یہ تو عوام الناس کو معلوم ہی ہے۔ لوگ روٹی کو محتاج ہیں، دودھ بچوں کی پہنچ سے دور ہوگیا ہے۔ مریض بغیر میڈیسن کے اسپتالوں میں دھکے کھا رہے ہیں، گلی گلی ڈاکو لوگوں کی جانوں کا نذرانہ لے رہے ہیں، بدمعاش معصوم بیٹیوں کے سر سے چادریں کھینچ رہے ہیں۔ انصاف دینے والے دروازے خاموش ہیں اور اگر کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں تو عمل نہیں کیا جاتا۔ لالٹینوں کا زمانہ لوٹ آیا ہے، گیس کی جگہ لکڑیوں نے لے لی ہے اور دوبارہ پتھر کے زمانے میں جا رہے ہیں۔اب ہم 1800 کی صدی میں چلے گئے ہیں اور شاید ہم اسی لیے اس جمہوریت سے خوش ہیں کہ ہمارے اپوزیشن کے سیاست دان، اپنی آنے والی حکومت کے لیے کسی نئی جمہوریت کی تلاش میں ہیں۔ اللہ خیر کرے اور عوام اپنے لیے دعا کے ساتھ دوا بھی کریں۔

☆☆☆

دوشیزہ ایوارڈ یافتہ مصنفہ

عقیلہ حق

کے خوب صورت افسانوں کا مجموعہ

شائع ہو چکا ہے۔

کتاب ملنے کا پتا:۔
الحمد پبلی کیشنز
1، ڈیسنٹ پیراڈائز۔ایف بی ایریا،
بلاک 22۔کراچی۔
رابطے کے لیے:۔
0322-2830957

دوشیزہ میگزین

☆ بنتِ حوّا
☆ دریچے
☆ یہ ہوئی نا بات
☆ نئے لہجے، نئی آوازیں
☆ کچن کارنر
☆ نفسیاتی کالم
☆ بیوٹی گائیڈ

بلقیس، ملکۂ سبا

مسرت گیلانی

حضرت داؤد علیہ السلام کثیر الاولاد تھے۔ حضرت سلیمانؑ آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے مگر حضرت سلیمانؑ کے حصے میں جو میراث آئی، وہ تھی نبوت، اور جو اللہ کی طرف سے انعام ملا، وہ یہ تھا کہ آپ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ (سورہ النحل آیت ۲۰۔۲۲)

(ایک روز آپؑ نے اپنے لشکر کے اس حصے کا جائزہ لیا، جس میں پرندے بھی شامل تھے) آپؑ فرمانے لگے، کیا وجہ ہے کہ ہُد ہُد نظر نہیں آرہا، یا وہ غیر حاضر ہے (اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں ضرور اسے سخت سزا دوں گا یا اسے میرے پاس کوئی روشن سند لانا پڑے گی۔

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی۔ آپؑ کے پاس آیا اور ملک سَبا سے ایک یقینی خبر کے ساتھ کہ میں نے پایا، ایک عورت کو جو حکمران ہے۔" (ضیاء القرآن جلد سوم)

ملکہ سبا کا اصل نام بلقیس ہے اور بعض روایات کے مطابق، آپ زوجہ سلیمانؑ بھی ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا دائرہ معارف اسلام)

بلقیس لفظ، بعض علماء کے لحاظ سے عبرانی ہے۔ بلقیس بہت خوب صورت اور ذہین عورت تھی اور ملک سبا پر حکمرانی کرتی تھی۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ بلقیس کا باپ شراجیل بن مالک سرزمینِ یمن کا بادشاہ تھا۔ قرآن میں بلقیس کا ذکر اس کے نام سے نہیں بلکہ امرات کے لفظ کے ساتھ کیا گیا ہے، جیسے زلیخا کو امرات العزیز کہا گیا۔ سورۃ التحریم میں جو ملکہ سبا کی تصویر کھینچی گئی، وہ ایک اعلیٰ درجے کی ذہین، مدبر اور دُور اندیش حکمران خاتون کی ہے جو تواضع اور خوش گوئی سے بھی متصف نظر آتی ہے۔

ہُد ہُد مزید حضرت سلیمان کو یہ خبر دیتا ہے کے "اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز اور اس کے پاس ایک عظیم الشان تخت ہے اور میں نے پالیا اس کو اور اس کی قوم کو، کہ وہ سب سجدہ کرتے ہیں سورج کو، سوائے اللہ تعالیٰ کے۔"

یہ سب کچھ سن کر حضرت سلیمانؑ نے ہُد ہُد سے کہا "جو کچھ تم کہتے رہے ہو، ہم اس کی پوری تحقیق کریں گے کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے یا تم جان بچانے کے لیے کہہ رہے ہو کہ سبا نہایت خوب صورت جگہ ہے۔ جہاں خوش حال لوگ، باغات کی کثرت، میٹھا پانی، حیوانات کی کثرت اور صفائی کا بہترین انتظام اور پھر بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے پہاڑوں کے درمیان ایک بند Dam بنا ہوا ہے۔

یہ سب قصہ سن کر آپؑ نے اس کی تحقیق کا حکم دیا کہ (سورہ النحل آیت ۲۷۔۲۸) "لے جا میرا، یہ مکتوب اور پہنچا دے ان کی طرف، پھر ہٹ کر کھڑا ہو جا، ان سے اور دیکھ، وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں۔"

ہُد ہُد کا حضرت سلیمانؑ کا خط لے کر جانا، اس کا جواب ہُد ہُد کی سچی گواہی بھی ہے اور معلومات بھی، اور ہُد ہُد کو پابند کیا گیا کہ اس خط کے بعد کے حالات وہاں ٹھہر کر دیکھے اور ردِ عمل جو بھی ہو، اس سے آگاہ کرے اب اس خط کے پہنچانے پر علماء کی دو آراء ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ملکہ دربار میں موجود تھی۔ ہُد ہُد نے سر پر پھر پھڑانا شروع کیا اور ملکہ کے دیکھنے پر اس کی گود میں ڈال دیا اور یہ بھی خیال ہے کہ ملکہ سو رہی تھی کہ ہُد ہُد نے روزن سے داخل ہوا اور ملکہ کے پاس خط رکھ دیا۔

ملکہ نے خط پڑھ کے، اپنی قوم کے سرداروں کو مخاطب کیا اور کہا "یہ (عظیم الشان) عزت والا خط، میری طرف سلیمانؑ نے بھیجا ہے اور وہ یہ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہے، جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ تم لوگ غرور اور تکبر نہ کرو۔ میرے مقابلے میں اور چلے آؤ میرے پاس، فرمانبردار بن کر۔" (31-30)

اب ملکہ نے قوم سے مشورہ مانگا کہ اب کیا کرنا ہے۔ تو عقلمند مشیر وزیر سر جوڑ بیٹھتے ہیں اور جنگ کا مشورہ دیتے ہیں مگر ملکہ بلقیس، جنگ اور ذلت کی تباہی سے بچنا چاہتی ہے، اس لیے عظیم بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا دانشمندی نہیں بلکہ اس کے دین کو قبول کر لینا معقولیت ہے، اور پھر ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کی طرف، بے انتہا قیمتی تحائف، سونا چاندی اور جواہرات کے ساتھ لڑکیوں کے لباس میں پانچ سو غلام اور قیمتی چیزیں تحفتاً بھیجیں، لیکن حضرت سلیمانؑ نے تمام تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اُسے اپنی دولت و ثروت پر گھمنڈ ہے اس کے اس انداز سے وہ برہم ہوئے۔ قاصد تمام سامان لے کر واپس ملکہ سبا کے پاس گئے اور حال کہہ سنایا۔ ساتھ ہی حضرت سلیمانؑ کا پیغام دیا۔

سورہ النحل (ضیاء القرآن 3) ہم آرہے ہیں ان کی طرف ایسا لشکر لے کر جس کے مقابلے کی ان میں تاب نہیں۔ میرے درباریوں، تم میں سے کون لے آئے گا۔ میرے پاس اس کے تخت کو، اس سے پہلے کہ وہ آجائیں، میری خدمت میں۔ فرمانبردار بن کر عرض کی، ایک عفریت نے کہا، میں لے آتا ہوں آپ کے پاس، اس سے پہلے کہ آپ کھڑے ہوں۔"

آپ نے دیکھا وہ رکھا ہوا ہے تو فرمانے لگے "یہ میرے رب کا فضل ہے"۔

مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت سلیمانؑ، اللہ کے منتخب بندے ہیں، اس لیے بذریعہ وحی یہ علم ہو چکا تھا کہ ملکہ سبا بغرض آپ کی آزمائش آنے والی ہے۔ اب اس وقت ضرورت تھی کہ رب کی اجازت سے، ملکہ سبا کو لاجواب کیا جائے۔ اس بات پر عمل اس طرح کیا گیا کہ ملکہ سبا بلقیس کا وہ مشہور تخت جو تاریخ کے مفسرین کے مطابق، سونے چاندی کا بنا ہوا تھا اور جو اپنی چوڑائی، لمبائی کے حوالے سے بے مثل ہے اور قرآن میں اس کا ذکر بھی ہے کہ اس تخت پر نہایت بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے اور خوب صورتی میں بے نظیر تھا۔

حضرت سلیمانؑ نے اپنے درباریوں سے

کہا۔ ''اے سردارو! تم میں سے کوئی ایسا ہے جو (بلقیس) ملکہ سبا کے آنے سے پہلے اس کا تخت میرے پاس اٹھا لائے۔

ایک بہت قوی جن نے کہا: ''میں اس تخت کو آپ کا دربار ختم ہونے سے پہلے اٹھا لاتا ہوں۔ میں قوی بھی ہوں اور امانت دار بھی۔''

آصف بن برخیا، جو اسمِ اعظم جانتا تھا کہا، میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے بلقیس کا وہ تخت لا کر دے سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہی حضرت سلیمانؑ کے سامنے تخت آ گیا۔

حضرت سلیمانؑ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو تخت موجود تھا۔ آپ نے اس میں کچھ تبدیلی کروا دی کیونکہ بلقیس نے اس کی ذہانت کا امتحان لینا مقصود تھا کہ اگر وہ اپنا تخت نہ پہچان سکی تو کہوں گا کہ دنیاوی چیزوں کے پہچاننے میں یہ حال ہے تو اللہ کی ذات وصفات کے پہچاننے میں تم نے کتنی غلطی کی ہوگی۔ پھر جب بلقیس دربار میں پہنچی اور اس نے اپنے تخت کو نہ پہچانا اور کہا: ''جی ہاں ایسا ہی میرا تخت ہے مگر تھوڑی دیر بعد اسے پتا چل گیا کہ یہ اسی کا تخت ہے تو وہ شرمندہ ہوئی، اور حضرت سلیمانؑ سے معذرت کی اور کہا کہ ''ہم یہاں آنے سے پہلے ہی آپ کے فرمانبردار ہو چکے ہیں پھر حضرت سلیمانؑ نے انہیں غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا۔

بلقیس نے خوشی سے توبہ کی اور اسلام (توحید پر یقین) قبول کر لیا۔

حضرت سلیمانؑ نے دوسرا امتحان یہ لیا کہ جنات کی مدد سے ایک محل تیار کروایا جس کے صحن میں پانی کا حوض تھا اور حوض میں رنگ برنگ مچھلیاں تھیں، اور اس کو اوپر سے صاف بلور یا سفید شیشے سے (بند) پاٹ دیا تھا اور اس کے اوپر سے گزر کر، حضرت سلیمانؑ اپنے تخت پر جا بیٹھتے تھے۔

ملکہ بلقیس کو آنے کی دعوت دی۔ ملکہ بلقیس نے جب گھبراتے ہوئے شیشے پر پاؤں رکھا، اور اپنے کپڑے (پائنچے) اوپر کھسکائے تاکہ پانی سے گزر کر جا سکے، اس وقت حضرت سلیمانؑ نے فرمایا۔ ''یہ پانی کا حوض شیشے سے پٹا ہوا ہے۔ کپڑے گیلے نہ ہوں گے۔

ملکہ بلقیس، دربار میں اپنی بے عقلی اور گنوار پن ظاہر ہو جانے سے بہت کھسیانی ہوئی کہ وہ یہ سب پہچاننے سے قاصر رہی ہوں مگر اب سلیمانؑ کی ہدایت پر، ربُ العالمین پر ایمان لاتی ہوں۔''

بعض روایات کے مطابق، حضرت سلیمانؑ نے اس سے شادی کر لی اور ملک سبا پر اس کی حکمرانی کو برقرار رکھا اور خود وقفے وقفے سے اس کے پاس جایا کرتے تھے مگر بعض تاریخی کتابوں میں ایسا بھی تحریر ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کی شادی ہمدان کے بادشاہ سے کر دی تھی اور یمن کا اقتدار بھی اسے دے دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک جن زوبعہ نامی اس کی اطاعت خدمت کے لیے بھی دے دیا۔

ازواج الانبیاء، دائرہ معارف الاسلامیہ، کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہب بن منبہ کے مطابق (اسلام لانے کے بعد) بلقیس سات سال، سات ماہ تک حکمران رہی اور پھر اس کا انتقال ہو گیا اور شہر تدمر، جوارِ شام میں واقع ہے۔ وہاں ایک دیوار کے نیچے دفن ہے۔ (واللہ اعلم)۔

☆☆☆

دریچے

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کہو کہ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت قبول کرو۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے انکار کریں۔ (سورہ آلِ عمران: 31 تا 32)

مرسلہ: فرحانہ زبیری۔ سیالکوٹ

فرمانِ رسول ﷺ

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو جاتا ہے جو ایک لقمہ کھانے یا ایک گھونٹ پانی پینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرے۔ (ترمذی شریف)

حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ایک شخص با آوازِ بلند اعلان کرے گا، معاف کرنے والے کہاں (ہیں)؟ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے معاف کرنے کی وجہ سے بدلہ دے گا۔ (کنز العمال)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بہتر سلوک کرے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے اس مومن بندے کا بدلہ جس کی کوئی عزیز چیز میں دنیا سے اٹھا لوں۔ وہ اس پر ثواب کی نیت سے صبر کرے۔ میرے یہاں جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔ (صحیح بخاری شریف)

حضرت علی بن حسینؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: آدمی کے اسلام کی خوبی فضول باتوں کو ترک کرنا ہے۔ (موطا امام محمد)

مرسلہ: جنید احمد۔ کراچی

مورتیاں

آؤ عدم پھر ان سندر، سندر مورتیوں سے پیار کریں
اُجلے اُجلے دھوکے کھائے ایک زمانہ بیت گیا
(عبدالحمید عدم)

مرسلہ: نازیہ بیگ۔ کوئٹہ

جھوٹا

ایک عمارت میں ایک ہی لفٹ تھی وہ بھی بہت

پرانی۔ ایک مرتبہ وہ درمیان میں پھنس گئی۔ لفٹ کے اندر صرف ایک آدمی تھا۔ چوکیدار نے لوہے کی جالی دار دروازے سے اسے دیکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا: ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے لفٹ ٹھیک کروانے والے مستری کو فون کر دیا ہے۔“

”جھوٹے کہیں کے، میں ہی لفٹ ٹھیک کرنے والا مستری ہوں۔“ لفٹ میں پھنسا ہوا آدمی غصے سے بولا۔

مرسلہ: عبدالرحمٰن۔ میرپور ساکرو

دوزخ

ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ محبت اور نفرت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد ”شدت“ ہے، جس سے محبت ہو وہ بھی ذہن میں رہتا ہے اور جس سے نفرت ہو وہ بھی ہر وقت حافظے میں رہتا ہے۔

مرسلہ: احسان راؤ۔ ملتان

نمکین غزل

عاشقی کا یہ شاخسانہ ہوا
آج کی شب مقام تھانہ ہوا
تیر محبوب نے جو برسائے
کوئی اندھا تو کوئی کانا ہوا
قرض لے کر کہاں گیا مقروض
جس کو دیکھے ہوئے زمانہ ہوا
عید کے سُوٹ پر یہ گل کاری
اور اس گل کا پان کھاتا ہوا
ہم نے اس کی گلی کی جھاڑو دی
کام ہم سے یہ مہترانہ ہوا
سود پہ نوٹ جب لیے عاصی
یہ کھنڈر تب ہی آشیانہ ہوا

(شاعر: مرزا عاصی اختر)

مرسلہ: عبدالقادر آزاد۔ سندھ

روشن موتی

☆ اللہ نعمتیں دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی امتحان لیتا ہے۔

☆ آپ کی زبان سے نکلا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ نیک عمل وہ ہے جو لوگوں سے بے نیاز ہو کر کیا جائے۔

☆ کلام میں شائستگی، کھانے میں نمک کی طرح ہے۔

☆ جو عقل مند سے لڑے، وہ عزت کی توقع نہ رکھے۔

☆ غربت کو ختم کرنا بہت آسان ہے۔ امارت کو ختم کر دیں، غربت خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔

☆ لوگوں کے دل بھی خریدے جاسکتے ہیں مگر ان کی قیمت دل کی صورت میں ہی ادا ہو سکتی۔

☆ دوسروں سے توقع رکھنی چھوڑ دو۔ زندگی سہل ہو جائے گی۔

اپنے لیے ایسے دروازے نہ کھولو جو بعد میں بند نہ کر سکو۔

مرسلہ: خدیجہ بیگم۔ میرپور خاص

محبت کا دعویٰ

ایک کنیز آدھی رات کو کھڑی دعا کر رہی تھی: ”اے اللہ! اس محبت کے صدقے جو تجھ کو مجھ سے ہے۔ میری دعا قبول کر لے اور میرے گناہ معاف کر دے۔“

مالک کی آنکھ کھل گئی کہنے لگا۔ ”تو کیسے یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔“

کنیز نے کہا: ”اگر اللہ مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز پڑھنے کی توفیق نہ دیتا اور میں بھی تیری ہی طرح سو رہی ہوتی۔“

مرسلہ: شریفہ کنول۔ لاہور

دیوانہ

ہر اک چہرے کو تکتا تھا اک پاگل دیوانہ
جانے کس کو ڈھونڈ رہا تھا اک پاگل دیوانہ
دل تو خدا کا گھر ہوتا ہے اس کو مت توڑو
گیت یہی گاتا پھرتا تھا اک پاگل دیوانہ

(شاعر: عارف شفیق)

مرسلہ: محمد احمد۔ اسلام آباد

خواہش

اے کاش ایسا ہو کہ میں اپنی زندگی کی ساری خوشیاں تیری جھولی میں ڈال کر خود غموں کی چادر اوڑھ کر سو جاؤں۔

میں اپنے ہونٹوں کی ہنسی تیرے چہرے پر سجا کے خود اداسیوں کے جنگل میں کھو جاؤں۔

اے کاش ایسا ہو کہ میں رہوں نہ رہوں میرا نام تیرے نام کا حصہ بن کر ابد تک زندہ رہے۔

مرسلہ: پارس علی۔ راولپنڈی

بھیگے موسم

برسات کے موسم سے تجھے پیار بہت تھا
اب دیکھ لے آکر میری بھیگی ہوئی آنکھیں

مرسلہ: زارا حسن۔ کراچی

خوش نصیب

بیماری نے دولت سے کہا: ”تم کتنی خوش نصیب ہو کہ ہر کوئی تمہیں پانے کی کوشش کرتا ہے اور میں کتنی بدنصیب ہوں کہ ہر کوئی مجھ سے دور بھاگتا ہے

دولت بولی!

خوش نصیب تو تم ہو کہ تمہیں پاکر لوگ اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور بدنصیب تو میں ہوں کہ مجھے پاکر اکثر لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں۔

مرسلہ: شازیہ حسن۔ ڈیرہ اسماعیل خان

مجبوری

ایک بچے کا امتحانی پرچہ بہت خراب ہوا۔ اس نے امتحانی پرچے کے آخر میں لکھا: ”ماسٹر صاحب! بجلی نہ ہونے کی وجہ سے میں امتحان کی تیاری نہ کر سکا، گزارش یہ ہے کہ کسی طرح مجھے پاس کر دیں۔“

ماسٹر صاحب نے کاپی پر دستخط کرتے ہوئے نیچے لکھا: ”بیٹا! میں تمہیں ضرور پاس کر دیتا مگر میری مجبوری یہ ہے کہ اس وقت میرے گھر میں بجلی آ رہی ہے۔“

مرسلہ: بلاول شاہ۔ کراچی

محبت کیا ہے؟

- ایک ایسا پھول ہے، جو دل میں کھلتا ہے تو انسان کی زندگی اس کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے۔
- ایسا پاکیزہ رشتہ ہے، جو ہر رشتے پر برتری حاصل کر لیتا ہے۔
- ایک احساس ہے، کسی کی چاہت اور الفت کا۔
- دل میں نئی امنگ، نیا احساس اور جستجو جگاتی ہے۔
- اس کا رشتہ پھول سے زیادہ نازک اور چٹان سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔
- انسان کو خدا کے قریب لے جاتی ہے۔
- خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔

مرسلہ: فرزانہ احمد۔ حیدرآباد

آنسوؤں کی حقیقت

کیمسٹری کے ایک پروفیسر اپنی بیوی سے ناراض ہو گئے تو بیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ پروفیسر صاحب بولے: ”بیگم جتنا رونا ہے رو لو۔ مجھ پر تمہارے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یہ

آنسو ہیں کیا چیز!! تھوڑی سی فاسفورس، کچھ نمکیات، تھوڑا سا سوڈیم فلورائیڈ اور باقی سارا پانی۔"

مرسلہ: زہرہ تبسم۔ سکھر

نیا اندازِ بیاں

ٹیلی ویژن: تجھے نہ دیکھوں تو چین مجھے آتا نہیں۔
بیروزگار: یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں۔
عوام: شکوہ نہیں کسی سے۔ کسی سے گلہ نہیں۔
نوکری: میرے نصیب میں تو ہے کہ نہیں۔
بجلی: ساری رات تیری یاد مجھے آتی رہی۔
نیٹ: تو چیز بڑی ہے مست......مست۔
تنخواہ: دلبر میرے کب تک مجھے ایسے ہی تڑپاؤ گے۔
قرض خواہ: ایسے بھی ہیں مہرباں زندگی کی راہ میں
جب ملے تو یوں ملے جیسے جانتے نہیں

مرسلہ: کومل صدیقی۔ کراچی

عہدِ وفا

ایک لڑکا اور ایک لڑکی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ لڑکے نے ایک رقعہ لڑکی کو دیا۔ لڑکی نے رقعہ پڑھنے سے پہلے ہی لڑکے سے کہا: "مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی۔ میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔"

اچانک ایک تیز رفتار کار ان کی کار سے ٹکرائی۔ لڑکے کا اسی وقت انتقال ہو گیا مگر لڑکی بچ گئی۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی نے رقعہ کھول کر پڑھا تو اس کے آنسو اس کاغذ پر گرنے لگے۔ رقعے میں لکھا تھا۔

"جس دن تم مجھے چھوڑ دو گی۔ میں دنیا چھوڑ دوں گا"

مرسلہ: نوشین حسن۔ لاہور

ڈائمنڈ کا سیٹ

بیوی نے شوہر کو فون کیا: "اس وقت کہاں ہیں آپ؟"

شوہر نے کہا: "تمہیں وہ جیولرز کی دکان یاد ہے جہاں تم کو ڈائمنڈ کا سیٹ پسند آیا تھا اور میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ میں خرید سکتا۔" بیوی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔"

"میں اس کے ساتھ والی دکان پر بال کٹوا رہا ہوں۔" شوہر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: عمارہ۔ ملیر، کراچی

دل کی پکار

زندگی کے چند لمحے ایسے ہوں گے۔ جب تم کسی کو چاہو گے لیکن تمہیں چاہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ جب تم کسی کا انتظار کرو گے مگر تمہارا انتظار کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ جب ستارے تو ہوں گے مگر تمہارا چاند کہیں نہ ہوگا۔ جب تمہاری آنکھوں میں آنسو تو ہوں گے مگر ان کو پونچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس لیے زندگی کے ان لمحات میں آ کر کوئی پیار، چاہت، محبت اور خلوص سے بلائے تو چلے جانا کہ شاید بعد میں کوئی بلانے والا بھی نہ ہو۔

مرسلہ: شاہین۔ حیدرآباد

☆.....☆

یہ ہوئی نا بات

سوال آپ کے...... جواب زین العابدین کے!!

نور جہاں.........لالہ موسیٰ
☆ سنا ہے آج کل آپ چاند پر جانے کا سوچ رہے ہیں؟
◆ کیا کروں۔ زمین سے یہی قریب ہے۔

کرن شہزادی.........راولپنڈی
☆ اچھے بھیا، جنت میں کون لوگ جائیں گے؟
◆ وہاں بھی ہم اور آپ ہی ہوں گے۔

نوما جہانگیر.........جہلم
☆ زین بھائی! آج کل ٹماٹر سستے کیوں ہو گئے ہیں؟
◆ شکر کرو ٹماٹر ہوئے ہیں......اس حکومت میں کچھ تو سستا ہوا!

سلمیٰ ناز.........حیدرآباد
☆ الیکشن اور سلیکشن میں کیا فرق ہے؟
◆ پاکستانی، ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں......ہاہاہا۔

فاکہہ اسرار.........کھاریاں
☆ لڑکے آج کل پڑھائی میں دل کیوں نہیں لگاتے؟
◆ سوری! میری صنف پر ایسا الزام......!

شیخ محمد اسد.........کراچی
☆ زین بھائی The Dirty Picture کے کیا معنی ہیں؟
◆ Super Hit۔

حاسم وقاص.........لاہور
☆ بادشاہو، جی آیا نوں؟
◆ ویلکم چوہدری صاحب۔

راشدہ اعجاز.........کراچی
☆ موسمِ بہار کا سب سے بڑا نقصان کیا ہے؟
◆ بھائی موسموں کو تو پوزیٹو لیا کرو۔

راحیلہ بانو.........دبئی
☆ پاکستانی چینلز، کیا واقعی اپنا چارم کھو رہے ہیں؟
◆ اگر ایسا ہوتا تو ہر نئے دن نیا چینل نہ کھل رہا ہوتا، چینل کو چھوڑیں ڈائجسٹ پڑھیں۔

فہد نسیم.........کویت سٹی
☆ Maths کس نے دریافت کی؟
◆ باخدا! میں نے ایجاد نہیں کی۔ میں بھی اسی جینئس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

زاہدہ خان.........بورے والا
☆ نیوٹن کون تھے زین بھائی؟
◆ واقعی کون تھے؟؟ میں بھی سوچ میں گم ہوں،

سیب کھاتے ہوئے۔

روشنی اکرم ....حویلیاں

☆ ہر روز میرا ہی ستارہ کیوں گردش میں رہتا ہے؟

﴾ اخبار الٹا تو نہیں پڑھتیں آپ۔

تعظیم علی ....ایبٹ آباد

☆ نانی اور دادی، دونوں رشتوں میں کیا فرق ہے؟

﴾ ماں اور باپ کا۔

شائستہ قیصر ....گوجرانوالہ

☆ زین بھائی شعر میں جواب دیں
تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے

﴾ جب بھی چھپ چھپ کے کچھ بھی کھاؤ گے۔

شازیہ ظہیر ....ساہیوال

☆ آئس کریم جلدی کیوں پگھل جاتی ہے؟

﴾ اس لیے، کہ وہ آئس کریم ہے بس اتنی سی بات ہے!!

رابعہ انعام ....کراچی

☆ میں اپنی دوست کا نام بدل کر Shakeera رکھ رہی ہوں؟

﴾ بس نام ہی بدلنا؟؟

سید بدر عالم ....لاہور

☆ سنا ہے، پہلے زمانے میں فلمیں پردے پر چلا کرتی تھیں؟

﴾ میں نے بھی سنا ہی ہے۔

نسیم شفیق ....اسلام آباد

☆ رومن اعداد، نصاب میں کیوں شامل ہیں؟

﴾ تاکہ مجھے اور آپ کو گھڑی کا استعمال آجائے۔

فرح عالم ....اسلام آباد

☆ زین جی، اگر مہینہ ساٹھ دن کا ہوتا تو؟

﴾ تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا، ہم بھی سب کچھ، تب بھی کر رہے ہوتے۔

احمد کمال ....گجرات

☆ زین بھائی، چڑیا لائی چنے کا دانہ اور چڑا کیا لایا؟

﴾ پورا Pizza۔ اب چڑیا چڑا بھی موڈ ہوگئے ہیں۔

مہ پارہ ....چیچہ وطنی

☆ زندگی میں جانے کیوں رنگ پھیکے پڑتے جا رہے ہیں؟

﴾ میرا خیال ہے آپ فوراً کسی آئی اسپیشلسٹ سے رجوع کریں۔

علی شاہ ....گھوٹکی

☆ زین بھائی تشہیر کا سب سے تیز ذریعہ کون سا ہے؟

﴾ آج بھی وہی اپنی بی جمالو ٹائپ، آنٹیاں۔

ثمینہ علی ....سجاول

☆ زین بھائی کیا سسرال، واقعی گیندے کا پھول ہوتا ہے؟

﴾ پھول کی چوائس آپ کی اپنی ہے۔

راحیل علی ....میرپور

☆ جلدی سے بتائیں پانی کا فارمولا کیا ہے؟

﴾ پانی تک تو حکومت نے بند کر دیا ہے۔ کوئی نیا فارمولا سوچتے ہیں۔

غیاث الدین ....پشاور

☆ Instant لفظ کس کی ایجاد ہے؟

﴾ جس نے ایجاد کیا، جلدی میں تھا۔ نام بتانا بھول گیا۔

صبیحہ خان ....ایبٹ آباد

☆ بھائی، کیا الو صرف رات ہی کو دیکھ سکتے ہیں؟

﴾ آپ دن میں تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

شعبان کھوسہ ....کوئٹہ

☆ میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند چوکور ہو گیا ہے؟

﴾ جاگ جائیں، چاند پھر سے گول ہو جائے گا۔

لیلیٰ گل ....بھوربن

☆ پہیہ چلتے رہنے سے کیا فائدہ ہے؟

﴾ پیٹرول، بادل بنا رہا ہے۔

عاصم خان نیازی ....میانوالی

☆ K.M.C کا مخفف کیا ہے بھیا؟

﴾ کراچی میں کنٹرول۔

اوج فرحان ....واہ کینٹ

☆ بھیا کراچی میں کوئی ایسی عمارت ہے، جو جنوں نے بنائی ہو؟

﴾ یہ کام جنات ہی کرتے ہیں، آدمی تو بس......

زوباریہ ....لائل پور

☆ بھیا، یہ اپنا کراچی سے کیا مراد ہے؟

﴾ وہی جو آپ سمجھیں۔

محمد عالم ....کوٹری

☆ تارے آسمان پر ہی چمکتے ہیں کیا؟

﴾ اکثر سر پر بھی چمکنے لگتے ہیں۔

سید زاہد شاہ ....بلوچستان

☆ میں بلوچستان میں CNG اسٹیشنز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کیا کروں؟

﴾ پہلے وہاں عام پبلک تک گیس تو پہنچا دو۔

رحمان خان ....میرپور خاص

☆ ہمارے ملک کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں کون سی ہیں؟

﴾ ہمارے ملک میں ہر سیاسی پارٹی بڑی ہے۔

فرحت جمال ....کراچی

☆ چاند کی چاندنی راتیں ہوتی ہیں تو سورج کے دن کیا ہوتے ہیں؟

﴾ آپ نے تو خود ہی جواب دے دیا۔

نئی آوازیں

غزل

اپنا اندر دیکھ رہا ہوں
درد سمندر دیکھ رہا ہوں
دیکھ رہا ہوں جلتے خیمے
نیزوں پر سر دیکھ رہا ہوں
آگے اک دیوار کھڑی ہے
پیچھے لشکر دیکھ رہا ہوں
اپنا خون بہانا ہوگا
دھرتی بنجر دیکھ رہا ہوں
بیچ رہے ہیں قوم کی عزت
کیسے لیڈر دیکھ رہا ہوں
ایک گلا ہے، میرا ازور
کتنے خنجر دیکھ رہا ہوں

ازور شیرازی۔ شاہ پور سٹی

اک بار تو سُن .....!

تیری یاد کی رو میں بہتا ہوں
میں نظم ابھی بھی کہتا ہوں
اے جانِ سخن، اک بار تو سُن
ترے ہنسنے سے تیرے جانے سے
میں نظم بنائے جاتا ہوں
کچھ اُلٹی سیدھی تحریریں
سب تیری میری تصویریں
میری آنکھوں میں تابندہ ہیں
مرے لفظ اُنہی سے زندہ ہیں
ورنہ میں اور یہ کام کہاں؟
یہ قلم کہاں، وہ شام کہاں
کیا بات کروں، کیا تجھ پہ لکھوں
ترے چہرے کو کیا نام میں دوں
میں تجھ کو پاس بلانے کی
اک رسم نبھائے جاتا ہوں
کچھ جوڑ کے ٹیڑھے میڑھے لفظ
بس نظم بنائے جاتا ہوں

توصیف انور واحدی۔ لاہور

عہد

کرتے رہو تم جور و ستم
ہر ظلم خوشی سے سہہ لیں گے
جو عہد کیا تھا تم سے صنم
اس کو بھی تو پورا کرنا ہے
یہ دل بھی امانت ہے تیری
یہ جان بھی تجھ پہ واریں گے
جو!!
عہد کیا تھا تم سے صنم
وہ عہد بھی نہ ہاریں گے

نگہت اکرم۔ لاہور

معمول

رات بیتتی چلی جارہی ہے
بھیگتی چلی جارہی ہے
تیرے انتظار میں
آنسوؤں کی دھار میں

نوید رحمت۔ لاہور

غزل

کسی کے عشق میں اب دیدہ تر نہیں رہنا
برا ہے دشت مجھے دربدر نہیں رہنا
اگر ہے آپ کو ہم سے کوئی گلہ تو پھر
ہمیں بھی آپ کے زیرِ اثر نہیں رہنا
کئی "خداؤں" کے ہم لوگ ہیں ستائے ہوئے
ہماری آہ کو اب بے اثر نہیں رہنا
کہ جس نے دھوپ فراشوں میں عمر کاٹی ہے
تو اس کا ابر کے سائے میں گھر نہیں رہنا
انا کی ڈھال میں خود کو چھپا لیا اُس نے
تمہارے طنز نے کچھ کارگر نہیں رہنا
ابھی وقار ہواؤں پہ راج کرنا ہے
قفس میں قید ہمیں عمر بھر نہیں رہنا

وقار خان۔ لیہ

غزل

ایک مشکل سی ہے کسانوں پر
برف پگھلی نہیں چٹانوں پر
ایک افسانہ لکھا جائے گا
عشق کے اُن گنت فسانوں پر
لوگ سامان چھوڑ کر بھاگے
کس کا سایا ہے اِن مکانوں پر
امن کی فاختہ ہے اڑنے کو
تیر سجنے لگے کمانوں پر
مانگتے ہیں خدا سے ہی خرم
ایک ہی نام ہے زبانوں پر

خرم امین شبیر۔ ابوظہبی

غزل

آداب کے، سلام کے معنی بدل گئے
یعنی ہر ایک کام کے معنی بدل گئے
دولت نے سحر پھونک دیا ہے فریب کا
لوگوں میں احترام کے معنی بدل گئے
پہلے تو مثلِ خلد تھے جانے سے آپ کے
دیوار و در کے، بام کے معنی بدل گئے
اِک بار اُن کی زلف کو ہم نے کہا تھا شام
تب سے ہر اِک شام کے معنی بدل گئے
عمران تم کو وقت نے تنہا بنا دیا
دیکھو، تمہارے نام کے معنی بدل گئے

عمران تنہا۔ کاموکے

اب بھی باقی ہے

دُھندلے ماضی میں آج بھی کہیں
ایک یاد، ابھی بھی باقی ہے
ہجر کی اک اُداس شام اب بھی باقی ہے
آنکھوں میں تری یاد کا آنسو اب بھی باقی ہے
دِل میں بہاروں کے کچھ رنگ اب بھی باقی ہیں
ہجر کی وہی اُداس شام اَب بھی باقی ہے
دِل کے کسی گوشے میں
آس کے دیے کی ٹمٹماہٹ اب بھی باقی ہے
زندہ ہوں مجھے گمان اکثر ایسا ہوتا ہے
میری تقدیر کا اک ماتم اب بھی باقی ہے

فرحت جمال۔ کراچی

کچن کارنر

شزاء گیلانی

گوشت ہو، دال یا سبزی، اگر محبت سے، دل سے تیار کی جائے تو ہاتھ میں ذائقہ بھی قدرتی طور پر زیادہ ہوگا۔ اس ماہ بھی آپ کے ساتھ ساتھ کچن میں کچھ نئی ترکیب لیے، یہ سلسلہ آپ کے دسترخوان کی رونق میں یقیناً اضافہ کرے گا۔

گرین اسپائسی بریانی

اجزاء

مٹن، بیف، چکن	: ایک کلو
چاول	: ایک کلو
ادرک، لہسن پیسٹ	: دو کھانے کے چمچے
پیاز	: تین عدد (درمیانی، گولڈن کرلیں)
ہری مرچ	: دو عدد
ہرا دھنیا	: ایک گڈی
پودینہ	: ایک گڈی
کٹی کالی مرچ	: ایک چائے کا چمچ
ثابت گرم مسالہ	: ایک کھانے کا چمچ
دہی	: ڈیڑھ کپ
عرق گلاب	: ایک کھانے کا چمچ
دودھ	: پون کپ
لیموں	: ایک عدد
نمک	: حسب ذائقہ
تیل / گھی	: حسب ضرورت

ترکیب: ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ کو باریک پیس لیں۔ اب تیل میں آدھی پیاز، گوشت، ادرک، لہسن، نمک ڈال کر گوشت کو بھون کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب گل جائے تو ہری چٹنی، دہی، کالی مرچ ڈال کر 5 منٹ بعد چولہے سے اتار لیں۔ چاولوں میں، گرم مسالہ ڈال کر ایک کنی پر ابال لیں۔ اب پتیلی میں ایک تہہ چاول کی لگائیں۔ اس کے اوپر گوشت اور پھر چاول ڈال دیں۔ دودھ میں عرق گلاب ڈال دیں۔ لیموں بھی نچوڑ کر ڈال دیں۔ چاولوں کو دم پر رکھ دیں۔ باقی آدھی پیاز اوپر سے ڈال دیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

رنگین سویاں

اجزاء

سویاں	: ایک پاؤ
دودھ	: ڈیڑھ کلو
چینی	: دو کپ
لال زردے کا رنگ	: ایک چائے کا چمچ
گھی	: دو کھانے کا چمچ
کشمش، بادام، پستہ	: حسب ضرورت (کاٹ لیں)

ترکیب: ایک فرائی پان میں گھی گرم کریں۔ اس میں سویاں اور زردے کا رنگ شامل کرلیں اور اچھی طرح فرائی کریں اور ایک پلیٹ میں نکال کر الگ رکھ دیں۔ ایک پتیلی میں دودھ گرم کریں۔ اس میں چینی اور تھوڑا سا زردے کا رنگ ڈالیں اور درمیانی آنچ پر پکائیں۔ جب چینی گھل جائے تو اس میں سویاں شامل کردیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک سویاں گل نہ جائیں۔ اب اس میں میوہ ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کریں اور چولہے سے اتار لیں، گارنش کر کے پیش کریں۔

آلو چکن ڈونٹس

اجزاء

آلو (ابلے ہوئے)	: ایک کلو
چکن کا قیمہ	: آدھا کلو
ہرا دھنیا	: آدھی گڈی
زیرہ	: آدھا چائے کا چمچ
ہری مرچ	: پانچ عدد
پیاز (کٹی ہوئی)	: ایک عدد
انڈے	: دو عدد
کارن فلور	: چار کھانے کے چمچ
ادرک لہسن پیسٹ	: ایک کھانے کا چمچ
گرم مسالہ پاؤڈر	: ایک چائے کا چمچ
ہلدی	: آدھا چائے کا چمچ
نمک	: حسب ذائقہ
ڈبل روٹی کا بورا	: ایک پیالی
تیل	: تلنے کے لیے

ترکیب: آلو، چکن کا قیمہ، ہرا دھنیا، زیرہ، ہری مرچ، پیاز، کارن فلور، میدہ، ثابت لال مرچ، ادرک لہسن کا پیسٹ، گرم مسالہ، ہلدی اور نمک کو بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔ اب اس کمپچر کو گول کباب کی شکل میں تیار کر کے ٹرے میں رکھیں اور کسی گول چیز یا انگوٹھے کی مدد سے درمیان میں سوراخ کرلیں۔ اب ڈونٹس کو پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈپ کر کے ڈبل روٹی کے چورے میں رول کریں اور آئل میں فرائی کریں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ آلو چکن ڈونٹس کا لطف دوبالا کریں۔

ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزاء

ڈبل روٹی	: چھ ٹکڑے
دودھ	: ایک کلو
چینی	: حسب ذائقہ
گھی	: حسب ضرورت
بادام	: دس سے بارہ عدد (باریک کٹے ہوئے)
کیوڑہ	: چند قطرے
الائچی	: چھ عدد

ترکیب: ایک پتیلی میں دودھ چڑھا دیں۔ اُبال آنے کے بعد اتنا پکائیں کہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔ ڈبل روٹی کے سخت کناروں کو کاٹ لیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ اب ان ٹکڑوں کو دودھ میں شامل کردیں۔ چمچ سے برابر چلاتی رہیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو گھی ڈال کر بھونیں۔ اس کے بعد اس میں چینی شامل کردیں اور دوبارہ سے بھونیں، پھر بادام اور کیوڑہ ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ لذیذ ڈبل روٹی کا حلوہ تیار ہے۔

کریمی کولڈ کافی

اجزاء

کافی	: دو کھانے کے چمچ
چینی	: دو کھانے کے چمچ
چاکلیٹ آئس کریم	: حسب ضرورت
دودھ	: ایک کپ
برف	: حسب ضرورت

ترکیب: دو چمچ گرم پانی کے لے کر اس میں چینی اور کافی ڈالیں اور خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس کمپچر کو بلینڈر میں ڈالیں اور ساتھ ہی برف بھی ڈال

دیں۔ اتنا بلینڈ کریں کہ کافی کریمی ہو جائے۔ اس کے بعد بلینڈر میں دودھ اور آئس کریم ڈال کر ایک بار پھر بلینڈ کریں۔ کریمی کافی کا لطف دوبالا کرنے کے لیے ماسے کریم اور چاکلیٹ سے سجا کر پینے کے لیے پیش کریں۔

کوکونٹ کھیر

اجزاء

ناریل : پچاس گرام (کدوکش کیا ہوا)
چاول : دو کھانے کے چمچ (ایک گھنٹے پہلے بھگو دیں)
چینی : دو کھانے کے چمچ
شہد : دو کھانے کے چمچ
الائچی پاؤڈر : آدھا کھانے کا چمچ
دودھ : تین کپ
ناریل : سجاوٹ کے لیے (باریک کٹا ہوا)

ترکیب: ایک پتیلی میں دودھ ابال لیں۔ اب دودھ میں چاول اور الائچی ڈال دیں اور چاول گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد چینی، شہد اور ناریل شامل کر کے مزید پکائیں۔ گاڑھا ہو جانے پر کھیر کو چولہے سے اتار لیں۔ باؤل میں نکال کر ناریل اور الائچی دانے سے گارنش کریں۔

گلاب کا شربت

اجزاء

پانی : پانچ کپ
چینی : 750 گرام
عرق گلاب : ایک چائے کا چمچ
لال رنگ : ایک چٹکی
لیموں : ایک عدد
دار چینی پاؤڈر : ڈیڑھ چائے کا چمچ

ترکیب: ایک پتیلی میں پانی اور چینی کو ملا کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے۔ چولہا بند کر دیں، پھر اس میں عرق گلاب، لیموں، دار چینی پاؤڈر اور لال رنگ شامل کریں۔ اچھی طرح مکس کریں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

رس ملائی

اجزاء

خشک دودھ : دو کپ
بیکنگ پاؤڈر : دو چائے کے چمچ
میدہ : ایک چائے کا چمچ
گھی : دو کھانے کے چمچ
انڈے : دو عدد
دودھ : دو کپ
چینی : دو کپ
ہری الائچی : آٹھ یا دس
پستہ : حسب ضرورت

ترکیب: دودھ ابال لیں اس میں الائچی اور چینی شامل کر دیں۔ دودھ کو پانچ دس منٹ پکائیں۔ ایک برتن میں خشک دودھ، میدہ اور گھی شامل کریں اور پھینٹ کر انڈے ڈالیں اور نرم درمیانے سائز کے پیڑے بنائیں۔ اب دودھ میں شامل کر دیں۔ آنچ تیز کر دیں اور پانچ منٹ تک پکائیں۔ اب آنچ دھیمی کر دیں اور مزید دس پندرہ منٹ تک پکائیں۔ پستے سے گارنش کریں اور ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

☆☆☆

ماں

مرے پیارے جگر گوشو!
مجھے تم سے یہ کہنا ہے
کہ رشتہ ایک ہے دنیا میں
سچا بے غرض رشتہ
جسے تم سے کوئی حاجت نہیں
کچھ بھی نہیں لینا
کہ اُس کے پاس ہر شے ہے
وہ دینا جانتی ہے اور کچھ لینا نہیں آتا
محبت مامتا، بے لوث چاہت اور
دُعائیں ہیں
جو وہ سب اپنے پیاروں میں
برابر بانٹ دیتی ہے
وہ چاہت جو تمہیں دنیا میں
کوئی دے نہیں سکتا
وہ تم کو ہر طرح
ہر حال میں خوش دیکھنا چاہے
ذرا سی دُکھ کی پرچھائیں
تمہارے پھول سے چہروں پہ گر اس کو
نظر آئے
تو وہ سب دُکھ تمہارے
اپنے دامن میں چھپا لے گی
تمہیں پھر سے شگفتہ شادماں
بے فکر کر دے گی
کبھی سوچا کہ اپنا سب اثاثہ سونپ کر تم کو
تہی دامن کھڑی ہے
کون ہے؟
ہاں غور سے دیکھو
یہ اک ماں ہے

سعدیہ حریم

نفسیاتی کالم

اندازِ فکر

نمرلہ پروین

قارئین! ہم سب اور ہمارے چھوٹے چھوٹے مسائل، کبھی کبھی جسمانی بیماریوں کی صورت میں ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کی رہنمائی کے لیے اپنے اس نفسیاتی کالم میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ ہوسکتا ہے اس کو پڑھنے اور جاننے کے بعد آپ کی پریشانی، آپ کا مسئلہ حل ہوجائے۔ آج کا موضوع ہے انداز فکر۔

اب تک ہم نے بہت دفعہ یہ سنا اور پڑھا ہے کہ اگر ہم اچھا سوچیں گے تو اچھا ہی ہوگا مگر یہاں پر یہ سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ ہماری سوچ نا صرف خود ہم پر بلکہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، بالکل اسی طرح دوسروں کی سوچ بھی ہمیں متاثر کرتی ہے۔ مثلاً آپ کے اطراف میں اگر کوئی ایسا شخص ہے جو کہ آپ کے لیے مثبت سوچ رکھتا ہے۔ اس کی صرف موجودگی آپ کی تکالیف یا ذہنی دباؤ کو کافی حد تک کم کردیتی ہے۔ اسی طرح ہماری صرف مثبت سوچ یا طرزِ فکر ماحول کو خوشگوار بنا سکتی ہے۔ یہ بات اب ہم لوگ اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہیں اور اس کا عملی مظاہرہ کسی بھی وقت خود پر یا دوسروں پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اب یہاں پر ہم صرف اپنی اپنی شخصیت کا جائزہ لیں گے یعنی معاشرے میں پر اثر شخص کا اضافہ کرنے کے لیے، ہمیں خود اپنا تجزیہ سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ لہٰذا اب سوچیں کہ اپنے بارے میں خود آپ کیا رائے رکھتی ہیں۔ اس کے بارے میں کبھی آپ نے سوچا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے، آپ کی رائے خود آپ کے بارے میں مثبت ہے یا منفی اور ان کے اثرات آپ کی زندگی پر کیا پڑ رہے ہیں اگر آپ یہ سب جانتی ہیں تو کیا آپ نے ان اثرات پر قابو پانے کی شعوری طور پر کوشش بھی کی ہے۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہماری سوچ یا طرز فکر کا خود ہم پر اثر جاننا مشکل کام ہوسکتا ہے لیکن اس کے بارے میں جاننا ہماری شخصیت اور حالات کے لیے بے حد ضروری ہے کیونکہ ہماری اپنے بارے میں رائے زیادہ اہم ہوتی ہے، بہ نسبت دوسروں کی ہمارے بارے میں رائے کے..... میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو خود کو سمجھتے ہیں، اس کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے دوسروں کی رائے کمزور دکھائی دیتی ہے۔ یہ اس

وجہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ زندگی کا زیادہ تر وقت ہم اپنی ذات کے ساتھ گزارتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں، خود سے کیا امید رکھتے ہیں۔ یہ سوچنا بھی بہت ہی اہم ہوتا ہے۔

ہمارا Self Respect ,self image ہماری زندگی کے لیے اپنائے گئے رویوں کا تعین بھی کرتی ہے اور ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

اب اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ آپ اپنے بارے میں کیا سوچتی ہیں تو چونکہ ہم اپنے آپ کو پڑھا لکھا اور قابل سمجھتے ہیں لہٰذا فوراً کہیں گے کہ بھئی ہم تو اپنے آپ کو بہت اہم اور اچھا سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ ایک فوری ردِعمل ہوگا، اس کے بعد اگر ہم کچھ دیر تنہا سکون سے بیٹھ کر سوچیں تو پتا چلے گا کہ ہم دوسروں کے لیے بہت ہمدردی کا جذبہ رکھنے کے باوجود خود اپنی ذات پر خاص مہربان نہیں ہوتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم اپنے لیے کیا احساسات رکھتے ہیں؟ تو یہ جاننے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے مگر اس کے لیے مسلسل مشق کی ضرورت پڑتی ہے اگر ہم روزانہ یہ مشق کریں تو اپنے بارے میں بہتر سے بہتر طور پر جان سکیں گے۔

اب ہم مشق کی بات کریں تو اس کے لیے ہمیں دن میں کچھ لمحوں سے لے کر کئی گھنٹوں تک کے لیے وقت نکال کر خود اپنے اور اپنی زندگی کے لیے پلاننگ ضرور کرنی چاہیے۔ ہم سوچیں کہ زندگی میں ہمارے کیا مقاصد ہیں اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے کیا طریقے اپنائے ہیں؟ یا کیا راستے اختیار کرکے ہم اپنے مقاصد حاصل کرسکتے ہیں؟

اس کے علاوہ دوسرے Step میں، ہمیں یہ خیال رکھنا ہے کہ جب ہم سو کر اٹھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کیا ہوتا ہے۔ کیا ہم اپنے کام پر جانے کے متعلق فکرمند ہوتے ہیں؟ اور اگر کبھی دیر ہوجانے کا خدشہ ہو تو ہم سوچتے ہیں کہ چلو آج ناشتا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ کام پر وقت پر پہنچ سکیں۔ ویسے تو ہمارا یہ فیصلہ ایک اچھے ارادے کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ہم دیر سے آفس پہنچنا نہیں چاہتے۔ اس لیے ناشتا چھوڑ دیتے ہیں مگر اپنے اس عمل کو ہم اپنی ذات اور اپنی صحت کے حوالے سے دیکھیں تو فیصلہ، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم ذات اور صحت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے، اسی لیے ہم نے معاشرتی تقاضوں کو اپنی جسمانی اور ذہنی ضروریات پر ترجیح دی، یعنی اپنی ذات کو منفی نظر انداز کردیا اگر ہم اپنی ذات اور صحت کو زیادہ اہمیت دیں گے تو ایسا کوئی کام نہیں کریں گے، جس سے ہماری صحت یا ذات متاثر ہو مثلاً ناشتا کھانا چھوڑ دینا، اپنے لیے شاپنگ نہ کرنا، اپنے لیے وقت نہ نکالنا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اپنی ذات کو اہمیت نہیں دیتے۔ دن نکلنے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کے ساتھ رابطے میں آتے ہیں اور ملنا ملانا شروع کردیتے ہیں۔

اب غور کریں کہ گھر یا آفس میں آپ کی وجہ سے، آپ کے اطراف کے لوگوں یا خود آپ کو کسی اضطراب یا پریشانی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑتا۔ ہم اپنی زندگی میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں تو دوسروں کے دکھ درد کو سمجھتے اور ہر قسم کا مسئلہ حل کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہ بے لوث خدمت گزار لوگ خود اپنی ذات سے کافی حد تک لاپروا ہوجاتے ہیں لیکن اگر وہ یا ہم خود اپنے لیے بھی اتنے ہی بے لوث ہو جائیں تو یہ ایک اچھا امتزاج اور شخصیت بنے گی۔ کیونکہ بہت زیادہ دوسروں کی فکر اور خیال کرنے

والے یہ احتیاط نہیں کرتے کہ خود انہیں اپنی کتنی ضرورت ہے۔

ایسے افراد خود کو نظر انداز کر کے راتوں کو جاگتے ہیں، بھوکے رہتے ہیں، دکھ درد سنتے ہیں مگر اپنے مسائل اور پریشانیوں پر توجہ نہیں دیتے جو کہ خود ان کی ذات کی طرف نامہربانی ہے۔

یہ زندگی اللہ نے ہم سب کو ایک نعمت کے طور پر دی ہے، جس کا خیال رکھنا ہم سب کا فرض ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ نا صرف اللہ کا ناشکرا شمار ہوتا ہے بلکہ ذہنی دباؤ اور تنہائی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔

جیسے جیسے ہم اپنی سوچ اور عمل سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں، ہم خود بخود اپنی شخصیت کو خوشگوار انداز میں سنوارنا، نکھارنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ اچھا لگنا ہر انسان کا حق ہے۔

ہمارا جسم اور روح، ہماری توقعات و نیت کو اسی طرح سمجھ لیتا ہے، جیسے ہم دوسروں کی اپنے بارے میں سوچ کو سمجھ لیتے ہیں۔

ہماری سوچ و توقعات خود اپنی ذات سے اس وقت زیادہ اہم ہو جاتی ہے جب زندگی میں ہمیں کسی بڑے Challenge کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی ہم زندگی میں کسی اہم چیز یا فرد کو کھوتے ہیں یا کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں تو اس سے نکلنے اور صحت مند ہونے کے باوجود ہمارے اندر ایک غیر محسوس تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، جسے نئے سرے سے جاننا اور سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچیے، خود کو خوش رکھیے اور پھر آپ دوسروں کا بھی یقیناً بہتر طور پر خیال رکھ پائیں گے۔

☆☆☆

دردانہ نوشین خان

کا تہلکہ خیز ناول' انسانی کرب کی آخری تجرید

اِندر جال

وفا کے موضوع پر جگر سوز منظر ناموں اور زندہ مکالمات کا یادگار ناول

☆

جو"راکشس" کے نام سے تین سال تک چھپتا اور قارئین کے دلوں پر حکمرانی کرتا رہا

☆

880 صفحات - 16 ابواب

قیمت:500 روپے

☆

ہر باب دل پسند
آخری ابواب عردسہ کی ماتمی روا

بتا میرے کوزہ گر' سجدہ محراب وفا اور راکشس نے سخت دل لوگوں کو بھی تڑپا کر رلا دیا

ٹریجڈی کی دنیا کا ناقابل فراموش ناول

چھپ کر آگیا ہے

منگوانے کا پتہ

مثال پبلشرز' رحیم سینٹر' پریس مارکیٹ' امین پور بازار۔ فیصل آباد

Cell:03339933321 Fax:041-2643841 041-8733206

شعری طنز و مزاح

کتے

گھر کی رکھوالی کی ہم میں استطاعت ہی نہیں
ہم نے اخراجات اپنے کر لیے ہیں کم سے کم
اپنے ہمسائیوں کے کتے بھونکتے ہیں رات بھر
اپنے گھر میں بھونک لیتے ہیں کبھی مل جل کے ہم

عطاالحق قاسمی

ترستی ہے زباں میری

مرے گھر کا جو نقشہ ہے' بیاں میں نہیں کر سکتا
مرے ہمسائے بھی سنتے نہیں آہ و فغاں میری
اِدھر بچوں کا رونا ہے' اُدھر ہے ڈانٹ بیگم کی
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

مجذوب چشتی

چھوڑ دے

ماں نے کہا کہ بیٹی! نہ شوہر پہ ظلم کر
ایسا نہ ہو کہیں وہ تیرا سر ہی چھوڑ دے
سختی بجا ہے' باندھ کے رکھنا بھی ٹھیک ہے
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

محمد ممتاز راشد

ہسپتال

کہیں دس بیس بیٹھے ہیں' کہیں دو چار بیٹھے ہیں
عجب شان ہلاکت سے یہاں بیمار بیٹھے ہیں
سبب اس کا جو پوچھا ڈاکٹر صاحب نے فرمایا
بہت آگے آگئے باقی جو ہیں' تیار بیٹھے ہیں

محمد طٰہ خان

پشاور

جان طٰہؔ ملک الموت کو الزام نہ دے
کون کہتا ہے کہ موت آئے گی تو مر جاؤں گا میں؟
عید کا چاند ہوں' میں وقت سے دو دن پہلے
دیکھ لینا کہ پشاور میں نظر آؤں گا میں

محمد طٰہ خان

پلاٹ

پلاٹ اک دیجیے صاحب' کہ پنشن ہونے والی ہے
جو فٹ پاتھوں پہ گزرے گی تو پہنچوں گا تھانوں میں
جو عرضی دی تو سی ڈی اے کے دفتر سے جواب آیا
'تو شاہیں ہے' بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر'

صادق نسیم

پچپن برس کی

میک اپ سے ان کی کھا ہی گیا دل مرا فریب
اب آپ ہی بتائیں کہوں کیا نظر کو میں
دیکھا قریب سے تو وہ پچپن برس کی تھی
'حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں'

شاہد الوری

ہیروئن

ہیروئن بیچنے والے سے کہا لیلیٰ نے
یہ جو پوڈر ہے' سنگھا دو میرے پروانے کو
یوں ہی مر جائے کسی روز نشے کے ہاتھوں
'کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو'

سرفراز شاہد

بیوٹی گائیڈ

شائستہ انور

موسمِ سرما آیا اور چلا گیا۔ موسمِ گرما پھر سے ہمارے سامنے پورے جوبن کے ساتھ آیا چاہتا ہے۔ سال کے سب سے بڑے موسم سے نبرد آزما ہماری جلد ہوتی ہے۔ موسم کی شدت سے پہلے جلد کی حفاظتی تدابیر، آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ امید ہے اس معلومات سے آپ یقیناً فیض اٹھائیں گی۔

موسمِ گرما کی آمد ہو چکی ہے۔ اس موسم میں چمک دار اور تندرست جلد کے لیے کچھ آزمودہ مشورے آپ کے لیے ہیں جو یقیناً آپ کی جلد پر نمایاں اور خوشگوار اثرات مرتب کریں گے۔

سامانِ آرائشِ حسن کا انتخاب

اس غلط فہمی کو اپنے ذہن سے نکال دیں کہ مہنگی مصنوعات ہی جلد کی خوب صورتی کی ضامن ہیں بلکہ قیمت سے زیادہ آپ کو اپنے لیے موزوں سامان کے انتخاب کو ترجیح دینی چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ معیاری چیزوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے مگر ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ماہر بیوٹیشن سے اپنے جلد کے حوالے سے معلومات حاصل کریں کہ جلد کی دیکھ بھال اور میک اپ کے لیے آپ کو کون سی کمپنی کی پروڈکٹ خریدنی چاہیے۔ اسے کب اور کیسے استعمال کرنا چاہیے‘ تب کہیں جا کر آپ اس مشکل مسئلے کو حل کر سکیں گی۔

کھانے کی عادات

آج کل ہر دوسرے شخص کو ڈائٹنگ کا خبط طاری ہے جس کے نقصان دہ اثرات ہماری جلد پر براہ راست پڑتے ہیں۔ نمی اور لچک کم ہونے کی وجہ سے جلد کھردری اور خشک ہو جاتی ہے‘ اور جھال کی صورت میں اُترنے لگتی ہے۔ اس لیے ڈائٹنگ کے دوران‘ کسی بھی قیمت پر کھانا پینا مکمل طور پر ترک نہ کریں۔ موسمی سبزیوں اور پھلوں کو ضرور کھائیں۔ ان کو اپنی پسند اور ناپسند پر قربان نہ کریں۔ کھانے پینے کے معاملے میں بے احتیاطی سے بھی‘ آپ کی جلد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے جیسے جنک فوڈ، چکنائی، مرغن اور تیز مسالے والے کھانوں کے بے جا استعمال سے‘ چہرے پر کیل مہاسے، دانے نمودار ہونے لگتے ہیں‘ جو آپ کی خوب صورتی میں گہن لگا دیتے ہیں۔ اپنی جلد کی تازگی اور تندرستی کے لیے‘ پانی اور تازہ پھلوں کے رس سے مستفید ہوں لیکن اگر آپ کو کیل مہاسوں کے علاوہ دیگر جلدی امراض کا سامنا ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر سے مشورہ کریں‘ اور اس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کریں‘ لیکن ہمیشہ متوازن خوراک کا استعمال کریں کیونکہ مہنگی سے مہنگی پروڈکٹس بھی آپ کے چہرے پر وہ نکھار نہیں لا سکتیں جو موزوں خوراک کے استعمال سے آئے گا۔

پانی اور ورزش

روزانہ 8 گلاس پانی پینے کے علاوہ ورزش بھی جلد کی تازگی کے لیے ضروری ہے‘ لیکن اگر آپ ورزش کرنا نہیں چاہتے تو تھوڑی دیر کے لیے تازہ ہوا میں چہل قدمی ضرور کریں۔ سائیکل چلائیں یا پھر کوئی دوڑنے بھاگنے والا کھیل کھیلیں۔ اس طرز عمل سے خون کی گردش بڑھے گی‘ جس سے جلد تک آکسیجن اور پانی کی فراہمی رواں دواں رہتی ہے۔ یہ دونوں اجزاء جلد کو نم رکھنے کے علاوہ لچک دار بھی بناتے ہیں جس سے جسم کی تندرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماہرین‘ کہتے ہیں کہ آپ جب بھی خود کو تھکا ہوا اور ڈپریشن میں مبتلا محسوس کریں تو وقفے وقفے سے ایک دو گلاس پانی پی لیں۔ آپ کو یقیناً افاقہ ہوگا اور آپ کی خرچ ہونے والی توانائی دوبارہ بحال ہو جائے گی۔

صفائی

جلد پر قیمتی سے قیمتی لوشن اور کریم لگانے کے باوجود یہ اس وقت تک روشن اور بے داغ نظر نہیں آئے گی‘ جب تک جلد کی ساخت کے مطابق اس کی صفائی نہ کی جائے۔ دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد جلد کی کلینزنگ کو اپنے معمولات میں ضرور شامل کریں۔ آپ دنیا جہان کے کام تو کر لیتی ہیں‘ مگر اپنی جلد کی دیکھ بھال اور صفائی کرنے میں کاہلی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ کلینزنگ، ٹوننگ اور موئسچرائزنگ‘ جلد کی نگہداشت کے لیے بہترین ہیں۔ ان کے ذریعے جلد کی ہفتہ وار صفائی کی جاتی ہے۔ کلینزر کو چہرے پر لگا کر دائرے کی صورت میں پھیلائیں۔ منہ دھونے کے لیے‘ نیم گرم پانی ہرگز استعمال نہ کریں۔ صابن کے بجائے فیس واش سے چہرہ دھوئیں۔ یہ مردہ خلیات سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ چہرے کو تازگی بخشتا ہے۔ موئسچرائزر نمی فراہم کرنے کے علاوہ مسامات میں چکنائی اور دھول مٹی کو جمع ہونے سے روکتا ہے‘ لیکن چکنی جلد کی حامل خواتین بار بار موئسچرائزر نہ لگائیں‘ اس کی اضافی مقدار مسامات کو بند کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاپ لینا بھی‘ چکنی جلد کے لیے نقصان دہ ہے‘ اس سے جلد پر سرخ رنگ کے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ باہر سے آنے کے بعد فوراً منہ دھوئیں تاکہ چہرے پر موجود گرد و غبار زیادہ دیر تک چہرے پر جمی نہ رہے ورنہ اس سے کیل مہاسے اور سرخ دانے نکل آئیں گے۔ میک اپ کو سونے سے پہلے اُتارنا نہ بھولیں۔ جتنا آپ جلد کی صفائی کا خیال رکھیں گی‘ اسی نسبت سے کیل مہاسے اور دیگر جلدی مسائل کا سامنا کم سے کم کرنا پڑے گا۔

سَن اسکرین

دھوپ گرمیوں کی ہو یا سردی کی‘ ہر صورت میں اس کی اضافی مقدار جلد پر مضر اثرات مرتب کرتی ہے اسی لیے آپ جب بھی باہر جائیں‘ خود کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے سن بلاک لگائیں۔ یہ ایسے اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے جو گرمی اور دھوپ سے بچانے کے لیے سن اسکرین کا کام کرتے ہیں جس کو ہم حفاظتی تہہ بھی کہتے ہیں مگر یہ سن بلاک صرف دو گھنٹے کے لیے کارگر ہوتا ہے لہٰذا اگر آپ اس دورانیے میں زیادہ عرصہ دھوپ میں رہتی ہیں تو دوبارہ سَن بلاک کا استعمال کریں۔ بازار میں ہر جلد کی مناسبت سے سن بلاک موجود ہیں‘ ان میں سے کوئی ایک آپ اپنے لیے منتخب کر لیں۔

یہ باتیں اپنی جگہ مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں‘ لیکن اس کے علاوہ آپ جتنا خود کو خوش اور منفی سوچوں سے پاک رکھیں گی‘ اس کے مثبت اثرات سے آپ کے چہرے پر جو چمک آئے گی‘ وہ بغیر کسی آرائش اور بناوٹ کے آپ کی شخصیت کے گرد ہالا بنا دے گی۔

☆☆☆

مسالوں کے فائدے

ہم اپنے بچوں کو مسالے دار غذائیں دینے سے گریز کرتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ بچے ہلکے پھلکے کھانے زیادہ پسند کرتے ہیں مگر کیا آپ کو پتا ہے کہ مسالا جات بہتر قدرتی علاج ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے ایک بہترین ٹانک بھی ہیں۔

ایک چائے کا چمچہ ادرک کا جوس لیں اور ایک ٹی اسپون لیموں کا رس۔ اس میں ایک چائے کا چمچہ شہد ملا کر گرم پانی میں ملا کر بچے کو پلائیں۔ بچے کی غذا میں معمولی مقدار میں ادرک کو شامل کرنا بھی اس کے لئے فائدے مند ہے اور وہ بہ تدریج اس کا عادی بھی ہو جاتا ہے۔

ادرک

خواتین عموماً بچوں کو تب ادرک کا استعمال کرواتی ہیں جب ان کی ناک بہتی ہے مگر کیا پتا ہے کہ ادرک نظام ہضم کے لئے بہترین ہے جس کی وجہ سے جسم مختلف وٹامنز اور معدنیات کو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ جذب کر پاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ادرک میں کچھ ایسے کیمیاوی خمیر ہوتے ہیں جو پیٹ میں بھی پائے جاتے ہیں جس سے نظام ہضم اور زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔

میتھی

کچھ مسالا جات کی اگرچہ تائید نہیں کی جاسکتی مگر بچوں کی غذا میں ان کی شمولیت فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔ ہائی شوگر اور ہائی کارب والی غذائیں، سوفٹ ڈرنکس اور جنک فوڈز یہ ایسی غذائیں ہیں جن کے استعمال سے مستقبل میں آپ کا بچہ ذیابیطس کا شکار ہو سکتا ہے۔ میتھی ٹائپ ''A'' اور ٹائپ ''B'' کو کنٹرول کرنے میں بہت مددگار ہے۔ یہ کولیسٹرول میں ایک خاص رطوبت یعنی سیرم (Serum) کی سطح کو کم کر دیتا ہے۔ آپ سلاد اور دیگر ڈشز میں اس کا استعمال آزادی سے کر سکتی ہیں۔

ہلدی

یہ ایک بہترین طبی خواص والا مشرقی مسالا ہے۔ اس میں کرکیومن (Curcumin) ہوتا ہے جو اپنے اندر ایک طاقت ور جگر کا ٹانک بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک پاور فل اینٹی آکسیڈنٹ اور اینٹی انفلے میشن کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ تحقیق سے یہ پتا چلا ہے کہ یہ سرطان کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔ ادرک کی طرح ہلدی بھی کولیسٹرول میں سیرم کی سطح کو کم کرتی ہے اور انسولین کی سطح پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک کپ گرم دودھ میں ایک چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر ملا کر بچے کو روزانہ دیں۔

جائفل

یہ بھی ایک مفید مسالا ہے بچوں کے لئے..... یہ غذا کو ہضم کرتا ہے۔ بے خوابی دور کرتا ہے، قے اور ڈائریا سے محفوظ رکھتا ہے۔ دیگر مسالہ جات مثلاً زیرے کو بھی بچوں کی غذا کا حصہ بنانا مفید ہے۔ اس سے آنتیں درست اور فعال رہتی ہیں۔ ان میں پروٹین، چکنائی، کاربوہائیڈریٹس، فائبر، کیلشیم، آئرن اور فاسفورس کی ٹھیک ٹھاک مقدار موجود ہوتی ہے۔

ملیٹھی

یہ ایک بہترین جڑی بوٹی ہے اور مسالا بھی۔ یہ انسان کو السر سے محفوظ رکھتی ہے اور اگر ہو جائے تو اس کے ذریعے اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اس کا ذائقہ ذرا تلخ ہوتا ہے، اس لئے اس کا عادی ہونے میں قدرے وقت لگتا ہے۔ کچھ بچے اس کی وجہ سے الرجی کا شکار ہو جاتے ہیں مگر اکثریت اسے برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ جڑی بوٹی انسانی جسم میں کولیسٹرول کی پیداوار کو بڑھاتی ہے جو جسم میں جلن اور تیزابیت کو ختم کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی جڑوں میں اینٹی بیکٹریل اجزا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ درد میں کمی ہو جاتی ہے بلکہ یہ نقصان پہنچانے والے بیکٹریا کو تباہ بھی کر دیتے ہیں۔